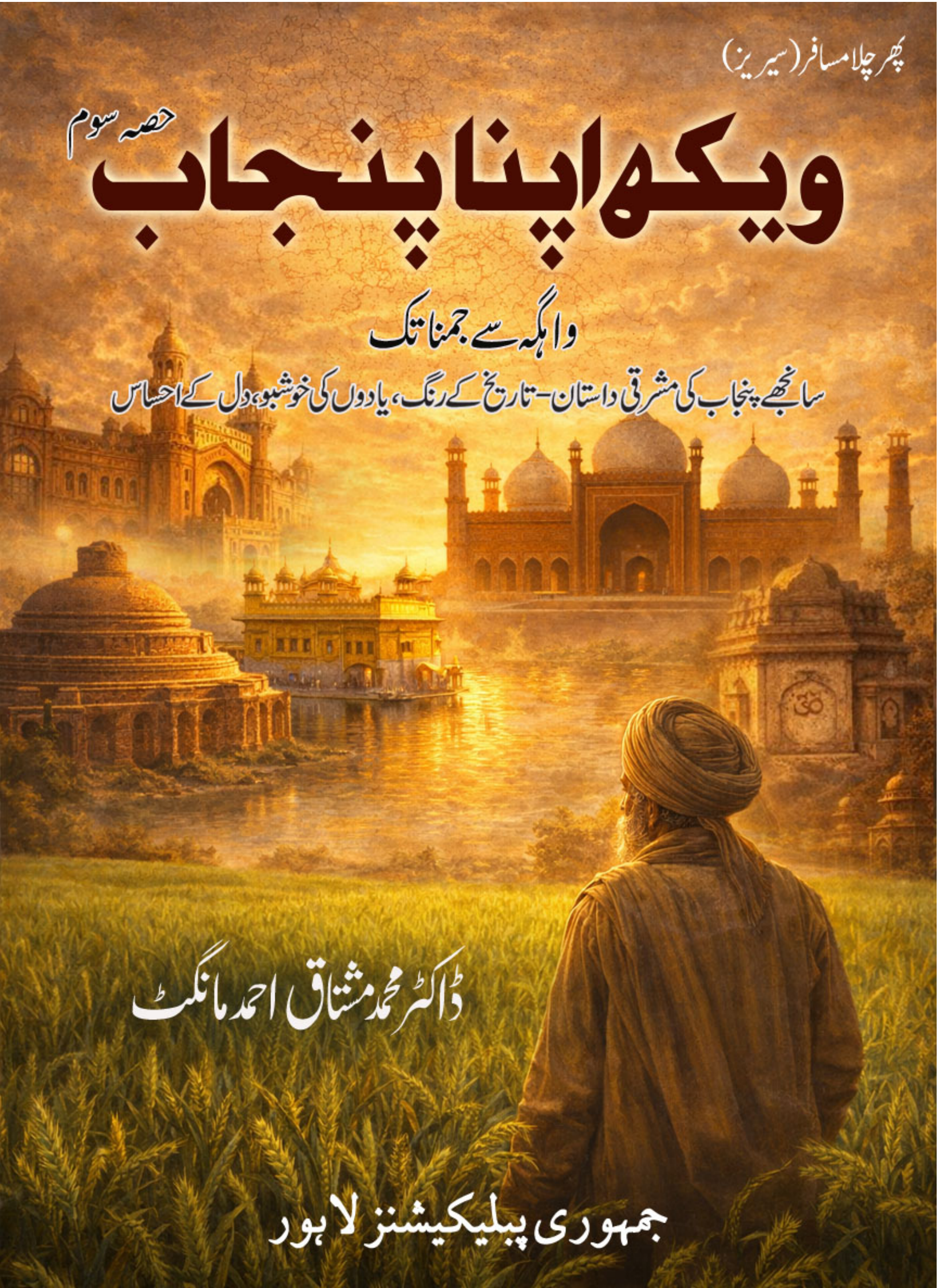
پھر چلا مسافر (سیریز)

ویکھو اپنا پنجاب
حصہ سوم

واہگہ سے جمنا تک

سانجھے پنجاب کی مشرقی داستان-تاریخ کے رنگ، یادوں کی خوشبو، دل کے احساس



ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

جمہوری پبلیکیشنز لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیکھا اپنا پنجاب (حصہ سوم)

پھر چلا مسافر (سیریز)

پھر چلا مسافر (سیریز)

ویکھ اپنا پنجاب (حصہ سوم)

واہگہ سے جمنا تک

سانجھے پنجاب کی مشرقی داستان - تاریخ کے رنگ، یادوں کی خوشبو، دل کے احساس

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

جمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

● نام کتاب: پھر چلا مسافر، دیکھا اپنا پنجاب (سوم)
● مصنف: ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ ● سرورق: مصباح سرفراز
● اشاعت: 2026ء ● ناشر: جمہوری پبلیکیشنز لاہور

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

اس کتاب کی تمام تر فروخت غزالی ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے تعلیمی منصوبوں میں خرچ کی جائے گی تا کہ پاکستان کے محروم اور نادار بچوں کو معیاری تعلیم، سہولیات اور بہتر مواقع فراہم کیے جاسکیں۔ قیمت:-/2000 روپے

کتاب کے حصول کا طریقہ:-/2000 روپے غزالی ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرائیں۔ کم یا زیادہ آپ پر منحصر ہے۔

Bank Account: Title: Ghazali Education Foundation

Account Number: 02060100676606

IBAN: PK65MEZN0002060100676606

SWIFT CODE: MEZNPKKAGRD

Bank: Meezan Bank, Akbar Chowk, Lahore, Pakistan.

www.Ghazalifoundation.org

بینک رسید/اسکرین شاٹ ہمارے WhatsApp نمبر 8451217 324 92+ پر ارسال کریں یا اس ای میل mushtaq.mangat@gmail.com پر بھیج دیں۔

آپ کو کتاب بلا کسی اضافی کوریئر چارج کے فراہم کر دی جائے گی۔

=======✿=======

یہ کتاب ای بک (E-book) کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔ آپ اسے ڈاؤن لوڈ (Download) کر سکتے ہیں اور کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اس بات کی آپ کو مکمل اجازت ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب سائٹس پر موجود ہے۔ اگر ڈاؤن لوڈ کرنے میں کوئی دقت ہو، تو آپ ہمیں ای میل بھیج کر بھی منگوا سکتے ہیں۔

http://taawun.org.pk/downloads www.archive.org www.scribd.com

Follow us at facebook

JUMHOORI PUBLICATIONS
2 Aiwan-e-Tijarat Road, Lahore-Pakistan.
Tel # 042-36314140 042-36283098
E-mail: info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

انتساب!

یہ سفرنامہ ان دو چراغوں کے نام جو 1947ء کی گہری رات میں جنھوں نے انسانیت کی روشنی بجھنے نہ دی۔

ایک وہ سکھ سردار، (میرے ننھیال کے گاؤں کا نمبردار) جس نے خونریزی کے طوفان میں جان کی بازی لگا کر تقریباً چھ ماہ تک میرے ننھالی خاندان کو اپنی چھاؤں میں چھپایا، اور ایک اندھیری رات میں اپنے نوجوانوں کی حفاظت میں انھیں امبالہ کیمپ کی پناہ گاہ تک پہنچایا۔

دوسری مسز خان، ماڈل ٹاؤن لاہور کی وہ بہادر روح، جس نے خوف کی زنجیروں اور نفرت کی آگ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بے شمار ہندو اور سکھ خاندانوں کو رات کی گود میں اپنی گاڑی کی آغوش دے کر ریلوے اسٹیشن کی پناہ گاہ تک پہنچایا۔

یہ دونوں شخصیات گواہ ہیں کہ اندھیرے میں بھی روشنی زندہ رہ سکتی ہے، نفرت کے طوفان میں بھی محبت کا پل باندھا جا سکتا ہے۔

یہ سفرنامہ ان روشن کرداروں کے نام، جو تقسیم کی آگ میں بھی انسانیت کا پھول کھلا رکھ گئے۔

فہرست

❀ حرف آغاز 15

❀ واہگہ سے جمنا تک-ان راہوں کی تلاش میں جہاں قافلے لوٹے گئے 17

ہند، ہندوستان، بھارت، انڈیا 17

اٹاری: بھارت کا پہلا قصبہ 21

اٹاری اور سردار شام سنگھ اٹاری والا 22

سوبراؤں میں انگریز اور سکھوں کی ایک اہم جنگ 24

ترن تارن: پانچ سو سالہ ایک قدیم شہر 29

امرتسر: صدیوں قبل کا ایک مذہبی شہر 33

❀ بٹالہ: آئرن برڈ آف ایشیا 39

❀ کپورتھلہ، سلطان پور اور کرتار پور 49

❀ سلطان پور لودھی-جہاں سکھ مذہب کا آغاز ہوا 55

❀ جالندھر-صدیوں پرانا ایک شہر 60

❀ ہشیار پور-ہشیار خان کے نام کا ایک صدیوں پرانا قصبہ 64

یہ چندر بنسی کون تھے؟ 65

پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ: جو 1882ء میں بنائی گئی 68

ابھی سر ہند دور تھا! 69

دکھنی، یعنی جنوبی سرائے 71

❀ پھلور-رنجیت سنگھ کا قلعہ، ایک زندہ صوفی کا دفن 74

❀ لدھیانہ-جو دراصل لودھی آنہ تھا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے 77

چمکور صاحب: گرو گوبند سنگھ اور وزیر خان کی جنگ	82
احمد نگر: جو کبھی بہادر نگر تھا	84
مالیر کوٹلہ	85
کھنہ	90
سرہند نہر کے درمیان پانی پر بنایا گیا فلوٹنگ ریسٹوران	91
❀ ریاست پٹیالہ- ہندوستان میں سکھوں کی پہلی باقاعدہ ریاست	95
❀ چنڈی گڑھ- بھارت کا ایک نیا اور امیر شہر	102
چنڈی گڑھ کا حدود اربعہ اور اس کی تاریخ	103
ذاکر حسین روز گارڈن: گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا اور شاندار باغ	105
راک گارڈن چنڈی گڑھ	108
تندوری مچھلی اور بے فکرے پنجابی سکھ نوجوان	112
موہالی، جس کا سرکاری نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر ہے	114
موہالی سے اپنے دیس تک: ایک سفر جس کا تصور بھی حسین تھا	117
موریندا	118
بسی پٹھانا اور تلانیا میرے بزرگ جس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے	119
شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی	121
گردوارہ فتح گڑھ صاحب	125
استاد شاگرد کا مقبرہ	126
سرہند	129
منصوری ٹبہ: میرے والد کی جائے پیدائش	131
سدھنا قصائی مسجد کی تعمیر نو	137

علی بخش مانگٹ : میرے دادا کی اولاد، ایک صاحب فراست اور باکردار شخص	141
دالو ماجرہ: میرے والد کا ننھیال اور پہلا سسرال	142
میری ماں کا گاؤں : میری زندگی کا یادگار سفر	145
میرا ننھیال ایک سکھ سردار کی پناہ میں	150
❀ فریدکوٹ - بابا فرید کے نام کا ایک شہر	155
❀ ہریانہ - جو کبھی سانجھے پنجاب کا حصہ تھا	162
ہریانہ ایک ہندو ریاست جہاں کبھی مسلمان بھی آباد تھے	162
❀ پنجابی صوبہ تحریک - سکھوں کی سیاسی جدوجہد	169
❀ انبالہ - ایک راجپوت کا بسایا ہوا شہر اور انگریزوں کی ایک بڑی چھاؤنی	172
انبالہ چھاؤنی اور افریقہ کے قیدی	176
شاہ آباد مارکنڈا	177
کروکشیتر	182
❀ تھانیسر - ایک تاریخی قصبہ	185
مولانا محمد جعفر تھانیسری	185
شیخ صوفی عبدالرزاق عرف شیخ چلی	188
❀ ریاست جند اور سنگرور	192
ریاست جند	194
کیتھل	195
شاہ کمال قادری اور شاہ سکندر قادری کیتھلی کا مزار	198
کرنال	199
انگریز جند کور مہارانی اور مہاراجہ رنبیر سنگھ	205

بابر کی 1528ء میں تعمیر کردہ بابری مسجد کرنال	206
❀ گوردوارہ منجی صاحب - جہاں گورونانک جی نے ایک رات گزاری	208
سید محمد الیاس میراں: ایک عظیم صوفی بزرگ	208
❀ پانی پت - جہاں ہندوستان کے تاج وتخت کے وارثان کا فیصلہ ہوتا تھا	211
مزار شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی	211
کابلی باغ مسجد	215
❀ سفیدون - جہاں پانچ صدیاں قبل سلاطین دلی نے نہر بنائی تھی	216
❀ مظفر نگر - جسے بھارت کا کرائم کیپیٹل بھی کہا جاتا تھا	220
❀ سونی پت - جہاں بابا بندہ سنگھ نے مغلوں کی شکست دی اور سکھ ریاست قائم کی	222
خواجہ خضر ایک مشہور صوفی بزرگ	223
سونی پت کی جنگ جو سکھوں اور مغلوں کے مابین لڑی گئی	224
بندہ سنگھ بہادر	224
چودھری چرن سنگھ	228
❀ نریلا - جہاں چھ سو سال پرانا تالاب اور مراٹھوں اور ابدالی کا میدان جنگ	233
دہلی: اب دور نہ تھا	234
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے	235
❀ بھارت کا پہلا سفر - خوف اور شوق کے ساتھ	238
دہلی: بذریعہ پی آئی اے	238
بھارت کی سرزمین پر پہلا قدم	240
ہوٹل اور ہوٹل میں خفیہ ایجنسی کے فرد کی آمد	241
دہلی: تہذیبوں کا سنگم اور بادشاہوں کا خواب	244

دہلی یا دلی	244
دہلی اور انگریز	247
پرانی دلی: میرا ایک رومانس	249
قرول باغ	251
قرول باغ میں پختون آبادی	254
جامع مسجد دہلی	255
دہلی کے آٹھ دروازے	256
چاندنی چوک: جسے شاہجہاں کی بیٹی نے ڈیزائن کیا	257
حویلی مرزا غالب: ناقدری کی انتہا	258
لال قلعہ	263
ایک شام قلعے میں بادشاہ سلامت کے ساتھ	268
کریم ریستوران: دہلی کی ایک روایت کا تسلسل اور درشن چودھری عرف بیرا	269
فتح پوری مسجد	274
گردوارہ سیس گنج صاحب: گرو تیغ بہادر سنگھ کی جائے قتل	274
دلی کے بازار: دلی کی ثقافت کی ایک زندہ مثال	278
دلی کا حسن ہی اس کا قاتل ٹھہرا	281
ماڈل ٹاؤن لاہور: جو ایک ہندو خاندان کو اب تک یاد ہے	281
ایک عمر رسیدہ ہندو خاتون: جس کے دل میں اب تک ماڈل ٹاؤن بستا ہے	285
❀ **بہائی ایک مذہبی فرقہ اور جماعت اسلامی ہند و لکھنؤ کے امیر جماعت اسلامی**	290
مقبرہ نصیرالدین محمد ہمایوں	294
سید محمد نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی	301

امیر خسرو: ایک عظیم صوفی شاعر، ذہین موسیقار اور اردو زبان کا بانی	304
❀ نئی دہلی-تاریخ، اقتدار اور نو آبادیاتی ورثہ	308
پہلے وائسرائے ہند کی رہائش گاہ اور اب راشٹریہ پتی بھون	311
شاہی دستہ اور بادشاہ	315
انڈیا گیٹ: انگریز کے وفاداروں کی یاد میں	316
انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی دہلی: ایک مایہ ناز تعلیمی ادارہ	323
❀ قطب مینار-مسجد قوت الاسلام، حوض خاص	327
مسجد قوت الاسلام: برِصغیر کی ایک قدیم مسجد	331
حوض خاص: دہلی میں ایک خاص مقام	335
سر گنگا رام ہسپتال دہلی اور جنتر منتر	337
جنتر منتر: ستاروں کی گردش جاننے والا تین صدیاں قبل ایک مرکز	339
تین مورتی: انگریز فوج کے سربراہ کی رہائش گاہ اور کناٹ پیلس	341
کناٹ پیلس: نئی دہلی کا تجارتی مرکز	344
❀ الوداع دہلی	347
دہلی سے فرید آباد	348
نوئیڈا: بھارت کا پہلا سمارٹ سٹی	348
فرید آباد: شیخ فرید کے نام پر بسایا ہوا شہر	351
اولڈ دہلی سٹیشن جسے دہلی جنکشن بھی کہتے ہیں	353
نیو دہلی ریلوے سٹیشن	355
دہلی سے ریواڑی براستہ گروگرام	357
❀ ریواڑی-صدیوں سے آباد ایک شہر	362

ریواڑی: شہاب الدین غوری سے انگریزوں تک 363

راؤ تولارام سنگھ (1825–1863) جنگ آزادی کا ایک نامور ہیرو 365

کاریہ: جہاں سولھویں صدی میں شاہ صاحب کے بزرگ آکر آباد ہوئے 369

رنبیر سنگھ مانگٹ کی شادی کی تیسویں سالگرہ اور پراگتی میدان بھارت کی اہم نمائش گاہ 377

پراگتی میدان: بھارت کی ایک اہم نمائش گا 381

بیرا جی کی بٹیا کی شادی اور دہلی میں موجود ایک اور میانوالی، شالیمار باغ دہلی 382

دہلی میں موجود ایک اور میانوالی 385

شالیمار باغ دہلی 392

حصار براستہ روہتک 394

حصار: ایک قدیم شہر 396

سری مکتسر صاحب 400

احمد چیمہ نہیں جا سکتا 403

❀ دریائے سندھ سے دریائے جمنا تک کا سفر تمام ہوا! 406

حرفِ آغاز

یہ کتاب دیکھا اپنا پنجاب سیریز کی تیسری کرن ہے۔

[پہلی جلد میں پنجاب کی تاریخ نے آنکھیں کھولیں، اس کے تمدنی سفر نے دل کو چھوا، تہذیبی پس منظر نے روح کو جگایا۔ دوسری جلد میں ہم اٹک سے واہگہ تک چلے، جی ٹی روڈ کی دھول میں پنجاب کے شہروں، مقامات اور کہانیوں سے ملے۔ اب یہ تیسری کرن آپ کو واہگہ سے جمنا تک لے جاتی ہے، جہاں سرحدیں تو بدل گئیں، مگر یادوں کی خوشبو اب بھی وہی ہے۔

واہگہ سے جمنا تک کا یہ خطہ آج نقشے پر الگ ہے، مگر دل کے نقشے پر اب بھی سانجھا پنجاب ہے۔ یہ بھارتی پنجاب، ہریانہ اور ہماچل کے کچھ حصوں کی داستان ہے، جہاں میں خود قدم رکھ سکا، آنکھیں بھر کر دیکھ سکا، بعض جگہوں کو دور سے جان سکا، اور کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں جانا نہ ہوا، مگر ان کی آواز اس کہانی کے لیے ضروری تھی۔] test

تقسیم کا زخم تو دوسری جلد میں بیان ہو چکا، اس لیے یہاں اس درد کو دہرانے کی بجائے میں نے اس سفر کی بات کی ہے جو چار بار بھارت جانے کے دوران نصیب ہوا۔ ان سفرناموں میں کبھی کاروبار کی خاطر، کبھی طلبہ کے ہمراہ تعلیم و معلومات کی تلاش میں، کبھی ایک بڑی بین الاقوامی کانفرنس کی دعوت پر۔ ان اسفار میں واہگہ سے دہلی، آگرہ، چنڈی گڑھ، امبالہ، پانی پت تک، اور آگے چل کر چنئی، ممبئی، پونا تک کا سفر بھی شامل تھا۔ مگر اس جلد میں صرف واہگہ سے جمنا تک کا رنگ بھرا گیا ہے، سانجھے پنجاب کے مشرقی حصے کی خوشبو محفوظ کی گئی ہے۔

واہگہ عبور کرتے ہی اٹاری میں اجنبیت نہ ہوئی۔ وہی کھیتوں کی ہریالی، وہی مٹی کی مہک، وہی لوگوں کا لہجہ، وہی کھانوں کا ذائقہ۔ فرق صرف لباس اور عبادت گاہوں کا تھا۔ دل کی زبان، تہذیب کی روح میں کوئی فاصلہ نہ تھا۔

البتہ یہ فرق ضرور دکھائی دیا کہ اس پار مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس پار ہندو اور سکھوں کی۔ اس سے مذہبی تقسیم کے زخم قریب سے دیکھنے کو ملے۔

یہ جلد اس امید کے ساتھ رقم کی گئی ہے کہ جو قاری کبھی اس مشرقی پنجاب میں نہ جا سکا، وہ اس کتاب کے ذریعے اس کی مٹی کو چھو سکے، اس کی ہوا کو سونگھ سکے، اس کی یادوں میں گھوم سکے۔

آج بھی ہمارے شہروں میں لوگ اپنے ناموں کے ساتھ جالندھری، امرتسری، امبالوی، لدھیانوی، پٹیالوی، سرہندی، پانی پتی کا لقب لگاتے ہیں۔ دکانیں اور کاروبار آج بھی انھی ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ یہ سب اس بات کی گواہی ہیں کہ جسم تو بچھڑ گئے، مگر روح اور یاد اب بھی سانجھی ہے۔

میں نے پوری دیانت سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کوئی لغزش، کمی یا غلطی رہ گئی ہو تو میں پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔ اگر قارئین میری اصلاح کریں گے تو میں اسے اپنے لیے سعادت سمجھوں گا، اور ان کا دل سے شکر گزار رہوں گا۔

یہ جلد کسی سیاسی بیانیے یا سرحدی لکیر کی توجیہہ نہیں۔ یہ ایک عاجزانہ کوشش ہے کہ سانجھے پنجاب کی یاد، تاریخ اور احساس کو وقت کی زنجیروں اور سرحدوں کی دیواروں سے آزاد رکھا جائے۔ یہ کتاب ان رشتوں کی، ان نسبتوں کی، ان حوالوں کی ہے جو بچھڑنے کے باوجود ٹوٹ نہ سکے۔

میری خواہش ہے کہ یہ تحریر قاری کو صرف معلومات نہ دے، بلکہ اسے سوچنے، محسوس کرنے اور ماضی سے ہم کلام ہونے کا موقع دے۔

میں نے جو دیکھا، جو سمجھا، جو دل نے محسوس کیا، اسے پوری ایمانداری سے قلم بند کیا ہے۔

اگر کہیں کوئی کمی یا اختلاف رائے سامنے آئے تو میں اسے خوش دلی سے قبول کروں گا۔

کیونکہ سانجھے ورثے کی بات اختلاف سے نہیں، مکالمے سے آگے بڑھتی ہے۔

اگر یہ کتاب قاری کے دل میں اپنے پنجاب کی- خصوصاً اس کے سانجھے مشرقی حصے کی- صرف ایک جھلک بھی زندہ کر دے، تو میں اپنی یہ محنت کامیاب سمجھوں گا۔

ڈاکٹر مشتاق مانگٹ لاہور

مارچ، 2026ء

واہگہ سے جمنا تک

ان راہوں کی تلاش میں جہاں قافلے لوٹے گئے

ہند، ہندوستان، بھارت، انڈیا

یہاں میں ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

عام طور پر بھارت کے لیے ہند، ہندوستان اور انڈیا کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اس تحریر کو لکھنے کے لیے مجھے بھی یہ نام استعمال کرنا ہیں۔ میں نے یہ جاننے کے لیے کہ کون سا لفظ مناسب ہے، ادھر ادھر سے کچھ معلومات حاصل کیں جن کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ معلومات آپ کو اس سفرنامے کو پڑھنے میں مفید ثابت ہوں گی۔

سانو جیت نے *World History Encyclopedia* میں ایک مضمون میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق انڈیا کا نام دریائے سندھو سے نکلا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے بھارت کے سب سے قریبی ملک ایران نے اسے ہند اور ہندوستان کہا۔ اہل یونان نے اسے انڈس کہا۔ عربوں نے بھی ہند ہی کہا۔ ہندوستان صرف فارسی زبان میں کہا گیا۔ سندھو دریائے سندھ کا ایک قدیم نام ہے۔ جس کا تذکرہ ہندوؤں کی تاریخی کتابوں رگ وید میں بھی ملتا ہے۔ انگریزوں نے اسے انڈس کی بجائے انڈیا کا نام دیا۔ پانچویں صدی میں لکھی گئی کتابوں میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ اہلِ یورپ پچھلے پانچ سو سال سے انڈیا کا لفظ ہی استعمال کرتے آرہے ہیں۔

دوسرا معروف نام بھارت ہے۔ اس موضوع پر Catherine Clémentin-Ojha

نے ایک مقالہ لکھا ہے جس کا نام ہے

'India, that is Bharat:'......One Country, Two Names

ان کے مطابق اس خطے کے کئی نام ہیں جو زیادہ تر سیاسی، مذہبی، سماجی حالات کی وجہ سے تشکیل پائے ہیں۔ بھارت کے آئین میں اس ملک کا نام انڈیا اور بھارت لکھا ہوا ہے۔ اس لیے یہی دو نام سرکاری مانے جاتے ہیں۔ آزادیِ ہند سے پہلے اسے برٹش انڈیا کا نام بھی دیا گیا تھا۔ یہ اس علاقے کا نام تھا جو برطانیہ کے قبضہ میں تھا۔ اس سے پہلے مغل اسے ہند یا ہندوستان ہی کہتے تھے۔ ان کے نام کے ساتھ شہنشاہ ہند ہی لکھا جاتا تھا۔ عرب بھی اسے ہند ہی کہتے تھے۔ ہندوؤں کی تاریخی کتابوں میں اس کے دس سے زائد نام ملتے ہیں۔

اس مقالے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لفظ ''بھارت'' کو 1950ء میں ''ہندوستان'' کے متبادل نام کے طور پر لیا گیا تھا اور اسے بھارتی دستور کا حصہ بنایا گیا ہے۔ بھارت، بھارت ورا، بھرت ورشا کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ایک قدیم ہندو بادشاہ کا نام تھا جس نے اس پورے خطے پر حکمرانی کی۔ کچھ لوگوں کا اس سے اختلاف بھی ہے۔ مہابھارت کی کہانی اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی یہ علاقہ بھارت بھی کہلاتا تھا۔ بھارتی دستور کا سرکاری نام *The Constitute of India* ہے۔ ایک وسیع خطہ ہونے کی بنا پر اسے برصغیر پاک و ہند (Indian Sub Continent) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نام اس پورے خطے کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بھارت کے علاوہ بھی کئی ممالک شامل ہیں۔

اسی طرح بھارت کے ساتھ لگنے والے سمندر کو بحرِ ہند یا انڈین اوشین (Indian Ocean) ہی کہا جاتا ہے۔ انڈین نیشنل کانگرس، آل انڈیا مسلم لیگ، اسباب بغاوتِ ہند، جماعت اسلامی ہند، کمیونسٹ پارٹی انڈیا، ہندی فلمز، ہندوستان ٹائمز وغیرہ وغیرہ، یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس ملک کو زیادہ تر ہند، ہندوستان اور انڈیا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی ایک مثال ہے جس میں بھارت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ پارٹی 1980ء میں بنائی گئی تھی۔ یہاں ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جب بھارت میں رہنے والی اسی فیصد آبادی کو

آٹھ سو سال بعد اپنی مرضی کی حکومت بنانے کا موقع ملا تو انھوں نے اپنے قدیم اور مذہبی نام ''بھارت'' کو اپنے دستور کا حصہ بنالیا۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آزادیِ ہند سے پہلے کے واقعات بیان کرتے ہوئے ہند یا ہندوستان کا لفظ مناسب ہے، تقسیم کے بعد اسے بھارت یا انڈیا ہی کہا جانا چاہیے۔

ہم سات جون 2005ء کو صبح چھ بجے سے پہلے لبرٹی مارکیٹ لاہور کے قریب ایک جگہ، جہاں سے دوستی بس روانہ ہوتی تھی پہنچ گئے۔ حسب معمول حفاظتی نقطہ نظر سے وہاں پولیس کا ایک دستہ بھی موجود تھا۔ اس دستے نے ہمیں واہگہ بارڈر تک پہنچایا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا سفر کیا جس میں ہماری سواری، یعنی ہماری بس کے آگے ایک ہوٹر بجاتی پولیس گاڑی چل رہی تھی۔ بھارت میں بھی ہمارا سارا سفر اسی طرح سے ہوا۔ حفاظتی نقطہ نظر سے ہر چوک میں ٹریفک سگنل بند کر کے ہماری بس کو گزارہ گیا۔ ہر وقت ہمارے آگے ہوٹر بجاتی پولیس کی گاڑی چلتی رہی۔ جیسے ہی ہم دہلی پہنچے تو ہماری حفاظت کرنے والی پولیس کی ذمہ داری بھی ختم ہوگئی۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پولیس کی ہوٹر بجاتی گاڑی کی موجودگی بھی ایک نشے کی مانند ہی ہے۔

بس میں زیادہ تر پاکستانی تھے اور شاید ان میں سے کچھ ایسے مسلمان بھی تھے جو بھارت سے پاکستان اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئے تھے لیکن ان کی پہچان مشکل تھی۔ بس میں سوار ہونے سے قبل ہم سب کی مناسب تلاشی لی گئی اور سامان کی بھی جانچ پڑتال کی گئی۔ بس وقت مقررہ پر چلی اور ہم واہگہ باڈر پہنچ گئے۔ واہگہ بارڈر تک پہنچتے پہنچتے تقریباً سات بج چکے تھے۔ وہاں پر ہمارے لیے ایک بہت ہی پر تکلف ناشتے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ واہگہ باڈر کی طرف سے پاکستان امیگریشن نے ہمارے پاسپورٹ چیک کیے اور ان پر مہریں لگائیں۔ ہماری بس سے سامان نیچے اتارا گیا اور وہاں پر موجود مزدوروں کی مدد سے وہ سامان بھارت کی طرف موجود ایک شیڈ کے نیچے پہنچایا گیا ہمیں بھی پیدل ایک طرف سے دوسری طرف جانا پڑا۔

درمیان میں ایک لائن تھی جو 1947ء میں لگائی گئی تھی اور اس لائن کو پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک سرحد کا درجہ دیا گیا۔ یہ لائن دونوں ممالک کے لیے بے حد اہم بلکہ مقدس مانی

جاتی ہے۔ کوئی بھی ریاست کی مرضی کے بغیر اس لائن کو عبور نہیں کر سکتا۔ ہم لائن عبور کر کے دوسری طرف چلے گئے۔

وہ بھارت کی سرزمین پر میرے سوا سب کا پہلا قدم تھا۔ میرا یہ چوتھا قدم تھا۔۔۔ میرا بھی بذریعہ بس پہلا سفر تھا۔ بارڈر پر تشریف فرما بھارتی عملے (جن میں اکثریت سکھ لوگوں کی تھی) نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمارے پاسپورٹ چیک کر کے دوبارہ بس میں جانے کی اجازت دی گئی۔ سامان کی دوبارہ سے جانچ پڑتال کی گئی۔ اب ہم بھارت میں تھے، سب طلبہ بے حد پر جوش اور خوش تھے لیکن عرفان صاحب خوش بھی تھے اور ساتھ ساتھ ایک بڑی ذمہ داری بھی محسوس کر رہے تھے۔

دوستی بس: جو بیس سال بعد بند کر دی گئی: دہلی۔ لاہور بس (جسے دوستی بس کہا جاتا ہے) کا آغاز 19 فروری 1999ء کو کیا گیا۔ بھارت کے اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی اسی بس میں سوار ہو کر ایک سربراہی اجلاس میں شرکت کرنے لاہور آئے تھے اور واہگہ بارڈر پر پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف نے ان کا استقبال کیا تھا۔ پھر حالات بدلے اور پاکستان نے بھارتی حکومت کی طرف سے جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرنے پر بطور احتجاج یہ بس سروس بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ بھی اس بس کو کئی مرتبہ روکا گیا لیکن اب پچھلے دو سال سے یہ مکمل طور پر بند ہے۔

دوستی بس ہفتے میں تین دن چلتی تھی اور اس کا کرایہ بھی مناسب تھا۔ لاہور سے دہلی 410 کلومیٹر دور ہے اور دوستی بس یہ فاصلہ کوئی بارہ گھنٹے میں طے کرتی تھی جس میں کسٹم کے معاملات بھی شامل ہیں۔ اس سفر کے لیے، پاکستان اور بھارت، دونوں طرف کی بسیں باری باری چلتی تھیں۔ اب تو یہ بس ماضی کا قصہ بنی ہوئی ہے۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو امید کی جا سکتی ہے کہ اس بس کا دوبارہ آغاز ہو جائے گا۔

اللہ کرے کہ ایسا ہو تاکہ لوگ اپنے عزیز و اقارب سے بہ آسانی مل سکیں!

اٹاری: بھارت کا پہلا قصبہ

سرحد کے ساتھ ہی ایک بڑا کمپلکس تھا جہاں امیگریشن اور کسٹم کے دفاتر تھے۔ پاکستان کی طرف سے اس بارڈر کو واہگہ بارڈر جب کہ بھارت میں اسے اٹاری بارڈر کہا جاتا ہے۔ وہاں اٹاری کے نام سے ایک ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ پاکستان کی طرف واہگہ نام کا ایک گاؤں ہے جس کی وجہ سے اسے واہگہ بارڈر کہا جاتا ہے، واہگہ ایک ذات کا نام بھی ہے جو شاید جاٹوں کی ایک گوت ہے۔

رنجیت سنگھ کے دور میں ملتان کی مشہور لڑائی، جو رنجیت سنگھ اور نواب مظفر خان سدوزئی کے درمیان ہوئی تھی، جس میں سکھوں کو فتح ہوئی تھی اور اس طرح ان کا ملتان پر قبضہ ہو گیا تھا۔ اس جنگ کی تاریخ میں، آپ نے ایک سکھ جرنیل سردار شام سنگھ اٹاری والا کا نام ضرور پڑھا ہوگا۔ سردار شام سنگھ اٹاری والا کا سکھوں کی تاریخ میں ایک اہم مقام ہے۔ جس کا تذکرہ میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔ فی الحال میں آپ کے سامنے پنجاب کے اس آخری قصبے سے متعلق چند باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا یہ قصبہ کس قدر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

جب ہماری بس اٹاری قصبے سے گزر رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ اٹاری کے بازار اور باٹا پور پاکستان کے بازار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ صرف ایک ہی فرق محسوس ہوتا تھا کہ اٹاری میں پگڑی پہنے سکھوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ لوگوں کے قد کاٹھ، شکل صورت اور زبان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے پاس تاریخ کی ایک کتاب بھی سنبھال رکھی تھی جس سے میں کسی بھی قصبے کے آنے سے پہلے اس کی تاریخ جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سے مجھے اس قصبے سے دلچسپی بھی پیدا ہوتی تھی۔ ایسا کرنے سے سیاحت کے ساتھ ساتھ میری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔ اٹاری، بارڈر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جبکہ امرتسر سے اس کا فاصلہ پچیس کلومیٹر ہے بھارت کی طرف سے یہ ان کا آخری قصبہ ہے۔ اس کی تاریخ جانتے ہوئے یہ پتہ چلا کہ یہ ماجھا کے علاقے کا ایک اہم شہر ہے۔

اٹاری اور سردار شام سنگھ اٹاری والا

اٹاری کی تاریخ پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ سدھو جاٹ خاندان کے دو سکھ بھائیوں (جن کے نام گور سنگھ اور کور سنگھ تھے) نے اٹھارھویں صدی کے آغاز میں اس گاؤں کی بنیاد رکھی۔ وہ چودھری کاہن سنگھ سدھو کے بیٹے تھے۔ چودھری کاہن سنگھ کا تعلق لدھیانہ سے تھا جو مالوا کے علاقے کا ایک اہم شہر تھا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کو کئی علاقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پنجاب کے وسطی علاقوں کو بار کہا گیا جیسے نیلی بار، ساندل بار وغیرہ۔ اسی طرح سے پنجاب کے شمالی علاقوں کو بھی تین بڑے علاقوں، ماجھا، مالوا اور دوآبہ، میں تقسیم کیا گیا۔

ماجھا کا علاقہ دریائے ستلج سے شروع ہو کر دریائے جہلم تک موجود ہے۔ اس علاقے کے مشہور شہر امرتسر، لاہور، گجرات اور گوجرانوالہ ہیں۔ دریائے ستلج اور دریائے بیاس کے درمیانی علاقے کو دوآبہ کہا جاتا ہے۔ ہشیار پور، کپورتھلہ، جالندھر اور شہید بھگت سنگھ نگر اس کے اہم شہر ہیں۔ تیسرا علاقہ مالوا کہلاتا ہے جو لدھیانہ سے انبالہ تک ہے۔ اس کے مشہور شہر فتح گڑھ صاحب، پٹیالہ اور بھٹینڈا ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی طرح سے پنجاب کی تقسیم کی جاتی تھی۔ جیسے راوی دوآبہ کا علاقہ جو ستلج اور راوی کے درمیان واقع ہے۔ میرے علم کے مطابق ان مختلف علاقوں کی تقسیم کرتے ہوئے دریا کو ہی سرحد مانا جاتا تھا جو ایک قدرتی سرحد سمجھی جاتی تھی اور پہاڑی علاقوں میں پہاڑ کو ایک قدرتی سرحد کے طور پر لیا جاتا تھا۔

اٹاری بسانے والے دونوں بھائی مالوا سے آئے تھے۔ انھوں نے ستلج کے اس پار اس علاقے میں ایک گاؤں آباد کیا۔ شروع میں اس کے کئی نام رکھے گئے اور بعد میں انھوں نے یہاں پر ایک تین منزلہ حویلی بھی بنائی جس کی وجہ سے اسے اٹاری کا نام دیا گیا۔ ان دونوں بھائیوں نے مغلوں کے خلاف کئی گوریلا جنگیں بھی لڑیں۔ جس سے وہ بہت ہی مشہور ہوئے۔ وہ دونوں بعد میں سکھوں کی بھنگی مسل میں شامل ہو گئے۔ یاد رہے اٹاری کا قصبہ مشہور زمانہ جی ٹی روڈ پر واقع ہے۔ دہلی اور لاہور کے درمیان تمام تر قافلے اسی راستے سے جاتے تھے۔ یہاں کے لوگوں نے رنجیت سنگھ کا مقابلہ بھی کیا۔ ان کا والد رنجیت سنگھ کا ایک وفادار جرنیل تھا۔

میرے علم کے مطابق برصغیر پاک و ہند میں اس علاقے کے لوگ ،جن کا تعلق جاٹ برادری سے تھا، وہ آخری لوگ تھے جو انگریزوں کے ساتھ آخری دم تک جنگ کرتے رہے۔ یہ لوگ ہندوستان پر قبضے میں آخری رکاوٹ تھے۔ 1849ء پنجاب کی فتح کے ساتھ ہی ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

میں نے پچھلے صفحات میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ انگریزوں نے 1862ء میں اس علاقے میں پہلی ریلوے لائن، لاہور اور امرتسر کے درمیان بچھائی تھی۔ مختلف انگریز تاریخ دانوں نے پنجاب کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک اٹاری کے لوگ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ بہادر، دلیر اور جنگجو ہیں۔ جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سمجھوتہ ایکسپریس ریل کا آغاز ہوا تو اٹاری کی اہمیت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اس وقت یہ جگہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تجارت کے لیے بے حد اہم ہے۔ یاد رہے بھارت کی افغانستان سے تجارت میں بھی اٹاری کا اہم کردار ہے۔

اب ایک مختصر ذکر سردار شام سنگھ اٹاری والا کا جو 1790ء میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا اس کے نام کی ایک یادگار بھی اٹاری میں بنائی گئی ہے۔ اس کی بہادری پر کئی شاعروں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ سردار شام سنگھ اٹاری (1846ء تا 1785ء) بارے سکھی ویڈیا پر ایک مضمون پڑھنے کو ملا، جس میں ان کے بارے کافی تفصیل بیان کی گئی ہے:

(https://www.sikhiwiki.org/index.php/Sardar_Sham_Singh_Attari)

اس مضمون کے مطابق وہ لاہور دربار کی سکھ فوج کے ایک نامور جرنیل تھے۔ وہ جٹ برادری کے سدھو قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سردار نہال سنگھ اٹاری (وفات 1817ء) کے اکلوتے فرزند اور سردار گور سنگھ اٹاری (وفات 1763ء) کے پوتے تھے۔ گور سنگھ اٹاری ان اولین افراد میں شامل تھے جنھوں نے سکھ سیاسی عروج کے ابتدائی ایام میں سکھ مذہب اختیار کیا اور سردار گربخش سنگھ رورانوالہ کے جتھے سے وابستہ ہوئے۔ کچھ ہی عرصے میں انھوں نے اٹاری کے گردونواح پر اپنی سرپرستی قائم کی۔ یہ وہ گاؤں تھا جو انھوں نے امرتسر کے مقدس شہر سے تقریباً

سولہ میل مغرب میں آباد کیا تھا۔

سردار نہال سنگھ اٹاری اپنی عسکری مہارت اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ذاتی وفاداری کے باعث مشہور تھے۔ انھی کے بیٹے سردار شام سنگھ اٹاری نے 1817ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں شمولیت اختیار کی اور اگلے ہی برس یعنی 1818ء میں پشاور، اٹک اور ملتان کی فوجی مہمات میں حصہ لیا۔ 1819ء میں انھوں نے کشمیر کی مہم میں بھی اپنی شجاعت کا لوہا منوایا۔ بعد ازاں انھوں نے سکھ افواج کی قیادت کرتے ہوئے سید احمد بریلوی کے خلاف جنگ کی، جنھوں نے 1826ء سے 1831ء تک دریائے سندھ کے پار کے علاقوں میں سکھوں کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔ بالآخر 6 مئی 1831ء کو بالاکوٹ کی جنگ میں سید احمد اپنے اہم ساتھی مولوی محمد اسماعیل کے ساتھ شہید ہو گئے۔ یہ کامیابی شام سنگھ اٹاری کے عسکری کیریئر کی نمایاں فتوحات میں شمار کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی جاننے کو ملا کہ میں انھیں گرمکھی اور فارسی کی تعلیم دی گئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں فارسی کی تعلیم کا چرچا عام تھا۔ رنجیت سنگھ کے دربار کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ ایک مرتبہ رنجیت سنگھ نے اسے پانچ ہزار گھڑسواروں کا سردار بھی بنایا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہادر اور قابل سردار تھا۔ اس کی بیٹی کی شادی رنجیت سنگھ کے پوتے کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کے خاندان کے بھی انتہائی قریب تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد جب اس کی فوج نے ایک طرح سے بغاوت کر دی تو رانی جنداں (رنجیت سنگھ کی بیوی، جسے رانی جند کور بھی کہا جاتا ہے) نے سردار شام سنگھ اٹاری والا کو مدد کے لیے بلوایا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ کس طرح سردار شام سنگھ اٹاری والا نے باغی فوجیوں کا مقابلہ کیا اور سردار شام سنگھ کی بیوی، مائی داسی نے سردار شام سنگھ کی موت پر شادی کے لباس میں ستی کی رسم ادا کی تھی۔

سوبراؤں میں انگریز اور سکھوں کی ایک اہم جنگ

جب میں نے اٹاری سے متعلق پڑھا اور سرادر شام سنگھ کی داستان جاننے کو ملی تو مجھے یہ علم ہوا کہ پہلی مرتبہ انگریز کب بطور فاتح لاہور میں داخل ہوئے اور کیوں انھوں نے کشمیر ایک ہندو راجا کو بیچا۔ اس پوری داستان میں سردار شام سنگھ کا بھی اہم کردار تھا۔ اس وجہ سے میں نے مناسب

جانا کہ ایک گاؤں (جس کا نام سوبراؤں ہے) کے بارے میں معلومات حاصل کروں جو ضلع ترن تارن میں دریائے ستلج کے جنوب میں واقع ہے۔اس گاؤں کے قریب ہی 10 فروری 1846ء کو انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ایک اہم لڑائی بھی ہوئی۔

اس جنگ کی تاریخ جاننے کے بارے میں مجھے دو چیزوں کی وجہ سے شوق پیدا ہوا۔ایک یہ کہ اس جنگ کے نتیجے میں انگریزوں کا لاہور پر قبضہ ہوا اور دوسرا یہ کہ اس جنگ کے نتیجے میں کشمیری مسلمان ہندوؤں کے غلام بن گئے۔ انگریزوں نے سکھوں کی ریاست پنجاب پر قبضہ کر کے اس کا ایک خوب صورت حصہ، کشمیر گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا اور آج تک اس ''کاروبار'' کی سزا کشمیر کے مسلمان بھگت رہے ہیں۔اس جنگ کا مختصر احوال پیش خدمت ہے۔

سوبراؤں گاؤں اٹاری کے جنوب میں چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اٹاری کے سردار شیر سنگھ نے بھی اس جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔رنجیت سنگھ نے انگریزوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھے اور انھیں ہر طرح کی مدد بھی پہنچائی۔ یاد رہے کہ رنجیت سنگھ جب تک زندہ رہا اس وقت تک انگریزوں نے دریائے ستلج کو عبور نہیں کیا اور نہ ہی کوئی افغان ہندوستان پر حملہ آور ہوا، بلکہ اس کے الٹ ہوا۔رنجیت سنگھ نے شمال مغربی ہندوستان کے ساتھ ساتھ افغانستان پر بھی کامیاب حملے کیے اور جمرود تک کا ایک بڑا علاقہ فتح کیا۔جمرود میں واقع قلعہ اسی دور کی یاد میں بنایا گیا تھا۔میرے علم کے مطابق سکھوں کی وہ سب سے بڑی ریاست تھی۔اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد کبھی سکھوں کا اتنے بڑے علاقے پر قبضہ رہا ہے۔

سکھ خالصہ فوج اور انگریزوں کے درمیان کئی لڑائیاں لڑی گئیں جن میں سے اکثر میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی۔اسی سلسلے کی ایک اہم جنگ دریائے ستلج کے کنارے سوبراؤں گاؤں کے قریب فروری 1846ء میں لڑی گئی۔اس جنگ کی کہانی بہت ہی دلچسپ ہے۔سکھ خالصہ افواج نے مارو یا مر جاؤ کے جذبے سے یہ جنگ لڑی۔اس جنگ میں سردار شام سنگھ اٹاری والا کی بھی موت ہوتی ہے۔سکھ دھرم میں انھیں ایک اونچا مقام حاصل ہے۔

یاد رہے کہ یہ جنگیں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان تھیں۔انگریزوں کے مقابلے میں کوئی

بھی مسلمان سردار نہیں تھا بلکہ بے شمار مسلمان راجاؤں اور نوابین کے علاوہ مذہبی راہ نماؤں نے بھی انگریزوں کا ہی ساتھ دیا۔ یہاں میں صرف سوبراؤں کی جنگ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ سکھوں کی تاریخ میں سوبراؤں کی جنگ کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اسی جنگ میں ستلج پر بنے ہوئے پل ٹوٹنے جیسے کئی واقعات کا بھی ذکر سامنے آتا ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ واقعہ چند غدار سکھوں کی وجہ سے پیش آیا۔ اس پل کے ٹوٹنے کی وجہ سے بیس ہزار سے زائد سکھ گھیرے میں آ گئے، جو شکست کی اصل وجہ بنی۔ اس جنگ کے نتیجے میں دس ہزار سے زائد سکھ مارے گئے۔ اس کے بعد سکھوں کی تمام تر طاقت ختم ہو چکی تھی اور وہ اب انگریزوں کے رحم وکرم پر تھے۔

جب ہم اٹاری سے گزرے تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ جب سردار شام سنگھ اس جنگ میں شریک ہونے کے لیے گھر سے چلا گیا اور ابھی جنگ ختم بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی سردار شام سنگھ کی موت کی خبر آئی تھی کہ اس کی بیوی مائی سادہ نے شادی کا لباس پہنا اور ستی کی رسم (خاوند کی موت کے بعد بیوی کا زندہ جل جانا) ادا کی۔ سب نے اسے کہا کہ ابھی تو سردار شام سنگھ کی موت کی خبر بھی نہیں آئی تو آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اب ہمیں شکست ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں سردار شام سنگھ نہ تو میدان جنگ سے بھاگے گا اور نا ہی قیدی بنے گا۔ وہ میدن جنگ میں قتل ہونا پسند کرے گا۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ قتل ہو جائے گا اس لیے میں ستی ہو رہی ہوں۔

مجھے اس موقع پر انسانی جذبات کے مختلف احساسات، اس میں محبت کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا کہ کوئی شخص کسی صورت حال میں کیا کرے گا، جاننے کا موقع ملا!

یہ محبت اور اعتماد کی ایک خوب صورت کہانی ہے!

اٹاری کی وجہ شہرت چتر سنگھ اٹاری والا، اس کے دو بیٹے شیر سنگھ اٹاری والا اور اوتار سنگھ اٹاری والا بھی ہیں۔ یہ وہی شیر سنگھ ہے جس نے چیلیانوالہ کھاریاں، کی جنگ میں سکھوں کی سربراہی کی تھی۔ چیلیانوالہ کے بارے میں اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ جنگ کے دوران بارش کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ میرے علم کے مطابق وہ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان تیسری لڑائی

تھی۔ پہلی 1845ء میں فیروز پور کے پاس، دوسری 1846ء میں سوبراؤں گاؤں کے پاس اور تیسری 1849ء میں چیلیانوالہ میں لڑی گئی- کچھ کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد گجرات میں بھی ایک جنگ ہوئی تھی لیکن شاید وہ چھوٹے پیمانے پر تھی۔ اس کے بعد راولپنڈی کے قریب ایک مقام پر سکھوں نے ہتھیار ڈال دیے (اس کا ذکر میں نے دیکھا اپنا پنجاب حصہ اول میں تفصیل سے کیا ہے)۔

یہ تھی اٹاری سے وابستہ لوگوں کی ایک تاریخ جو مجھے اٹاری سے گزرتے ہوئے یاد آئی۔ دہلی اٹاری سے 484 کلومیٹر ہے۔

بقول داغ؛

اگرچہ پا شکستہ ہم ہیں اے داغؔ
مگر قصدِ سفر جاتا کہاں ہے

میرے ساتھ رہیے، ابھی تو ہمیں دلی پہنچنا ہے جہاں، غالب بھی رہتے تھے جنھوں نے کہا تھا؛

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اجنالہ: جہاں سینکڑوں کی تعداد میں آزادی کے متوالوں کے زندہ دفن کیا گیا: اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو قمر اجنالوی کے نام سے تو ضرور شناسائی ہوگی۔ قمر اجنالوی کی پیدائش بھارت کے شہر اجنالہ میں ہوئی۔ جب ہم اٹاری سے نکلے تو میں نے نقشے پر دیکھا کہ ہمارے بائیں طرف، یعنی اٹاری کے شمال میں بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر اجنالہ شہر آباد ہے۔ اجنالہ کا نام پڑھ کر مجھے قمر اجنالوی یاد آئے۔ یہ 1980ء کی دہائی کے ایک بے حد مقبول شاعر

تھے۔ آپ نے دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابوں کے عنوانات سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے لیکن جب میں نے اجنالہ کے بارے میں پڑھا تو مجھے ایک بہت ہی حیران کن واقعے کا پتہ چلا۔

تاریخ سے معلوم، ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی ہند (1857ء) کے دوران 26 ویں انفنٹری کے کئی سو سپاہیوں نے میاں میر چھاؤنی لاہور، میں بغاوت کر دی۔ جب تحریک ناکام ہو گئی تو آزادی کے متوالے ان تمام سپاہیوں کی قسمت کا فیصلہ انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے ان فوجیوں کو یقین دلایا کہ ان پر منصفانہ مقدمہ چلایا جائے گا، معافی بھی مل سکتی ہے لیکن ان لوگوں کے ساتھ انگریزوں نے وہ سلوک کیا جسے کسی بھی طور پر جائز نہیں کہا جا سکتا۔

ہوا کچھ یوں کہ جب تقریباً پانچ سو سپاہی امرتسر ضلع کے اجنالہ قصبے تک پہنچنے کے لیے دریائے راوی کے پار پہنچ گئے تو دو سو سے زائد کو انگریزوں نے قتل کر دیا۔ باقی تین سو کے قریب فوجیوں نے اجنالہ میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ سب لوگ ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو گئے۔ جہاں بہت سے لوگ تو دم گھٹنے کی وجہ سے ہی دم توڑ گئے۔ باقی جو زندہ بچے انھیں انگریزوں نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا اور ان کی لاشیں ایک کنویں میں پھینک دیں۔ اس کنویں کو ''شہیداں دا کھو'' کا نام دیا گیا۔ ایک عرصے بعد فروری 2014ء میں اس کنویں کی کھدائی کی گئی اور بائیس فوجیوں کی باقیات کو کنویں سے نکالا گیا۔ بعد میں ایک مرتبہ پھر کھدائی کی گئی تو چالیس مزید لاشیں برآمد ہوئیں۔ اس واقعے کی تمام تر ذمہ داری Frederick Henry Cooper کے سر ہے جو اس وقت اس علاقے میں انگریزوں کی طرف سے ڈپٹی کمشنر تعینات تھا۔

یاد رہے ہم نے لاہور میں اس "ظالم" شخص کی یاد میں ایک سڑک کا نام بھی کوپر روڈ رکھا ہوا ہے جو بیڈن روڈ سے پنجاب اسمبلی کی طرف جاتی ہے۔

بھارت نے اجنالہ میں ان شہیدوں کی یاد میں ایک یادگار بھی تعمیر کی ہے جبکہ ہم نے لاہور کی ایک اہم ترین سڑک (جس پر ہمارے حکمران سفر کرتے ہیں) کا نام اس شخص کے نام پر رکھا ہوا ہے جس نے آزادی کے پانچ سو سے زائد متوالوں کو ظالمانہ طریقے سے قتل کیا۔ کوپر نے جنگ

آزادی کے واقعات پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔جس میں اس طرح کے کئی قصوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔وہ کتاب میں نے انٹرنیٹ سے حاصل کی ہے۔اس کتاب کا نام:

The Crisis in the Punjab : From the 10th of May until the Fall of Delhi by Cooper, Frederick Henry

اگر آپ بھی یہ سب پڑھنا چاہتے ہیں تو درج ذیل لنک سے یہ کتاب حاصل کر سکتے ہیں۔

https://archive.org/details/crisisinpunjabfr00coop/page/10/mode/2up

اس کتاب میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے۔

ترن تارن: پانچ سو سالہ ایک قدیم شہر

ہم اٹاری سے آگے نکل کر امرتسر کی طرف رواں دواں تھے۔ ہمارے اردگرد گندم کی کٹائی کے بعد چاول کی فصل کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی۔مقامی ضلع کی پولیس کی گاڑی ہماری بس کے آگے چل رہی تھی۔ مجھے اردگرد کے ماحول میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ہم لاہور سے چند کلومیٹر ہی دور تھے۔ مجھے اس سفر میں سب سے زیادہ امرتسر گولڈن ٹیمپل دیکھنے کی خواہش تھی۔بس میں ہمارے ساتھ سوار گائیڈ سے میں نے پوچھا کہ کیا ہم گولڈن ٹیمپل دیکھ سکیں گے؟ جس پر اس نے بتایا کہ ہم دور سے اسے ضرور دیکھ سکیں گے۔ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے اس لمحے کا بے قراری سے انتظار تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں امرتسر کا ذکر کروں میں چاہوں گا کہ ہمارے دائیں طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک اہم شہر کا ذکر بھی ضرور کیا جائے۔

ترن تارن، جو امرتسر سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ایک نہایت ہی اہم شہر ہے (اسے ترن تاران بھی لکھتے ہیں)۔اس شہر کی بنیاد پانچویں سکھ گرو، شری گرو ارجن دیو جی نے سولھویں صدی میں رکھی تھی اور اس نام کی وجہ اس علاقے کی خوب صورتی ہے۔ یہ علاقہ مدت تک بھنگی مسل کا ایک اہم حصہ بھی رہا۔ یہ بات میرے لیے خاصی نئی تھی کہ آزادیِ ہند کے وقت وسطی پنجاب کے چند شہر اور اضلاع ایسے بھی تھے جہاں سکھوں کی اکثریت تھی۔ان میں ترن

تارن کے ساتھ ساتھ شیخوپورہ، لدھیانہ، جالندھر، ہشیار پور، کپورتھلہ، امرتسر، لائل پور، اور پٹیالہ شامل تھے۔ ایک مرتبہ جب آزادیِ ہند کے وقت سکھوں کے لیے ایک الگ ملک کی بات ہوئی تو اس وقت ان اضلاع میں ترن تارن بھی شامل تھا۔

ترن تارن کی اہم بات یہاں کا گرو ارجن دیو جی گردوارہ ہے۔ اس گردوارے کی تعمیر سولھویں صدی میں شروع ہوئی۔ رنجیت سنگھ کے دور میں بہت سا کام ہوا اور بعد میں اس کے پوتے نہال سنگھ نے اس میں اضافہ کیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلی مرتبہ کسی بھی گردوار کی دیوار پر سونے کی تہہ یہیں پر چڑھائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں پر کئی اور گردوارے بھی بنائے گئے اور شہر کی چار دیواری بھی کی گئی۔ یہاں پر بھنگا نام کا ایک گردوارہ بھی موجود تھا۔ اسی وجہ سے شاید ایک بھنگی مسل بھی بنی تھی۔ سکھوں کے مختلف گروہ تھے ان کو عام طور ہر مسل کہا جاتا تھا۔ لاہور کے مال روڈ پر موجود بھنگیوں کی توپ کا تعلق اسی مسل سے ہے۔ اس مسل کا اصل گڑھ یہی شہر تھا۔ انگریزوں کے دور میں جب سکھوں کا راج ختم ہو گیا تو گردوارہ صاحب کی ذمہ داری انگریزوں نے لے لی جس پر سکھوں نے کافی شور مچایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

یہ سب جان کر مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ جب انگریزوں نے پنجاب کو فتح کر لیا ہوگا اور ان کے سامنے کوئی مزاحمت کرنے والا بھی نہیں تھا تو انھوں نے ہر طرح کی زیادتی کی ہوگی۔ اس کے بعد سکھوں نے گردواروں کی بہتری کے لیے ایک تحریک بھی چلائی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئی اور سکھوں کی بجائے اس علاقے میں عیسائی پادریوں کا راج ہونے لگا۔ یہ بات بھی ہے کہ دلچسپ اب تک میں نے بھارت کے جتنے بھی شہروں کا ذکر کیا ان میں کہیں نا کہیں ایک دو فیصد مسلمان تو ضرور بستے ہیں کہ لیکن ترن تارن ایک ایسا ضلع ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد اعشاریہ تین فیصد ہے، جو نا ہونے کے برابر ہے۔

یاد رہے یہ شہر سکھوں کی تہذیب و تمدن کا سب سے اہم شہر ہے۔ یہاں دربار صاحب ارجن دیو جی کے ساتھ ساتھ کئی اور گردوارے بھی موجود ہیں۔ یہاں پر موجود ایک بہت بڑے تالاب کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے جس کی لمبائی ساڑھے نو سو فٹ اور چوڑائی ساڑھے سات فٹ ہے۔

یہ گردواروں میں موجود ایک بہت بڑا تالاب ہے۔ ہم اس شہر کو نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ ہمارے راستے سے کافی دور تھا، لیکن جس سکھ سے میں نے اس کے متعلق بات کی اس نے ہمیں یہ ضرور بتایا کہ ان کے نزدیک جتنا امرتسر میں واقع گولڈن ٹیمپل اہم ہے اتنا ہی گردوارہ گروارجن دیو بھی اہم ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ خالصتان تحریک کے دوران یہ علاقہ سکھوں کا بہت اہم گڑھ تھا۔ ترن تارن سے گرو ارجن دیو جی کا گہرا تعلق ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ میں ان کے بارے میں چند معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

سکھوں کے نزدیک گروارجن دیو جی سکھ مذہب کی خاطر شہید ہونے والے دو گروؤں میں سے پہلے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پانچویں سکھ گرو بھی ہیں۔ یاد رہے سکھ دھرم میں کل دس گرو ہیں۔ گرو ارجن دیو جی نے پہلی مرتبہ سکھوں کی مذہبی کتاب ترتیب دی جسے ادی گرنتھ صاحب کہا جاتا تھا۔ بعدازاں اسے ہی گرنتھ صاحب کہا جانے لگا۔ اس طرح انھیں سکھ دھرم میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے سکھ دھرم میں مسند کا نظام بھی شروع کیا (مسند کا لفظ مسلمان بھی استعمال کرتے ہیں) جس کے تحت سکھوں سے یہ کہا گیا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ، سامان یا روپیہ، مسند کے لیے دیں۔ مسند کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ نہ صرف فنڈز جمع کرے بلکہ سکھ مذہب کی تعلیمات بھی سکھوں کو سکھائیں اور اس کے علاوہ ان کے باہمی تنازعات بھی حل کرنے کی کوشش کرے، اس کے ساتھ ساتھ لنگر کا بھی انتظام کرے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گروارجن دیو جی کو مغل بادشاہ جہانگیر کے حکم پر گرفتار کیا گیا اور اسے اسلام قبول کرنے کے لیے کہا جس پر گرو نے انکار کر دیا۔ بعدازاں 1606ء میں انھیں تشدد کا نشانہ بنا کر پھانسی دے دی گئی۔ اب بھی ہر سال گروارجن کی یاد میں ایک دن منایا جاتا ہے۔ تاریخ دانوں کا یہ کہنا ہے کہ مغلوں اور سکھوں کے تمام تر اختلافات کی بنیاد سیاسی تھی۔ مغل انھیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے سکھوں کا قتل عام بھی کیا اور ان کے کئی گرو بھی قتل کیے لیکن کچھ تاریخ دانوں نے اسے مذہبی رنگ بھی دیا ہے۔

میں نے اس موضوع پر ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ پڑھا جو ایک مسلمان نے لکھا تھا۔ اس کے

مطابق اگر کسی مسلمان نے کسی کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا تو وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہوگا۔ اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اس طرح کے معاملات کا تعلق اپنی ریاست بچانے سے ہے۔ ایسا کرنے والا ایک مسلمان تھا اس لیے اسے اسلام سے جوڑا گیا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ان مسلمان بادشاہوں نے اس طرح کا ظلم صرف غیر مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ ایسا اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ بھی کیا ہے۔

ظلم کسی بھی وجہ سے کیا گیا ہو۔۔۔ظلم پھر ظلم ہی ہے۔۔۔ ہر حال میں قابلِ مذمت ہے۔

امرتسر (امبرسر)، گولڈن ٹیمپل، جلیانوالہ باغ، بلیو سٹار آپریشن: تقریباً دس بجے ہم امرتسر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ امرتسر کئی لحاظ سے ایک اہم اور تاریخی شہر ہے۔ میری اس سے دلچسپی کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ تو اس شہر کا تاریخ میں اہم مقام ہونا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری اہم وجہ لاہور میں رہتے ہوئے ایسے لوگوں کا ملنا تھا جو امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے اور وہ ہمیشہ شوق سے امرتسر کی باتیں کرتے تھے۔ ان دو باتوں نے میری اس شہر میں دلچسپی کو مزید بڑھا دیا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ لاہور کے لوگ اس شہر کو امرتسر کی بجائے امبرسر کہتے ہیں۔

امرتسر لاہور سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ صدیوں سے ان دونوں شہروں کے درمیان کبھی کوئی سرحد نہیں رہی۔ دونوں طرف پنجابی ہی آباد تھے اور اسلام کی آمد سے قبل مذہب بھی ایک ہی تھا۔ ان کا رہن سہن بھی بہت حد تک ایک جیسا ہی تھا۔ میں امرتسر کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ کہہ سکتا ہوں کہ لاہور اور امرتسر ایک طرح سے جڑواں شہر ہی ہیں۔

آزادیِ ہند سے پہلے ان دونوں شہروں کے درمیان بسنے والے لوگوں کی آپس میں رشتے داریاں بھی تھیں، دونوں شہروں میں کثیر تعداد میں مسلمان اور ہندو کشمیری آباد تھے۔ دونوں شہر جی ٹی روڈ پر واقع ہونے کی وجہ تجارتی لحاظ سے بھی اہم مانے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ شہر ہمیشہ سے ایک ہی حکمران کے زیرِ تحت رہے ہیں، چاہے وہ مسلمان ہو غیر مسلم۔ اس لیے امرتسر کو دیکھ کر مجھے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں

لاہور کے ہی علاقے دیکھ رہا ہوں۔

امرتسر: صدیوں قبل کا ایک مذہبی شہر

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ امرتسر ماجھا کے علاقے میں واقع ایک قدیم مذہبی اور بھارتی پنجاب کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی پندرہ لاکھ کے قریب ہے۔ لاہور سے اس کا فاصلہ پچاس کلومیٹر ہے۔

میں نے پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہندو دھرم کی شروعات ہندوستان کے شمالی علاقہ جات سے ہوئی تھی۔ جس میں کوروکیشتر سرِ فہرست ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کا ایک گروجس نے رامائن لکھی ہے بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ ہندوؤں کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ سیتا کے دو بیٹے (ایک کا نام لاوا اور دوسرے کا نام خوشا) تھے۔ لاوا نے لاہور آباد کیا جبکہ خوشا نے قصور کی بنیاد رکھی۔ یہ سب قدیم تاریخی واقعات ہیں اور ان میں کتنی صداقت ہے، حتمی بات کہنا مشکل ہے لیکن ہندو تاریخ میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔

امرتسر کی تاریخ بارے تفصیل اس کی ویب سائٹ سے ملی ہے https://www.goldentempleamritsar.org اس ویب سائٹ پر موجود مضمون کے مطابق سکھوں کے گرو رام داس نے امرتسر شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ انھوں نے اس شہر کو آباد کرنے کے لیے گاؤں والوں سے زمین خرید کر اس کی بنیاد رکھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ چاہتے تو وہ یہ زمین مفت بھی لے سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شروع میں اس گاؤں کا نام گرو کا چک تھا۔ بعد ازاں کسی وجہ سے ایک نیا شہر بسایا گیا اور اس کا نام رام داس پور رکھا گیا۔ گرو رام داس نے اس شہر کو ایک تجارتی شہر بنا دیا اس شہر کے درمیان میں ایک بڑا تالاب بھی بنایا گیا۔ اسی جگہ پر گردوارہ ہرمندر صاحب بھی بنایا گیا جسے عام طور پر گولڈن ٹیمپل بھی کہا جاتا ہے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملے کیے تو ان حملوں میں گولڈن ٹیمپل کو بھی تباہ کیا گیا اور بے شمار لوگوں کا قتل عام بھی ہوا۔ رنجیت سنگھ نے بھی اس گوردوارے کی بے حد خدمت کی۔

گروارجن دیو جی نے اس عظیم عبادت گاہ (ہرمندر صاحب/ دربار صاحب امرتسر) کی بنیاد ایک مسلمان صوفی بزرگ حضرت میاں میرؒ لاہور کے ہاتھوں رکھوائی تھی۔ یہ تاریخی واقعہ یکم ماگھ، 1645 بکرمی سمبت (دسمبر 1588ء) کو پیش آیا۔ اس مندر کی تعمیر کی نگرانی براہِ راست خود گروارجن دیو جی کر رہے تھے۔ اس موقع پر انھیں نمایاں سکھ شخصیات جیسے بابا بُڈھا جی، بھائی گرداس جی، بھائی سہلو جی اور دیگر بے شمار عقیدت مند سکھوں کی بھرپور اعانت اور خدمات حاصل رہیں۔ یہ امر نہ صرف سکھ تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے بلکہ برصغیر کی بین المذاہب رواداری اور صوفیانہ روایت کی ایک روشن مثال بھی ہے، جہاں ایک مسلمان ولی اور سکھ گرو نے مل کر ایک ایسی عبادت گاہ کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں پوری دنیا کے سکھوں کے لیے مرکزِ عقیدت بن گئی۔

اسی وجہ سے کئی سکھ بھی ان کے دربار پر آتے ہیں۔ میں نے جب اس سے متعلق مزید جاناتو پتہ چلا کہ 1581ء میں، گروارجن نے گوردوارے کی تعمیر کا آغاز کیا اور شروع میں تالاب کو خشک رکھا گیا۔ گروارجن صاحب نے گردوارے کا منصوبہ سطح زمین کے نیچے بنایا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ جو لوگ یہاں آئیں وہ احاطے میں داخل ہونے سے پہلے اپنی انا کا بت توڑ کر عاجزی اختیار کریں۔ انھوں نے یہ حکم بھی دیا کہ گردوارے کے احاطے کو ہر طرف سے کھلا رکھا جائے۔ یہ اس لیے کیا گیا تا کہ سب کو پتہ چلے کہ یہ گردوارہ ہر کسی کے لیے کھلا ہے اور کوئی بھی کسی بھی طرف سے آسکتا ہے۔ اس دور میں گروارجن نے سکھوں کی پہلی کتاب، (جسے ادی گرنتھ بھی کہا جاتا تھا) کو گردوارے میں رکھا اور بابا بدھ کو پہلا گرنتھی مقرر کیا گیا۔

اب تک میں نے جو پڑھا ہے اس کے مطابق گولڈن ٹیمپل کی تعمیر اور اس میں قائم اکالی تخت نے سکھ مذہب کے فروغ کے لیے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ شہر تجارت اور دیگر سرگرمیوں کا بھی اہم مرکز بن گیا۔ اس وقت امرتسر کی آبادی تقریباً پندرہ لاکھ ہے۔ ایک بات جو میرے لیے بھی کافی حیران تھی اور آپ بھی وہ جان کر حیران ہوں گے کہ امرتسر میں پچاس فیصد کے قریب ہندو رہتے ہیں جبکہ میرا یہ خیال تھا کہ امرتسر سکھوں کا مقدس مقام ہے اس لیے یہاں پر سکھوں کی اکثریت ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے۔

لاہور کے قریب ہونے کے باوجود امرتسر میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد نصف فیصد سے بھی کم ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آزادیِ ہند کے وقت یا تو مسلمان قتل کر دیے گئے یا ان کو امرتسر چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسے آزادیِ ہند سے پہلے لاہور شہر میں ہندو اور سکھ آبادی کے چالیس فیصد حصے سے بھی زیادہ تھے لیکن اب لاہور میں ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان دونوں شہروں کے قریب ہونے کی وجہ سے اجاڑے کے وقت لوگوں نے ایک سے دوسرے شہر میں نقل مکانی کی۔ وہ نقل مکانی ان کی خواہش نہیں تھی بلکہ حالات ہی ایسے پیدا کر دیے گئے تھے کہ لوگوں کو اپنے ان علاقے کو چھوڑنا پڑا جہاں وہ صدیوں سے آباد تھے۔

کچھ سرحد پار کر گئے اور کچھ زندگی کی بازی ہار گئے!

امرتسر میں تاریخ کا ایک ایسا واقعہ بھی ہوا جب بے گناہ لوگوں پر اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں۔ یہ لوگ 13/اپریل 1919ء کو بیساکھی کے میلے میں شرکت کے لیے جلیانوالہ باغ میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اس واقعے میں ایک بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے۔ انگریزوں کے خلاف بہت بڑی تحریک چل رہی تھی۔ انگریز اس تحریک کو روکنے کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے کئی سیاسی رہنماؤں کو گرفتار بھی کیا۔ امرتسر میں بھی کئی لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ جس کے خلاف مقامی لوگوں نے بھرپور احتجاج بھی کیا اور اس میں بارہ سو سے زائد لوگ مارے گئے۔ اس واقعے کے تین روز بعد 13/اپریل 1919ء کو بیساکھی کے سلسلے میں ہزاروں سکھ، مسلمان اور ہندو جلیانوالہ باغ میں جمع ہوئے۔ یہ باغ گولڈن ٹیمپل کے پاس ہی واقع ہے۔ شام کے وقت کرنل ڈائر 65 گورکھا اور پچیس بلوچ سپاہیوں کو لے کر اس باغ میں پہنچا۔ اس نے مجمع کو منتشر ہونے کی دھمکی دیے بغیر باغ کے سارے دروازے بند کروائے اور اندھا دھند فائرنگ کا حکم دے دیا۔ انگریزوں کے بقول اس واقعے میں چار سو کے قریب لوگ مارے گئے جبکہ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی زائد تھی۔ اس اندوہناک واقعے کے بعد ایک اور واقعہ بھی رونما ہوا جو اسی سے جڑا ہوا ہے۔

اس قتل کا بدلہ لینے کی خاطر اودھم سنگھ (جو 1899ء میں پنجاب کے ضلع سنگرور میں پیدا ہوا تھا) نے کرنل ڈائر کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ کہتے ہیں کہ وہ اصل میں کرنل ڈائر کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن نام کی مماثلت کی وجہ سے اس نے جنرل اوڈائر کا قتل کر دیا۔ ادھم سنگھ نے 13 مارچ 1940ء کو جنرل مائیکل اوڈائر کو کیکسٹن ہال میں اس کی تقریر کے دوران جنرل مائیکل اوڈائر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا تفتیش ہوئی۔ تفتیش کے دوران اس نے اپنا نام "رام محمد سنگھ آزاد" بتایا ،جس میں تینوں مذاہب کے نام شامل تھے اور انگریزوں سے آزادی کا لفظ بھی اور کہا کہ میں نے یہ سب کچھ جلیانوالہ باغ کا بدلہ لینے کے لیے کیا ہے۔ یوں 27 سال بعد ایک سکھ نوجوان نے اپنے ہندوستانی بھائیوں کے قتل کا بدلہ لے لیا۔ جولائی 1940ء میں اسے عدالت کے حکم پر پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

بھارت بھر میں ادھم سنگھ کو شہید اعظم کہا جاتا ہے اور اتراکھنڈ میں ایک ضلع کا نام بھی اس کے نام پر رکھا گیا ہے۔

آپریشن بلیو اسٹار بھارتی فوج کا گولڈن ٹیمپل پر قبضہ: جب ہم امرتسر سے گزر رہے تھے تو گولڈن ٹیمپل کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ تقریباً بیس سال قبل جون 1984ء میں یہاں پر ایک بہت ہی اہم واقعہ پیش آیا تھا۔ ان دنوں سوشل میڈیا اتنا عام نہیں تھا لیکن اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے بہت سی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اس دورے کے دوران مجھے ایک پڑھے لکھے سکھ سے ملنے کا بھی موقع ملا جن کی تاریخ پر گہری نظر تھی۔ ان سے میں نے اس واقعے سے متعلق بہت کچھ جانا جس کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

فی الوقت میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ 1984ء میں جب بھارت میں اندرا گاندھی کی حکومت تھی تو گولڈن ٹیمپل میں ایک بہت ہی اہم واقعہ پیش آیا جس میں سکھوں کے ایک راہ نما جرنیل سنگھ بھنڈراں والا اور ان کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ اس واقعے کا مختصر حال آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ یاد رہے کہ سکھوں میں بھی کئی گروہ پائے جاتے ہیں اور ان میں سخت اختلافات بھی ہیں۔ 1978ء میں سکھوں کا آپس میں ایک بڑا جھگڑا ہوا جس کے نتیجے میں

جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ ایک مشہور سیاسی راہ نما کے طور پر سامنے آئے۔

ایک بڑے مجمعے میں یہ قرارداد پاس کی گئی جس میں ہندوستان سے سکھوں کے لیے ایک الگ ملک خالصتان کی مانگ کی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ علیحدگی پسند سکھ یہ بھی کہتے رہے کہ ہم بھارت سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتے۔ ہمارے تمام تر بیرونی معاملات، دفاع اور کرنسی وغیرہ بھارت کے پاس ہی رہیں گے۔ بھارتی حکومت نے اس مطالبے کو تسلیم نہیں کیا اور اسے ایک طرح کی بغاوت کا نام دے دیا۔ بہت سے سکھ آزاد خالصتان کے مؤقف کو لے کر چل پڑے اور یوں ایک سکھ تحریک شروع ہوئی۔ جرنیل سنگھ کا کہنا تھا کہ وہ منظور شدہ قرارداد کے مطابق اپنا حق لیں گے اور اگر بھارتی حکومت ان کے مطالبات نہیں مانتی تو وہ ان کے خلاف جنگ کریں گے۔ بہت سے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔

اس طریقے سے ان کی تحریک نے جنم لیا اور پھر وہ گولڈن ٹیمپل میں واقع اکال تخت پر آ کر بیٹھ گئے جسے ایک مقدس جگہ سمجھا جاتا ہے۔ بھارتی حکومت نے ان کے ساتھ مذاکرات کیے لیکن وہ کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ وقت کے ساتھ ساتھ گولڈن ٹیمپل میں جرنیل سنگھ کے حامیوں میں اضافہ ہوتا گیا- جب حکومت نے دیکھا کہ بات چیت سے یہ معاملہ حل ہوتا نظر نہیں آ رہا تو وہ بذریعہ طاقت اس مسئلے کو حل کرنے پر غور کرنے لگے اور اسے آپریشن بلیو سٹار کا نام دیا۔ اس منصوبے کے تحت یکم جون 1984ء کو بھارتی فوج گولڈن ٹمپل میں داخل ہوئی ہے اور گولڈن ٹیمپل میں موجود جرنیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا قتل عام کر دیا۔ 10 جون تک گولڈن ٹیمپل کا محاصرہ رہا ہے اور اس دوران بڑی تعداد میں جرنیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو مار دیا گیا۔ کچھ زخمی ہوئے اور باقی لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد اس وقت کے بھارتی صدر ذیل سنگھ نے گولڈن ٹیمپل کا دورہ کیا تو ایک نشانے باز نے انھیں کچھ فاصلے سے نشانہ بنایا۔ وہ تو بچ گئے لیکن ان کے ساتھ چلنے والے بھارتی فوج کے کرنل کو وہ گولی لگ گئی۔ اس واقعے کے نتیجے میں اندرا گاندھی کو بھی ان کے دو

محافظوں نے قتل کر دیا تھا اور یوں پنجاب میں دیر تک بدامنی رہی۔

یہ ایک عظیم الشان تاریخی واقعہ ہے جس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ سکھ اس بارے میں بھولنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ واقعہ کیسے پیش آیا اس کی وجوہات کیا تھیں؟ اس کے بارے میں اگلے صفحات میں کچھ مزید عرض کروں گا۔ فی الحال اتنا ہی کہ ہم اس گولڈن ٹیمپل کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں بیس سال پہلے خالصتان کے حامیوں کو قتل کیا گیا تھا۔

❀ ❀ ❀

بٹالہ: آئرن برڈ آف ایشیا

ہم گیارہ بجے کے قریب امرتسر سے گزر رہے تھے اور ہمیں سفر کرتے کرتے کافی وقت ہو چکا تھا۔شروع میں تو سب لوگ ہی خوف زدہ اور خاموش تھے لیکن اب آہستہ آہستہ بچے آپس میں باتیں بھی کرنا شروع ہو گئے اور شرارتیں بھی۔ہم نے اپنی بس میں موجود پاکستانی بس کنڈیکٹر سے پوچھا کہ ہمارا اگلا سٹاپ کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ ہم سرہند میں دوپہر کے کھانے کے لیے اور بعد میں پیلی ہریانہ میں چائے کے لیے رکیں گے۔سرہند میں جس ریستوران میں ہم نے کھانا کھایا وہ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا عجیب وغریب ریستوران ہے۔ مجھے دوبارہ کسی ایسے ریستوران میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہی میں کبھی کسی ایسے شخص سے ملا، جو اس طرح کے کسی منفرد ریستوران میں گیا ہو۔

جون کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا ہمیں کچھ دیر بعد ایک ریستوران میں رکنا تھا جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا۔ میں نے نقشے میں دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ امرتسر شہر سے آٹھ مختلف شہروں کو سڑکیں نکلتی ہی، ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ہم اس سے اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جنھوں نے امرتسر کو بسانے کا فیصلہ کیا انھیں علم تھا کہ یہ جگہ پنجاب میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔امرتسر سے نکلنے والی سب سے اہم سڑک وہ ہے جو بٹالا اور گرداسپور سے ہوتی ہوئی پٹھان کوٹ اور پھر اس کے بعد کشمیر جاتی ہے۔ یہ سڑک پاکستانی سرحد کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور نارووال شکرگڑھ کے قریب سے ہوتی ہوئی کشمیر تک جاتی ہے۔ بھارت سے کشمیر کو یہی سڑک ملاتی ہے۔میں نے نقشے میں دیکھا کہ بٹالہ شہر ہمارے شمال مشرق کی جانب ہے۔بٹالہ شہر سے پاکستان

کے لوگوں کی کئی یادیں وابستہ ہے۔

اگر آپ کو یاد ہوتو لاہور میں ایک بہت بڑی انجینئرنگ کمپنی ہے جس کا نام پیکو ہے، پاکستان انجینئرنگ کمپنی۔ اس کا پرانا نام بیکو، یعنی بٹالہ انجینئرنگ کمپنی تھا۔ اس کے مالک سی ایم لطیف تھے جن کا گھر لاہور میں گورنر ہاؤس اور الحمر کے درمیان واقع ہے۔ یہ اپنے وقت کی بہت ہی اہم انجینئرنگ کمپنی تھی۔ اگر ذوالفقار علی بھٹو اسے قومی تحویل میں نہ لیتے تو وہ کمپنی اب تک اپنا ہوائی جہاز بنا چکی ہوتی۔ اس کمپنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی غیر ملکی سربراہان آتے تو انھیں اس فیکٹری کا دورہ کروایا جاتا تھا۔ چینی صدر کے دورے کے موقع پر انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ چینی طلبہ کو بھی یہاں پر تربیت دینے کا بندوبست کیا جائے۔

اگر آپ کو پنجابی شاعری سے دلچسپی ہوتو آپ کو علم ہوگا کہ پنجابی کے ایک مشہور شاعر شیو کمار بٹالوی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ وہ شکر گڑھ میں پیدا ہوئے لیکن تقسیم کے وقت وہ گیارہ سال کی عمر میں بٹالہ آ گئے تھے اور ستائیس سال کی عمر میں ان کی موت واقع ہوگئی۔ انھیں پنجابی کے پہلے پانچ شاعروں میں گنا جاتا ہے۔ ان کے یہ مشہور اشعار نصرت فتح علی خاں نے بھی گائے ہیں۔

مائے نی میرے گیتاں دے نیناں وچ
برہوں دی رڑک پوے
ادھی ادھی راتیں
اٹھ روّن موئے متراں نوں
مائے سانوں نیند نہ پوے

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ 1465ء میں راجہ رام دیو، (جو ایک بھٹی راجپوت تھا) نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام بٹالہ رکھا گیا ہو۔ بعدازاں اکبر بادشاہ نے اپنے ایک منہ بولے بھائی شمشیر خان کو اس علاقے میں ایک جاگیر بھی دی۔ بٹالہ امرتسر سے سو سال پرانا شہر ہے۔ شروع میں یہ شہر ایک قلعے میں تھا جس کے بارہ دروازے تھے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ بابا گرونانک کی شادی بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔ اب بھی ہر سال ان کی شادی کا جشن

منایا جاتا ہے۔ ان کی شادی 1487ء میں ہوئی۔ ان کا بیاہ بی بی سُلدی (سُلکھنی) کے ساتھ ہوا جو ملک مُل چند کھتری کی بیٹی تھی۔ یہ شادی اُس وقت کے بٹالہ (ضلع گورداسپور، موجودہ بھارتی پنجاب) میں ہوئی۔ آج بھی بٹالہ میں ''گوردوارہ کندھ صاحب'' اس واقعے کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔ روایت ہے کہ شادی کے موقع پر دلہن کے والد کے مکان کے قریب ایک پرانی دیوار (کندھ یعنی دیوار) کے ساتھ رسومات ادا کی گئیں، اسی نسبت سے گوردوارے کا نام رکھا گیا۔

آزادیِ ہند سے قبل اس شہر کی پچاس فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ آزادیِ ہند کے وقت پہلا فارمولا یہ تھا کہ جس صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی وہ پاکستان کا حصہ ہوگا۔ اس طرح پورا پنجاب پاکستان کا حصہ ہونا تھا لیکن بعد میں یہ تقسیم ضلعی بنیادوں پر ہونے لگی۔ اس کے مطابق جس ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور وہ پاکستانی سرحد سے ملتا ہوگا تو تب ہی پاکستان کا حصہ ہوگا۔ اس کے بعد یہ تقسیم تحصیل کی سطح پر ہونے لگی۔ اس وجہ سے ضلع گرداسپور کی تین تحصیلیں گرداس پور، بٹالہ اور پٹھان کوٹ کو بھارت کا حصہ بنا دیا گیا اور اس کی ایک تحصیل شکر گڑھ کو پاکستان میں شامل کیا گیا۔ اگر انگریز ایسا نہ کرتا تو بھارت کو کشمیر جانے کا کوئی راستہ نہ ملتا۔

بٹالہ میں سکھ آبادی کا 98 فیصد سے بھی زائد ہے۔ ایک فیصد کے قریب ہندو جبکہ مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ تقسیم سے قبل اس شہر میں مسلمان آبادی کا پچاس فیصد تھے۔ اب تک مجھے بھارت میں جتنے بھی شہروں کے بارے میں جاننے کا موقع ملا ہے ان میں یہ واحد شہر ہے جہاں سکھ اتنی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ اس علاقے میں لوہے کے ذخائر بھی پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس شہر میں لوہے کی بہت سی فیکٹریاں بھی ہیں۔ اسی وجہ سے اسے آئرن برڈ آف ایشیا کا نام بھی دیا گیا ہے۔

یہاں پر بڑی تعداد میں مشینری بنائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے جانے والے سی ایم لطیف نے بٹالہ انجینئرنگ کمپنی بنائی جو اپنے زمانے کی ایک بہت ہی معروف کمپنی تھی۔ پاکستان کے اعجاز حسین بٹالوی ایک بڑے مشہور وکیل اور ادبی شخصیت تھے، ان کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ ممتاز مفتی بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے

قابل ہے کہ ریڈیو پاکستان کی پہلی براڈ کاسٹر اور اینکر موہنی حمید، (جنھیں شمیم آپا بھی کہا جاتا تھا) کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ میں لاہور کے جس علاقے میں رہتا ہوں پیکو بھی اسی علاقے میں واقع ہے۔ ہم ایک تاریخی شہر کے پاس سے گزر رہے تھے۔ میں نے شمال مشرق کی طرف دیکھا کہ یہاں سے ایک شخص نے لاہور جا کر ایک بہت بڑی کمپنی بنائی اور پھر ہم نے اسے کھودیا اور اب اس کا نام بھی کم ہی سننے کو ملتا ہے۔ بٹالہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے فیصل آباد میں بٹالہ انجینئرنگ کے نام سے زرعی مشینری بنانے کی کئی فیکٹریاں لگا رکھی ہیں۔

دریائے بیاس: آزادیِ ہند کے وقت اجاڑے کا ایک عینی گواہ: امرتسر سے گزر کر ہمیں جالندھر پہنچنا تھا جہاں ہم نے کچھ دیر کے لیے رکنا تھا۔ میں نے نقشے میں دیکھا کہ امرتسر سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر جالندھر سے پہلے دریائے بیاس بہتا ہے اور وہیں پر بیاس نام کا ایک قصبہ بھی موجود ہے۔

میں اس دریا کو ایک مدت سے دیکھنا چاہتا تھا۔جس کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ میرے دادا کے دو بھائی، محمد اسماعیل اور محمد سلیمان اپنے آٹھ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ محمد سلیمان سب سے چھوٹے تھے۔ جب اجاڑا شروع ہوا تو وہ دور کسی گاؤں میں تھے (یاد رہے ہمارے والدین نے کبھی بھی ہجرت یا نقل مکانی کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ تقسیم کو پاڑے اور ہجرت کو اجاڑے دونوں پنجابی کے الفاظ ہیں، کہتے تھے اجاڑا اجڑنے کو اور پاڑا، کسی چیز کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے کو کہتے ہیں)۔ میرے بزرگوں کو اپنے علاقے سے کس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے پنجاب کے بٹوارے کے بعد تقریباً تین سال تک اسی آس میں گزارے کہ امن ہو جائے گا اور وہ واپس چلے جائیں گے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ گدی پر بیٹھا راجا تو بدلتا ہے لیکن پرجا (رعایا) تو نہیں بدلتی۔ انگریزوں کی بجائے سکھ یا ہندو حکمران تو ہو سکتے ہیں لیکن تاریخ میں رعایا تو کبھی بھی نہیں بدلی۔ ہم تو صدیوں سے رعایا تھے اور ہم تو اسی دیس کی رعایا رہیں گے۔ میرے بزرگوں نے کبھی ہندوستان کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جب بھی اپنے شہر سرہند کا ذکر کیا یہی کہا کہ یہ ہمارا دیس ہے۔

سرہند سے محبت کی نشانی کے طور پر سرہند سے آنے والے لوگوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سرہند کالونی بنائی اور اپنے آپ کو سرہندی کہلوایا۔ آج بھی ہمارے گھروں پر سرہندی لکھا ہوا ہے اور کئی لوگوں کے نام کا لاحقہ بھی سرہندی ہے۔ امن کے دور میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد مجدد الف ثانی کے سالانہ عرس میں شرکت کے لیے جاتی تھی۔

اب ہم واپس اپنے سفر کی طرف آتے ہیں۔

میں دریائے بیاس سے جڑی ایک یاد کا ذکر کر رہا تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو سب لوگوں نے محمد اسماعیل اور محمد سلیمان (جو ایک قریبی گاؤں میں اپنی زمین پر کام کر رہے تھے) سے کہا کہ آپ شہر کی طرف نہ جائیں کیونکہ وہاں بہت قتل و غارت ہو رہی ہے۔ وہ کھیتوں میں چھپتے چھپاتے کئی روز کے سفر کے بعد انبالہ چھاؤنی پہنچ گئے۔ ان دنوں انبالہ چھاؤنی میں ایک بڑا کیمپ لگا ہوا تھا، جو آزادیِ ہند کے کئی سال بعد بھی قائم رہا، جہاں اغوا شدہ بچوں اور عورتوں کو لا کر رکھا جاتا تھا اور انھیں پاکستان بھیجنے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ میرے وہ دونوں بزرگ اس کیمپ میں کئی ماہ تک رہے۔ بعد ازاں ایک دن وہ ٹرین پر سوار ہو کر لاہور کی طرف چل پڑے۔ میں نے ان بزرگوں سے اس گاڑی کے سفر سے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس گاڑی کے سفر میں دریائے بیاس کا سفر بھی آتا تھا۔ اس وجہ سے مجھے اس دریا کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

محمد اسماعیل صاحب میرے دادا کے چھوٹے بھائی جنھیں ہم بابا جی کہتے تھے، ایک دن مجھے ان سے طویل گفتگو کا موقع ملا۔ انھوں نے بتایا کہ جب ان کی گاڑی دریائے بیاس پر سے گزر رہی تھی تو ان دنوں دریا میں زبردست سیلاب آیا ہوا تھا۔ انھوں نے دیکھا کے دریا کے آس پاس بے شمار گڑھے پڑے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کی لاشوں کی باقیات بھی جا بجا دکھائی دے رہیں تھیں۔ کئی لاشیں تو درختوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ سیلاب کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ لوگوں نے دریا عبور کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ اب پانی تو کم ہو گیا لیکن لاشیں درختوں کے ساتھ ہی رہ گئیں۔ ایسے کئی واقعات کی انھوں نے کچھ اس طرح سے منظر کشی کی کہ میرے اندر دریائے بیاس کو دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔

میں دریا سے گزرتے ہوئے بابا اسماعیل کی وہ گفتگو دہرا رہا تھا جو انھوں نے مجھ سے کی۔

آج میری یہ خواہش پوری ہو رہی تھی؛

اور وہ زخم بھی تازہ ہو رہے تھے جو میرے بزرگوں کے جسموں اور روحوں پر لگے تھے؛

ان کی ٹیسیں آنے والی کئی نسلیں بھگتیں گی؛

میں ان کی تیسری نسل میں سے ہوں؛

میں یہ درد شدت سے محسوس کر رہا ہوں اور میری یہ تحریر اس درد کو اگلی نسل تک پہنچانے کی ایک کوشش ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے مجھے بتایا کہ جیسے ہی ان کی گاڑی نے دریا عبور کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کو ایک ویرانے میں روک دیا۔ جیسے ہی ٹرین رکی، بے شمار لوگوں نے، جن میں اکثریت سکھوں کی تھی، ان پر حملہ کر دیا۔ اس ٹرین میں جتنے بھی لوگ تھے ان میں سے صرف وہی بچے جو اس ڈبے میں تھے جس میں محمد اسمٰعیل اور ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی بچنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس ڈبے میں چند گورکھا سپاہی تھے جن کے پاس ہتھیار تھے۔ اسی وجہ سے حملہ کرنے والے اس ڈبے سے دور ہی رہے۔

باقی کسی کو کوئی بچانے والا نہیں تھا؛

سب مارنے والے تھے، جب سب مار دیے گئے پھر لاشوں بھری گاڑی کو لاہور کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

آج میں انھیں دو مقامات کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس قدر خون بہایا گیا کہتے ہیں کہ بیاس بھی سرخ ہو گیا تھا۔

ایک درد بھری نظم کے چند اشعار، میں نے یہ نظم افضل کمیانہ کے فیس بک پیج سے لی ہے اور انھوں نے شاعر کا نام ارشاد سندھو لکھا ہے۔

چونکڑیاں چوبارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
ساڈے چن تے تارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر

ونڈاں پا کے ہسن والے اج اُس ماں دا جرم تے دسن
جہدے راج دُلارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
خورے کہڑی کہڑی تھاں تے رُلیاں لیکھاں سڑیاں بھیناں
لبھدے ویر پیارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
قسمے ویکھے نیں میں اک دُوجے دی حالے وی راہ تکدے
جہڑے لیکھاں ہارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
رہ گئے کئی کرتارے تے کئی کوراں اک دوجے نوں لبھدے
کنے داری دارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
کِسّے نوں کیہ دسیے ساڈی اوہ وی گل نہ پوری ہوئی
جہڑی گل دے مارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
ازلاں دے ساں ساتھی پر اے ساتھ نہ نبھیا ساتھوں
وعدے بن کے لارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر

دریائے بیاس جسے سکندر بھی پار نہ کرسکا: اس سے پہلے کہ میں آپ کو بیاس کے کنارے بیاس قصبے میں موجود ایک نئے مذہب کے بارے میں کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ آپ کو اس دریائے بیاس کی تاریخ سے آگاہ کیا جائے جو ہندوؤں کے نزدیک ایک مقدس دریا مانا جاتا ہے۔

دریائے بیاس پنجاب کے ان پانچ دریاؤں میں شامل ہے جس کی وجہ سے پنجاب کو پنجاب کہا جاتا ہے (بیاس، ستلج، راوی، چناب، جہلم)۔ دریائے سندھ صرف ڈی جی خان کے پاس کچھ دیر کے لیے پنجاب میں بہتا ہے۔ یہ ان پانچ دریاؤں میں سے سب سے چھوٹا دریا ہے اس کی لمبائی 470 کلومیٹر ہے۔ یہ ہماچل پردیش سے شروع ہو کر امرتسر کے شمال مغرب میں دریائے ستلج میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دریائے ستلج قصور کے قریب سے پاکستان میں داخل ہوتا ہے اور پھر ملتان کے بعد یہ بڑے دریاؤں میں شامل ہو کر پنجند کے مقام پر دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ لاہور سے جاتے ہوئے امرتسر کے بعد پہلا دریا یہی آتا ہے۔ اس کے بعد لدھیانہ سے

آگے دریائے ستلج گزرتا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ ایک بہت مقدس دریا ہے۔ تاریخ میں اس کے کئی نام ملتے ہیں۔

بیاس دریا سے جڑا ہوا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے ایک بہت بڑے رہنما رشی وشیشا تا نے ایک مرتبہ اپنی روح پاک کرنے کے لیے اپنے آپ کو رسیوں سے باندھ کر دریا میں چھلانگ لگا دی لیکن جیسے ہی وہ دریا میں گرے تو رسیاں ٹوٹ گئیں اور وہ بچ گئے جس کے بعد انھوں نے اس دریا کا نام ویشترا یعنی رسیاں توڑنے والا رکھ دیا۔ انھوں نے اپنی رہائش بھی اسی دریا کے پاس رکھی اور بعد میں ہندو مت کے اندر ایک اہم مقام پر بھی فائز رہے۔

اس دریا کی بہت اہم تاریخی حیثیت بھی ہے جس کی کڑی سکندر کے حملوں سے جڑی ہوئی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ سکندر چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور اس کی پہلی لڑائی دریائے جہلم کے کنارے راجا پورس سے ہوئی۔ جس میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا لیکن بعد میں اس نے پنجاب کے کئی علاقے بھی فتح کیے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب اس کی فوج بیاس کے کنارے پہنچی تو اس نے اس مقام سے آگے جانے سے انکار کر دیا۔

اس کی کیا وجہ تھی؟ اس بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ جن میں ایک یہ بھی ہے کہ سکندر کے فوجی جنگ سے تھک گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ مقامی لوگوں کی طرف بہت زیادہ مزاحمت تھی۔ اب تک جو میں نے جانا ہے اس کے مطابق میرا خیال ہے کہ دریا کا بہاؤ اور مقامی لوگوں کی سخت مزاحمت ہی اسی کی واپسی کا سبب بنی تھی۔

صحیح بات کیا ہے۔۔۔یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

اس دریا پر کئی ڈیم بھی بنائے گئے ہیں۔ جن سے کئی نہریں نکالی گئی ہیں اور دو ہزار میگا واٹ سے زیادہ بجلی بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دریا 14 ہزار فٹ کی بلندی سے شروع ہوتا ہے۔ جس سے پانی کا بہاؤ بہت تیز ہو جاتا ہے جو بجلی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ صدر ایوب اور پنڈت جواہر نہرو کے درمیان ہونے والے سندھ طاس معاہدے کے مطابق جو تین دریا بھارت کو دیے گئے تھے ان میں راوی اور ستلج کے ساتھ

ساتھ بیاس بھی شامل تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ عام دنوں میں بھارتی اس پانی سے مستفید ہوتے ہیں اور سیلاب کی صورت میں یہ دریا پاکستان میں تباہی پھیلاتے ہیں۔

بیاس: جہاں ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی گئی: دریائے بیاس کے کنارے ضلع امرتسر میں جی ٹی روڈ پر بیاس نام کا ایک قصبہ بھی ہے۔ یہ قصبہ ریاست کپورتھلہ سے تقریباً پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جالندھر سے اس کا فاصلہ تقریباً چالیس کلومیٹر ہے۔ یوں تو یہ ایک عام سا قصبہ ہے لیکن اس کی اصل وجہ شہرت یہاں واقع رادھا سوامی ست سنگ بیاس، (جسے عام طور پر آر ایس ایس بی بھی کہا جاتا ہے) کا مرکز ہے، اسے ڈیرہ بابا جیمل سنگھ بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے۔ اس کے بارے ایک کتاب میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ اس کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں بھی اس بارے لکھا ملتا ہے۔ اس دھرم کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ 1891ء میں آر ایس ایس بی کی بنیاد رکھی گئی، جب سوامی شیو دیال سنگھ جی نے بابا جیمل سنگھ جی کو دریا کے پاس گیان کرنے کو کہا۔ اس کا آغاز ایک جھونپڑی سے کیا گیا۔ بعدازاں بے شمار لوگوں نے اس نظریے کو اپنایا۔ سوامی جی کے لباس سے لگتا ہے کہ وہ سکھ نہیں تھے لیکن موجودہ گرو، بابا گرندر سنگھ، (جو مہاراج چرن سنگھ جی کے پیروکار ہیں) کے لباس سے لگتا ہے کہ ان کا تعلق سکھ مت سے ہے۔ یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ہم سب کا رب ایک ہی ہے جو ہمارے اندر رہتا ہے۔ آپ کسی بھی دھرم یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد خدا کی الوہیت کا تجربہ کرنا ہے جو ہم سب کے اندر رہتا ہے۔ یہ جان کر ہی ہم اس حقیقت کو محسوس کر سکتے ہیں کہ صرف ایک خدا موجود ہے اور ہم سب اس کی محبت کا اظہار ہیں۔

یہ لوگ روحانی طور پر صفائی کے بے حد قائل ہیں اور وہ یہ کام کسی استاد کی نگرانی میں کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ روزانہ گیان اور کئی دوسرے عمل بھی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی بھی طرح کا گوشت نہیں کھاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے سے آپ کو زندگی سے پیار ہوگا۔ ان

کے ہاں صرف پھل اور سبزیاں ہی کھائی جاتی ہیں وہ ہر طرح کے نشے سے پرہیز کرتے ہیں۔۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ہندو ہوں یا سکھ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اصل بات من کی صفائی ہے۔میں نے ان کی کئی وڈیوز دیکھی ہیں جن میں صرف صفائی اور نیک کام کرنے پر ہی زور دیا جاتا ہے۔

یہ ایک تاریخی قصبہ ہے۔ہم اس کے پاس سے گزر رہے تھے اور سرہند کے اس ریستوران کا انتظار کر رہے تھے جہاں ہمیں رکنا تھا۔ بچے بھی تھوڑے پریشان ہو رہے تھے۔ کیونکہ میری دلچسپی ارد گرد کے ماحول کو دیکھنے میں ہوتی ہے اس لیے مجھے زیادہ پریشانی نہیں تھی لیکن بچوں کو پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔

کپورتھلہ، سلطان پور اور کرتار پور

دریائے بیاس عبور کرنے کے بعد ہمارے راستے میں پہلا قابل ذکر قصبہ کرتار پور آیا۔ یاد رہے نارووال کے پاس کرتار پور گردوارہ صاحب بھی موجود ہے جو بھارتی سرحد کے بالکل قریب ہے۔ ابھی حال ہی میں بھارتی لوگوں کو اس گردوارے تک رسائی دینے کے لیے ایک راہداری بنائی گئی ہے۔ ہمارے دائیں طرف دو اہم شہر کپورتھلہ اور سلطان پور لودھی تھے۔ قابل احترام میاں طفیل محمد (جو ایک وقت میں امیر جماعت اسلامی بھی رہے) کا تعلق بھی کپورتھلہ سے ہی تھا۔ جبکہ سلطان پور لودھی، لودھی خاندان کے ایک حکمران کے نام پر رکھا گیا تھا۔

اگر مزید بائیں طرف دیکھیں تو ایک سڑک فیروز پور کی طرف اور وہاں سے آگے قصور تک جاتی ہے۔ یہ وہی فیروز پور ہے جس کے نام پر لاہور میں فیروز پور روڈ ہے۔ فیروز پور کی بنیاد سلطان فیروز تغلق نے رکھی۔ ہمارے بائیں طرف، یعنی شمال مشرق کی جانب دسوعہ، ہریانہ اور ہشیار پور کے علاوہ بھی کئی اہم شہر موجود تھے۔ ان سب کا تعارف تو ممکن نہیں لیکن میں چند ایک کا تعارف آپ کی خدمت میں ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔

کرتار پور: بابا گرونانک کی یاد میں بسا شہر: کرتار پور جالندھر سے پندرہ کلومیٹر پہلے جی ٹی روڈ پر واقع ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بنیاد سکھوں کے پانچویں گرو شری گرو ارجن دیو جی نے رکھی تھی۔ اس کا یہ نام رکھنے کی وجہ کرتار پور نارووال کے نزدیک واقع گرونانک کے نام کا گردوارہ ہے۔ شاید انھوں نے گرونانک صاحب کی محبت میں ہی اس جگہ کا نام کرتار پور رکھا ہو۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ہم جب وہاں سے گزرے تو میں

نے دیکھا کہ وہ بالکل ہمارے ہاں پنجاب میں بنے قصبے کی طرح تھا۔ کوئی فرق نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن ابھی جب میں نے اس کے بارے میں پڑھا تو مجھے شہر سے متعلق ایک اور اہم بات بھی جاننے کا موقع ملا۔ 2014ء میں اس شہر میں جنگ آزادی میں شہید ہونے والے لوگوں کی یاد میں پچیس ایکڑ پر پھیلا ایک میوزیم بنایا گیا۔ اس وقت یہ ایک بہت بڑی بلڈنگ ہے۔ یہاں ایک شہیدی مینار بھی بنایا گیا ہے جو کافی دور سے بھی نظر آتا ہے۔

اس شہر سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں ہمارا گھر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں لکڑ منڈی کے پاس تھا۔ وہاں پر ایک صاحب، جنھیں ہم مستری بابا جی کہتے تھے، فرنیچر وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے ہمارا ان کے پاس کافی آنا جانا تھا۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ ہندوستان بھر میں تین شہر ایسے تھے جہاں پر فرنیچر کا بہت ہی خوب صورت کام ہوتا تھا۔ ان میں کرتار پور، شکار پور سندھ اور چنیوٹ شامل ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ شکار پور جانے کا موقع ملا۔ میں نے وہاں کسی سے پوچھا تو علم ہوا کہ وہ کام اب یہاں پر زیادہ نہیں ہوتا البتہ چنیوٹ اب بھی فرنیچر کے لیے بہت مشہور ہے۔ کرتار پور کا فرنیچر بھی بہت شاندار مانا جاتا ہے۔

اس طرح مجھے اس شہر سے گزرتے ہوئے وہ بزرگ بھی یاد آئے جو ہم بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ فرنیچر کا کام کرتے تھے۔ ان کی ورکشاپ ہمارے گھر کے قریب ہی تھی۔ وہ ہمیں گلی ڈنڈا بنا کر دیتے تھے۔ یہ کرکٹ سے پہلے کی بات ہے جب ایک گلی اور ایک ڈنڈے سے پورے محلے کے بچے کھیلتے رہتے تھے۔ ہمارے بچپن کا کھیل بھی یہی گلی ڈنڈا ہی تھا۔ اب بھی دور دراز دیہات میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے لیکن شہری علاقوں میں گلی ڈنڈا قصہ پارینہ بن چکا ہے۔

کپورتھلہ: جہاں سکھ راجہ نے ایک عالیشان مسجد بھی بنائی: کرتار پور سے کپورتھلہ کا فاصلہ تقریباً پندرہ کلومیٹر کا ہے اور یہ اس کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ جالندھر سے اس کا فاصلہ پچیس کلومیٹر ہے۔ پہلی مرتبہ کپورتھلہ کے نام کے بارے میں میاں طفیل محمد، سابق امیر جماعت اسلامی کی سوانح عمری پڑھتے ہوئے جاننے کا موقع ملا- میں نے کپورتھلہ سے متعلق مزید جانا تو مجھے بہت ہی دلچسپ باتوں کا علم ہوا۔ اس شہر سے عقیدت ایک تو میاں صاحب کی وجہ سے تھی اور

دوسرا جب میں نے اس شہر پر حکمرانی کرنے والے لوگوں کے بارے میں پڑھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہی وہ لوگ تھے جو حکمرانی کے لائق تھے اور انھوں نے حکمرانی کا حق بھی ادا کیا۔ ابھی حال ہی میں جب میں نے اس سے متعلق مختلف ویڈیوز دیکھیں تو وہ بھی بہت حیران کن تھیں۔ بہت سے لوگ اسے پنجاب کا پیرس کہتے ہیں اور یہ بات غلط بھی نہیں ہے۔

کپورتھلہ ریاست تقریباً دو سو سال تک قائم رہی۔ یہ ایک بہت ہی چھوٹی ریاست تھی۔ جس کا رقبہ ساڑھے تین سو مربع کلومیٹر تھا جبکہ بیسویں صدی کے آغاز میں اس کی آبادی تین لاکھ کے قریب تھی۔ یہ ریاست 1772ء میں قائم ہوئی اور 1949ء میں بھارت میں ضم ہوگئی۔ میں اس کا کچھ احوال بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اس ریاست کے بارے میں مجھے ایک ایسی بات بھی جاننے کو ملی جس کی مثال پورے بھارت میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اس کام کی وجہ سے اِس ریاست کے سکھ راجا کے حصے میں بہت زیادہ نیک نامی بھی آئی۔

تاریخی کتابوں سے یہ جاننے کو ملتا ہے کے پہلی صدی عیسوی میں خراسان سے آنے والے لوگوں نے، جو دراصل رومی نسل کے لوگ تھے، اس علاقے پر حملہ کیا تھا۔ ان جنگوں میں کرشنا کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک بیٹے (جس کا نام سالی باہن تھا) نے سیالکوٹ شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ بہت قدیم تاریخ ہے جس میں بہت سی باتیں واضح نہیں ہیں۔ تیرھویں صدی میں جب مسلمانوں نے پنجاب کو فتح کیا تو یہاں کے مقامی لوگ راجستھان کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ اس وقت راجستھان میں جیسلمیر نامی ایک ریاست موجود تھی۔ پھر ایک وقت آیا جب علاؤالدین خلجی نے جیسلمیر کو بھی فتح کر لیا جس کے نتیجے میں وہ لوگ کئی علاقوں تک پھیل گئے۔ وہ لوگ جاٹ کہلاتے تھے۔ پھر جب سکھوں نے سترھویں صدی میں مغلیہ حکومت کے خلاف جنگ کی تو انھوں نے گرو ہرگوبند صاحب کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور لاہور پر حملہ کرنے والی فوج کا ایک اہم حصہ بن گئے۔

اس وقت لاہور کا گورنر دلاور خان تھا۔ وہ ان کی بہادری سے بے حد متاثر ہوا اور ان سے صلح کی کوشش کی۔ صلح ہوگئی، جس کے بدلے میں دلاور خان نے انھیں ایک بڑی جاگیر دی، جس میں

ایک گاؤں آہلو بھی تھا۔ اس گاؤں کی وجہ سے ان کا نام آہلو والیہ پڑ گیا۔ اس خاندان نے آگے جا کر کپورتھلہ ریاست کی بنیاد رکھی جس کے سب راجے آہلو والیہ کہلواتے تھے۔ اس ریاست کے بانی کا نام سردار جسا سنگھ آہلو والیا تھا۔ جو سردار کے علاوہ سلطان القوم، نواب اور بابا بھی کہلواتا تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھا۔ سکھوں کے نزدیک وہ ایک نہایت ہی قابلِ احترام شخص کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس نے 1772ء میں کپورتھلہ ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ ریاست آزادیِ ہند تک قائم رہی۔ اس کی تاریخ بھی بہت ہی دلچسپ ہے۔

اس کے سب سے آخری راجا سر جگجیت سنگھ صاحب بہادر تھے جو 1872ء سے 1949 تک، ستر سال سے زائد، اس ریاست کے حکمران رہے۔ انھوں نے اس شہر میں بے شمار محلات، باغات اور تعلیمی ادارے بنوائے۔ یہاں پہلی مرتبہ سیوریج کے نظام کے علاوہ کئی دیگر اصلاحات بھی کیں جنھیں آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھیں پہلی مرتبہ 1877ء میں کسی کی نگرانی میں پانچ سال کی عمر میں گدی پر بٹھایا گیا تھا۔ جب وہ بالغ ہو گئے تو 1890ء میں انھیں کپورتھلہ کا راجا تسلیم کرلیا گیا۔ یہ ریاست انگریزوں کی ایک طفیلی ریاست تھی۔

مہاراجہ جگجیت سنگھ نے ریاست میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے ایک بڑی مسجد بھی بنائی۔ ایسا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے اور یہی ایک دلچسپ بات تھی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے اس مسجد کی کچھ تصاویر دیکھیں جو یہ بتا رہی تھیں کہ وہ بہت ہی خوب صورت مسجد ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ریاست کپورتھلہ میں ساٹھ فیصد سے زائد مسلمان رہتے تھے اور اس وقت کپور تھلہ میں مسلمان آبادی کا صرف دو فیصد ہیں۔ راجا نے اس مسجد پر اتنا زیادہ خرچ کیا کہ وائسرائے ہند نے اس سے متعلق پوچھا کہ آپ نے ایک عمارت پر اتنا خرچ کیوں کیا؟ اس کے جواب میں راجا نے کہا کہ میری ریاست کی ساٹھ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے لیے ایک بڑی مسجد بنائی جائے۔ اس مسجد کا ڈیزائن بھی ایک فرانسیسی آرکیٹیکٹ سے بنوایا گیا۔ میں نے اس بات کا ذکر اپنے ایک عزیز دوست فاروق بھٹی سے کیا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے کچھ رشتہ دار کپورتھلہ میں رہتے تھے اور کپورتھلہ کی مسجد کا ماڈل بھی

ان کے گھر موجود تھے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ مسجد انتہائی کشادہ اور خوب صورت ہے۔ اس مسجد کا افتتاح 1930ء میں نواب صادق خان، نواب آف بہاولپور نے کیا تھا۔

کیا خوب صورت بات ہے کہ ایک سکھ راجا نے اپنی ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے مسجد بنوائی لیکن خود اس کا افتتاح کرنے کی بجائے قریبی ریاست بہاولپور کے مسلمان نواب کو بلا کر اس سے افتتاح کروایا۔ تاریخ پڑھتے ہوئے اسی بے شمار دلچسپ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن کا ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوتا۔

مسجد کی تصاویر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد سپین میں واقع مسجد قرطبہ کی طرز پر بنائی گئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام مورس مسجد رکھا گیا۔ اس کی تزئین و آرائش میوسکول آف آرٹس لاہور کے آرٹسٹوں نے کی۔ اس کے اندر لکڑی کا بھی بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کی وجہ سے دیہات میں موجود مساجد تو بالکل ختم ہوگئی ہیں جبکہ شہر کی یہ بڑی مسجد بھی زبوں حالی کا شکار ہے۔ اگر وہاں مسلمان رہتے تو یقیناً اس مسجد کی شان و شوکت میں بھی اضافہ ہوتا۔ اس ریاست کی تاریخ پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جس قدر کام مہاراجا جگجیت سنگھ نے کیے ہیں، شاید ہی کسی اور نے کیے ہوں۔ میرے علم کے مطابق یہ ریاست وہ واحد ریاست تھی جس نے بطور ریاست آزادیِ ہند کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت سے آزادیِ ہند تو نہ رُک سکی البتہ کپورتھلہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔

جب میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس شہر کا نام کپورتھلہ کیوں ہے تو اس کی ایک دلچسپ وجہ معلوم ہوئی۔

تاریخ سے یہ جاننے کو ملتا ہے کہ عالمگیر کے دور سے پنجاب پر انگریزوں کے قبضے تک وہ حالت جنگ میں رہے، کبھی جیتے اور کبھی ہارے۔ وہ ایک مذہبی گروہ سے بڑھ کر ایک بہت بڑی سیاسی طاقت بنے اس دوران ان کی بہت سی ریاستیں بھی قائم ہوئیں اور پنجاب میں ان کو بارہا شکست بھی ہوئی۔ کپور سنگھ 1697ء میں شیخوپورہ پاکستان، کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا، جس کے نام پر کپورتھلہ شہر بسا۔ وہ خالصہ دَل کا بانی بھی تھا۔ کپور سنگھ ان لوگوں میں سے ہے جنھیں

سکھوں کے ہاں بہت زیادہ عزت دی جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اس کے والد نے پہلی مرتبہ سکھوں کی فوج بنائی جس نے لاہور کے مغل گورنر ذکریا خان بہادر کے خلاف جنگ لڑی۔ یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے ذکریا خان نے پہلی مرتبہ سکھوں کی گرفتاری، (زندہ یا مردہ) پر ایک بہت بڑا انعام رکھا۔ جس کے خوف سے تمام سکھ پنجاب کے مختلف جنگلوں میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر رہنے لگے لیکن جب یہ طریقہ بھی کامیاب نہ ہوا تو مغلیہ حکمرانوں نے ذکریا خان کو اس کام سے منع کر دیا اور اس وقت کے سکھوں کے سردار کپور سنگھ کو نواب کا خطاب دے دیا۔ عام طور پر نواب کا خطاب مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا، پہلی مرتبہ یہ خطاب کپور سنگھ اور اس کے بڑوں کو دیا گیا۔ نواب کپور نے یہ خطاب دیگر سکھوں کی مرضی سے لیا۔

❁ ❁ ❁

سلطان پور لودھی

جہاں سکھ مذہب کا آغاز ہوا

میں نے نقشے میں دیکھا کہ کپورتھلہ سے جنوب مغرب کی جانب سلطان پور لودھی نام کا ایک شہر موجود ہے۔میں نے اس سے پہلے سکھوں کی تاریخ پڑھتے ہوئے یہ جانا تھا کہ گرونانک صاحب ننکانہ میں پیدا ہوئے اور بعد میں سلطان پور لودھی چلے گئے جو جالندھر سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔سکھوں کے مطابق بابا گرونانک صاحب نے چودہ سال سے زائد عرصہ اس شہر میں گزارا۔اس وجہ سے یہ شہر سکھوں کے نزدیک بہت ہی متبرک مانا جاتا ہے۔ہم اس سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے سے گزر رہے تھے،ہم اسے دیکھ تو نہ سکے لیکن بہت سے سکھوں کے ساتھ بات چیت کرنے سے علم ہوا کہ یہ شہر ننکانہ صاحب کے بعد ان کے لیے نہایت ہی مقدس ہے۔

اس شہر کا ایک مختصر احوال آپ کی خدمت میں پیش ہے جو اس شہر بارے ایک ویب سائٹ https://dvnetwork.org/ Page/sultanpur-lodhi پر موجود ہے۔

اس جگہ پر دو ہزار سال پہلے بھی ایک شہر (جس کا نام سروانپورا تھا) آباد تھا، جو اس وقت بدھ مت کا بہت بڑا مرکز تھا۔جب ہندو دھرم کا آغاز ہوا تو ہندو بھی یہاں آ کر بسنے لگے۔تاریخی کتب میں یہ بھی تحریر ہے کہ بدھ مت کی بہت سی کتابیں اسی شہر میں لکھی گئیں۔گیارہویں صدی کے آغاز میں جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس نے اس شہر پر بھی حملہ کیا اور اس کی تباہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس شہر کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔محکمہ

آثارِ قدیمہ کے سروے سے بھی یہ تصدیق ہوتی ہے کہ اس جگہ پر کبھی ایک بڑا شہر بھی آباد تھا۔

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے دہلی کا ایک راستہ سلطان پور لودھی کے قریب سے بھی ہو کر جاتا ہے۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو یہ جان سکیں گے کہ یہ راستہ جی ٹی روڈ سے نسبتاً کم طویل ہے۔ ایک اور بات بھی اہم ہے کہ ہندوستان کے مغربی علاقوں میں، خاص طور پر راجستھان اور گجرات جانے کے لیے بھی یہی راستہ موزوں تھا۔ اسی وجہ سے سلطان پور لودھی ایک بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ سلطان پور لودھی دریائے ستلج کے مشرق میں واقع ہے اس کے قریب ہی ایک بڑا برساتی نالہ بھی بہتا ہے جسے کالی بھین کہتے ہیں۔

بارھویں صدی میں جب دہلی پر ناصر الدین محمد شاہ کی حکومت تھی تو اس نے اپنے ایک رشتے دار نواب ولی محمد خان لودھی کو پنجاب کا گورنر بنایا۔ اس کا ایک بیٹا سلطان اس راستے سے گزر رہا تھا تو اسے یہاں کی خوب صورتی بہت پسند آئی اور اس نے علاقے سے متعلق مزید دریافت کیا تو اسے پتہ چلا کہ یہاں پر کبھی ایک بڑا شہر بھی آباد تھا جسے غزنوی کی فوجوں نے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ یہ سب جان کر اس نے اسی مقام پر ایک نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا اور اس کا نام سلطان پور لودھی رکھا۔

جیسا کہ میں نے پچھلی سطور میں ذکر کیا ہے کہ یہ اس وقت لاہور اور دہلی کے درمیان میں ایک معروف گزرگاہ بھی تھی جس کی وجہ سے بہت سے تجارتی قافلے انھی علاقوں سے ہو کر گزرتے تھے، اس سب کو مدنظر رکھ کر سلطان نے یہاں پر ایک بہت بڑی مارکیٹ بھی بنوائی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں پر چھ ہزار کے قریب دکانیں تھیں۔ اس کا کوئی ثبوت تو نہیں ہے لیکن عام طور پر یہی بات کہی جاتی ہے۔

آئین اکبری میں بھی اس شہر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس بات کا بھی ذکر ہے کہ یہاں پر کئی شاہی عمارتیں موجود تھیں جن میں بہت سے باغات بھی تھے۔ یہ بات جان کر مجھے بھی حیرانی ہوئی کہ یہ شہر دینی مدارس کے لیے بھی بہت مشہور تھا اور بہت سے مسلمان یہاں پر آباد تھے۔ ان مدارس کی تفصیل تو نہیں ملتی البتہ یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ شاہجہان کے بیٹے اورنگزیب اور داراشکوہ نے اپنی ابتدائی دینی تعلیم اسی شہر میں واقع ایک مدرسے سے حاصل کی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ

اس شہر کو پیراں پور، یعنی پیروں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔اس شہر میں کچھ تو ایسی بات ہوگی جس کی وجہ سے مغل حکمران اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے یہاں بھیجتے تھے۔سلطان پور کی دوسری اہم بات بابا گرونانک صاحب سے جڑی ہوئی ہے۔

بابا گرونانک صاحب 1469ء میں ننکانہ صاحب کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن یہاں میں جس بات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انھوں نے تقریباً 14 سال سے زائد کا عرصہ اسی شہر میں گزارا اور یہیں سے اپنے دھرم کا آغاز بھی کیا، جس کا ایک مختصر احوال آپ کی خدمت پیش ہے۔

بابا گرونانک کی بہن بی بی نانکی جی کی شادی سلطان پور میں ہوئی۔سکھ روایت کے مطابق بابا جی کسی وجہ سے اپنی بہن کے پاس اس شہر میں آ گئے۔انھوں نے یہاں پر ایک مسلمان راجا کی ملازمت بھی کی۔سکھوں کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ راجا کو کوئی بہت ہی ایماندار آدمی چاہیے تھا جس پر گرونانک بالکل پورے اترتے تھے۔کچھ لوگوں نے ان کی شکایت بھی کی جس پر راجا نے انھیں تین دن کے لیے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔وہ کوٹھڑی اب بھی موجود ہے اور سکھ بڑی تعداد میں اس کے درشن کے لیے آتے ہیں۔

سکھوں کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہیں پر بابا گرونانک صاحب نے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا اور اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ایک عمارت بھی بنوائی۔میرا خیال ہے کہ گردوارہ کے لفظ کا آغاز بھی یہیں سے ہوا ہوگا کیونکہ لفظ گردوارہ کا مطلب ہے گرو کا دوارہ۔دوارہ کا مطلب دروازہ نہیں بلکہ کسی حد تک یہ دربار کا مطلب یا آنگن ادا کرتا ہے۔پنجابی سے تعلق رکھنے والے لوگ دروازے اور دوارے میں فرق جان سکتے ہیں۔دروازہ صرف اسے کہتے ہیں جہاں سے گزرا جا سکے جبکہ دوارہ اسے کہتے ہیں جو گھر کا پہلا حصہ ہوتا ہے جہاں مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے۔جتنے بھی گردوارے ہیں ان کا مطلب بھی یہی ہے گرو کا دوارہ، دروازہ نہیں، جہاں ہر کسی کو جانے کی اجازت ہے۔اس لیے کسی بھی گردوارے میں کسی کو بھی جانے، بیٹھنے اور کھانا کھانے سے منع نہیں کیا جاتا۔

ہر گردوارے میں تین چیزیں لازم ہوتی ہیں۔ ایک دربار صاحب جہاں پر گرنتھ صاحب کو ایک اونچے تخت پر رکھا جاتا ہے اور لوگ اس کے اردگرد بیٹھ کر اسے پڑھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک لنگر خانہ، جہاں پر سب لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست ہوتا ہے۔ ہر گردوارے پر ایک جھنڈا بھی لگا ہوتا ہے جسے نشان صاحب کہا جاتا ہے۔

نادر شاہ نے بھی اس شہر کو تباہ کیا اور جو تباہی مچائی جا سکتی تھی وہ اس نے مچائی۔ بعدازاں سردار جسا سنگھ آہلو والیا نے اس شہر کو دوبارہ بسایا اور کپورتھلہ ریاست کی بنیاد رکھی۔ جنگوں اور علاقے میں افراتفری کی وجہ سے لاہور اور دہلی کا یہ راستہ غیر محفوظ ہو گیا اور موجودہ جی ٹی روڈ کو لاہور سے دہلی جانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس شہر پر ایک فلم بھی بنائی گئی ہے جس کا نام، داستان سلطان پور لودھی ہے۔ یہ شہر جو کبھی پیروں کا علاقہ تھا اور دہلی کے بادشاہ اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کے لیے یہاں بھیجتے تھے، آزادیِ ہند کے بعد یہاں کوئی بھی مسلمان نہیں رہتا۔ سب یا تو مار دیے گئے یا پاکستان ہجرت کر گئے۔ البتہ نام ابھی تک باقی ہے۔ جسے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

ہجرت کی راہ کس نے کیسے عبور کی؟ یہ سب اب تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے!

سعود عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کے پوتے نے ہجرت پر اپنے تاثرات ایک نظم کی شکل میں بیان کیے ہیں۔ یہ نظم مجھے محترم بھائی راؤ محمد ظفر نے بھیجی تھی۔

ہچکیوں نے کسی دیوار میں در رکھا تھا
میرے آباء نے جب اِس خاک پہ سر رکھا تھا
گھر سے نکلے تھے تو اِک دشتِ فنا کی صورت
راہ میں صرف سفر ، صرف سفر رکھا تھا
دل تھے متروکہ مکانات کی صورت خالی
اور اسباب میں چھوڑا ہوا گھر رکھا تھا
جسم اجداد کی قبروں سے نکلتے ہی نہ تھے
نسل در نسل اِسی خاک میں سر رکھا تھا

روح پر نقش تھے وہ نقش ابھی تک جن میں
رنگ بچپن کی کسی یاد نے بھر رکھا تھا
دل میں سرسبز تھے اُس پیڑ کے پتے جس پر
دستِ قدرت نے ابھی پہلا ثمر رکھا تھا
کٹتے دیکھے تھے وہ برگد بھی، جنھوں نے خودکو
مدتوں دھوپ کی بستی میں شجر رکھا تھا
جلتے دیکھے تھے وہ خود سوز محلّے جن میں
جانے کب سے کوئی خوابیدہ شرر رکھا تھا
چوڑیاں ٹوٹ کے بکھری تھیں ہراک آنگن میں
اک کنواں تھا کہ تمنّاؤں سے بھر رکھا تھا
راہ تھی سرخ گلابوں کے لہو سے روشن
پاؤں رکھا نہیں جاتا تھا ، مگر رکھا تھا
قافلے ایک ہی سرحد کی طرف جاتے تھے
خواب کے پار کوئی خوابِ دگر رکھا تھا
تیرگی چیر کے آتے ہوئے رستوں کے لیے
ایک مہتاب سرِ راہِ گزر رکھا تھا
اک حسیں چاند تھا اک سبز زمیں پر روشن
اک ستارے کو بھی آغوش میں بھر رکھا تھا
حرفِ اظہار میں حائل تھیں فصیلیں لیکن
رکھنے والے نے خموشی میں اثر رکھا تھا
چشمِ بینا میں وہ منظر ابھی تازہ ہے جناب
میرے آباء نے جب اس خاک پہ سر رکھا تھا

❀❀❀

جالندھر

صدیوں پرانا ایک شہر

میں نے اپنے پاس موجود نقشے میں دیکھا کہ جی ٹی روڈ پر ہمارے راستے میں جالندھر شہر ہے اور ہم اس کے پاس سے بھی گزریں گے۔ جالندھر کا ذکر آتے ہی بہت سے نام ذہن میں آجاتے ہیں جن میں سے کچھ کا تعلق فلم انڈسٹری سے کچھ کا ادب سے اور کچھ کا سیاست سے ہے۔ سب سے پہلا نام میرے ذہن میں وہ حفیظ جالندھری کا آیا تھا۔ جو پاکستان کے قومی ترانے کے خالق ہیں۔ انھوں نے اس کے علاوہ بھی بہت ساری شاعری کی ہے لیکن ان کی وجہ شہرت قومی ترانہ ہی ہے۔ میرا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے اور میں ایک طویل عرصہ فیصل آباد میں رہا ہوں۔ فیصل آباد میں ان لوگوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہے جو آزادیِ ہند سے پہلے اور آزادیِ ہند کے بعد جالندھر سے پاکستان آئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان میں لوگوں سے بھارتی شہروں کے نام پوچھے جائیں تو جالندھر ان چند ناموں میں سے ہوگا جنھیں لوگ زیادہ جانتے ہوں گے۔ ابھی سرہند کافی دور تھا، بچے تھکاوٹ بھی محسوس کر رہے تھے اور بھوک لگنا بھی ایک فطری سی بات تھی۔ اردگرد ایک میدانی علاقہ تھا۔ بڑی تعداد میں لوگ کھیتوں میں چاول کاشت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

نقشے سے پتہ چلا کہ ہمارے بائیں طرف ہشیار پور ہے۔ اگر آپ نقشہ دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس شہر سے بہت سی سڑکیں دوسرے شہروں کو بھی نکلتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں

آپ کو ہشیار پور کے بارے میں کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ جالندھر کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

جالندھر کے نام سے متعلق کئی باتیں مشہور ہیں۔ ایک بات (جس پر بہت سے لوگوں کا اتفاق ہے،) کے مطابق زمانہ قدیم میں جالندھر نام کا ایک بادشاہ یہاں حکمرانی کرتا تھا جس کا ذکر مہابھارت میں بھی ہے۔ اسی کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دو دریاؤں کے درمیانی علاقے کو بھی جالندھر کہتے ہیں اور اسی لیے اس شہر کا نام جالندھر ہے۔ قدیم زمانوں میں جالندھر کی بادشاہی راوی اور ستلج کے درمیان تمام علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ راما کے بیٹے لاوا کی حکومت کا صدر مقام بھی یہی شہر تھا۔

اس شہر کی تاریخ پڑھتے ہوئے یہ بات بھی جاننے کو ملتی ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب، (جہاں وہ ایک طرف مہر گڑھ بلوچستان سے جڑی ہوئی ہے اور جنوب میں اس کی سرحدیں چنائی تک پھیلی ہوئی ہیں) کے اثرات شمالی ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جالندھر میں کئی جگہوں پر وادی سندھ کی تہذیب کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے یہ علاقہ قدیم عرصے سے آباد چلا آرہا ہے۔ یہ سب جان کر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وادی سندھ کی تہذیب ایک بہت بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی اور اپنے زمانے کی بہت ہی ترقی یافتہ تہذیب تھی لیکن اس تہذیب اور بعد میں آنے والے لوگوں کے درمیان کئی ہزار سال کا ایک زمانہ ہے جس سے یہ جاننے میں دقت پیش آرہی ہے کہ وہ لوگ کون تھے اور اس زمانے میں کیسے ایک ساتھ براہ راست رابطے میں رہتے تھے؟

تیرہویں صدی کے آخر میں علاؤالدین خلجی نے اس علاقے کو فتح کیا۔ اس کے بعد لاہور اور دہلی کے راستے پر ہونے کی وجہ سے جو بھی فاتح ہندوستان آیا اس نے جالندھر کی خبر ضرور لی۔ جالندھر کی تاریخ پڑھتے ہوئے بھی سلاطین دہلی کے دور کی بے شمار لڑائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ بعد ازاں مغل بھی اس پر قابض ہوئے۔ شاہ جہاں نے حسب معمول یہاں سرائے بنائی اور کئی دیہات کی بنیاد بھی رکھی جن میں ایک علاقہ پھلور بھی ہے۔ سکھوں اور مغلیہ سلطنت کے درمیان

بہت سی لڑائیاں بھی اسی علاقے میں لڑی گئیں۔ بابا بندہ سنگھ بہادر بھی اس علاقے کا ایک مشہور جرنیل تھا۔ نادر شاہ نے بھی اس شہر کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔لڑائیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔

اس شہر کے آخری غیر ملکی حکمران انگریز تھے جنھوں نے 1846ء میں سکھوں کو شکست دے کر اس پر قبضہ کیا اور جان لارنس اس علاقے کا پہلا انگریز کمشنر مقرر ہوا۔اسی دور میں انگریزوں نے اس جگہ پر ایک چھاؤنی بھی تعمیر کی۔ جنگ آزادی میں بھی اس چھاؤنی میں موجود فوج نے مجاہدین آزادی کو کچلنے میں ایک اہم کرادر ادا کیا۔غدر پارٹی کے بھی بہت سے لوگوں کا تعلق اسی شہر سے تھا۔تحریکِ خلافت چلانے میں بھی یہ شہر پیش پیش تھا۔آزادیِ ہند کے وقت سب سے زیادہ نقصان بھی اس علاقے میں بسنے والے مسلمانوں کا ہوا۔مسلمان یہاں ایک کثیر تعداد میں آباد تھے اور اردگرد سکھوں کی آبادیاں تھیں جنھوں نے ناقابلِ بیان ظلم کیے۔

ہم جب جالندھر سے گزر رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آزادیِ ہند کے وقت اس شہر میں پچاس فیصد مسلمان پچیس فیصد ہندو پچیس فیصد سکھ تھے۔آج شہر میں ہندوؤں کی تعداد ستر فیصد سے زائد اور سکھ پچیس فیصد ہیں جو یہاں کی ثقافت،تہذیب و تمدن میں ایک اہم مقام رکھتے تھے ان کی تعداد ایک فیصد کے قریب ہے۔ یہ تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اب اس شہر میں کوئی بھی مسلمان آباد نہیں ہے۔جالندھر جو تیرھویں صدی سے مسلمانوں کی ملکیت میں چلا آرہا تھا اور مسلمانوں نے یہاں پر اپنی تہذیب و تمدن کی بے شمار نشانیاں بھی چھوڑی تھیں، جو مساجد اور سرائے کی شکل میں آج بھی شہر میں موجود ہیں،لیکن انھیں بنانے والے یہاں نہیں ہیں۔

پاکستان کے کئی مشہور لوگوں کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے جن میں جنرل ضیاء الحق کا نام بھی آتا ہے۔اس کے علاوہ اندر کمار گجرال سابق وزیرِ اعظم بھارت، جناب فتح علی خان، چودھری محمد علی، پاکستان کے سابق وزیرِ اعظم اور وسیم سجاد،سابق صدر پاکستان کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔اس شہر نے بہت سے حکمران، نامور کھلاڑی،مشہور ادیب اور فلم انڈسٹری کے قابلِ ذکر اداکار بھی پیدا

کیے ہیں۔ اب تک میں نے جتنے بھی شہروں سے تعلق رکھنے والے اہم لوگوں کی تاریخ پڑھی ہے ان میں اتنی بڑی تعداد میں اتنے اہم لوگوں کا کسی ایک شہر سے تعلق ہونا ایک منفرد بات ہے۔

آج ہم اس شہر کے پاس سے گزر رہے تھے اور اس بات کا افسوس تھا کہ ہم شہر کو قریب سے نہ دیکھ سکے۔ زندگی رہی اور حالات نارمل ہوئے تو ان شاءاللہ ضرور اس جالندھر کو قریب سے دیکھوں گا جہاں سے تعلق رکھنے والے حفیظ جالندھری نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا تھا جسے ہم بڑے ادب سے کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں۔ یہاں پر ہمارا پڑاؤ نہیں تھا اس لیے ہم اسے دور سے دیکھتے ہوئے آگے لدھیانہ کی طرف چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو لدھیانہ کی تاریخ سے آگاہ کروں، میں اپنے بائیں طرف موجود ایک بہت ہی مشہور شہر ہشیار پور کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

❁❁❁

ہشیار پور

ہشیار خان کے نام کا ایک صدیوں پرانا قصبہ

ہم جالندھر شہر سے جیسے ہی باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ہمارے بائیں طرف ایک سڑک ہشیار پور کی طرف جا رہی تھی۔ میرے لیے ہمیشہ ہی ہشیار پور کا نام ایک کشش رکھتا تھا۔اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، ایک یہ بھی تھی کہ ہمارے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی کافی لوگوں کا تعلق ہشیار پور سے ہے۔ کچھ کتابوں میں اسے ہوشیار پور بھی لکھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک، صحیح ہشیار پور ہے۔ پاکستان کی سرکاری اردو لغت میں بھی ہشیار ہی لکھا گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہشیار پور نام سے ایک فرنیچر کی دکان بھی تھی۔ عام طور پر لوگ یہ کہتے تھے کہ ہشیار پور کے لوگ بہت ہشیار ہوتے ہیں۔ ہشیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ ہشیار ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن عام طور پر یہ لفظ منفی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔اب ایسا کچھ نہیں ہے،اب سب ہی ہشیار ہو گئے ہیں۔ پنجابی زبان میں لفظ کو مختصر کرنے کی وجہ سے اسے ہشیار پور کہا جاتا ہے۔میرے خیال میں اردو میں یہ لفظ ہوشیار پور ہی ہے۔ہم پنجابی میں لاہور کو بھی ''لہور'' ہی بولتے ہیں۔ میری سوچ کے مطابق پنجابی زبان عمل (ایکشن) کی زبان ہے، اس لیے اس میں الفاظ کو مکمل طور پر اس کے زیر وزبر، الف اور واؤ کے ساتھ ادا کرنے کا رواج نہیں ہے۔ مثال کے طور پر: گھر کی بجائے ''کر''، اسٹیشن کی بجائے ''ٹیشن''، آم کی بجائے ''ام'' وغیرہ وغیرہ۔

ہشیار پور بارے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا پر بھی ایک مضمون پڑھنے کو ملا اور اس

کے ساتھ ساتھ اس ضلع کی اپنی ویب سائٹ سے بھی استفادہ کیا۔اگر آپ نقشے میں ہشیار پور کو دیکھیں تو آپ جان پائیں گے کہ ہشیار پور، جالندھر سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر شمال مشرق کی طرف پہاڑی علاقے کے قریب واقع ہے۔اس کی شمالی سرحد ہماچل پردیش سے ملتی ہے اور یہ سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے مقابلے میں لاہور سطح سمندر سے چھ سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔اسی وجہ سے اس شہر کے آس پاس کئی پہاڑیاں بھی پائی جاتی ہیں اور یہاں سبزہ بھی کافی زیادہ ہے۔ یہاں کا موسم نسبتاً معتدل ہے۔آپ اس کا موازنہ ہمارے سیالکوٹ یا میر پور سے کر سکتے ہیں جو پہاڑی علاقوں کے قریب ہیں اور اس وجہ سے وہاں موسم اتنا گرم نہیں ہوتا۔ یہاں پر کئی مشہور مقامات ہیں جن میں قابل ذکر شیش محل اور وائلڈ لائف پارک کے علاوہ کئی گردوارے اور مندر بھی ہیں۔معتدل موسم ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں پھل اور سبزیوں کی کثرت ہوتی ہے اور یہ اس کی وجہ شہرت بھی ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس شہر میں بہت سے ہندوؤں کے گورو بھی آئے جس کی وجہ سے اسے سنتوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ یہ علاقہ زمانہ قدیم میں وادی سندھ کی تہذیب کا حصہ بھی رہا ہے۔ یہاں پر اس دور کی بے شمار چیزیں بھی ملتی ہیں۔جس سے میرے اس تاثر کی تائید ہوتی ہے کہ شمالی ہندوستان کا ایک بڑا علاقہ وادی سندھ کی تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ ہشیار پور کی تاریخ جانتے ہوئے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس شہر میں پانڈوؤں کے دور کی عمارتیں بھی ملتی ہیں۔مشہور چینی سیاح ہیون سنگ نے بھی اس شہر کا ذکر کیا ہے۔مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں پر چندر بنسی راجپوت خاندان کی حکمرانی تھی وہ لوگ ایک طویل مدت تک افغانوں کے ہندوستان پر حملوں کا مقابلہ کرتے رہے اور بالآخر شکست ان کا مقدر بنی۔

یہ چندر بنسی کون تھے؟

عام طور پر چندر بنسی (Chandravanshi) کو چاند کی نسل یا چاندری سلسلہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک قدیم ہندو ویدک و پُرانک روایت ہے جس کے مطابق کچھ راجپوت اور ہندو حکمران خاندان اپنا نسب چندر ونس (Lunar Dynasty) سے جوڑتے ہیں۔

ہندو دھرم میں دو بڑی نسلی شاخیں ہیں:

سوریہ ونسی (Surya Vanshi) یعنی سورج کی نسل۔

چندرونسی (Chandra Vanshi) یعنی چاند کی نسل۔

کئی قدیم ہندوستانی خاندانوں نے اپنے آپ کو چندربنسی کہا تاکہ اپنے نسب کو چاندری سلسلۂ راجاؤں سے جوڑ سکیں۔ اسی طرح برصغیر میں کئی راجپوت قبیلے اور ریاستیں خود کو چندربنسی کہتی تھیں۔

تاریخ میں یادو، جادو، جٹ، راٹھور، چوہان، گہروال وغیرہ کو بھی کہیں نہ کہیں چندربنسی یا سوریہ بنسی کے ساتھ منسلک کرنے کی کوشش کی گئی۔

ہشیار پور میں کئی جگہ پر کھدائی کی گئی۔ شوالک پہاڑی کے پاس کھدائی کے دوران ایسی چیزیں بھی ملی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پتھر کے زمانے سے یہاں پر لوگ آباد تھے۔ اس علاقے میں موجود رحماپورہ نامی قصبے سے بہت زیادہ ایسی چیزیں ملی ہیں۔ ان سب باتوں سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کے اثرات بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مہابھارت میں بھی اس شہر کا ذکر ملتا ہے۔

اس علاقے میں ایک دسوا نامی گاؤں بھی موجود ہے۔ فیصل آباد میں بھی سمندری روڈ پر دسوا نامی ایک گاؤں موجود ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہشیار پور کے دسواں گاؤں سے آئے اور انھوں نے اپنے آبائی گاؤں کے نام پر اس گاؤں کا نام بھی دسوا ہی رکھا۔ جب انگریزوں نے اس علاقے کو آباد کیا گیا تو آنے والے لوگوں نے اس گاؤں کا نام دسوا رکھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ فیصل آباد میں بہت سے دیہاتوں کے نام لوگوں نے ہندوستان میں اپنے دیہاتوں کے نام پر رکھے ہوئے ہیں جن میں دسوا بھی شامل ہے۔

اس علاقے میں بھی مسلمانوں اور مقامی حکمرانوں کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد رنجیت سنگھ نے یہ علاقہ فتح کیا اور اسے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ ہشیار پور کے ساتھ ہی ایک بڑا قصبہ موجود ہے جس کا نام بجواڑہ ہے۔ اس نام کا ایک گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پاس

بھی ہے۔ یہ لوگ شاید اسی علاقہ سے آئے ہوں گے۔ مجھے یاد ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں غلہ منڈی کے پاس ایک پیر صاحب رہتے تھے جنھیں ہم بجواڑے والے پیر کہتے تھے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصبہ کوہ سلیمان، ڈیرہ غازی خان سے آنے والے پٹھانوں نے آباد کیا تھا۔ ان کے یہاں آنے کا مقصد پہاڑی علاقوں میں قائم ہندو ریاستوں کا راستہ روکنا تھا تاکہ انھیں پنجاب پر حملوں سے روکا جاسکے جہاں مسلمان ریاستیں آباد تھیں۔ اسی شہر کے ایک پٹھان ہشیار خان کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا۔ زمانہ قدیم میں اس کے کئی اور نام بھی تھے لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد اس شہر کو ہشیار پور کہا جانے لگا۔

ہشیار پور کی شرح خواندگی اس علاقے میں سب سے زیادہ ہے جو تقریباً نوے فیصد ہے۔ ایک اور بات جو مجھے بہت مختلف نظر آئی وہ یہ کہ ہشیار پور میں عورتوں کی تعداد مردوں کے برابر ہے جبکہ پنجاب اور ہریانہ میں خواتین کی تعداد مردوں کی نسبت کافی کم ہے۔ ہشیار پور میں ریلوے کا نظام بیسویں صدی کے آغاز میں قائم ہوا اور یہاں کا موجودہ ریلوے سٹیشن 1905ء میں بنایا گیا تھا۔

پنجاب کے بٹوارے سے قبل اس شہر میں مسلمان آبادی کا تقریباً تیسرا حصہ تھے- جواب ایک فیصد سے بھی کم ہیں اور یہاں ساٹھ فیصد سے زائد ہندو اور تیس فیصد سے زائد سکھوں کی آبادی ہے۔ پنجاب کے بٹوارے کے موقع پر ظلم و ستم کا ایک بازار گرم ہوا۔ کچھ مارے گئے باقی جو جان بچا کر بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے۔ اب اس شہر میں ایک بہت بڑی تعداد ان ہندوؤں اور سکھوں کی ہے جو پاکستان سے لٹ پٹ کر یہاں آئے تھے۔

روئے تسی وی او، روئے اسیں وی آں۔۔۔

ایسا دونوں طرف ہی ہوا۔۔۔ کیوں ہوا۔۔۔ کس نے کیا۔۔۔ اس کے جواب کی تلاش رہے گی۔۔

اس شہر سے تعلق رکھنے والے چند مشہور لوگوں کے نام کچھ یوں ہیں۔

گیانی ذیل سنگھ بھارت کے صدر، من موہن سنگھ بھارت کے وزیر اعظم، انھوں نے اپنی تعلیم اسی شہر میں مکمل کی، جگجیت سنگھ چوہان خالصہ راج پارٹی کے بانی، پاکستان کرکٹ ٹیم کے مشہور

کھلاڑی انتخاب عالم مشہور گائیک، استاد امانت علی، تیسرا نشان حیدر حاصل کرنے والے میجر طفیل شہید۔ دو ایسی شخصیات جن کے نام اور کام سے ہر کوئی واقف ہے، حبیب جالب اور منیر نیازی کی پیدائش اور گزر بسر بھی اسی شہر کی ہے۔ پیارہ سنگھ گل کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا جنھوں نے cosmic ray nuclear physics کی بنیاد رکھی تھی۔

پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ: جو 1882ء میں بنائی گئی

انگریزوں نے 1882ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی بنیاد رکھی۔ اس سے قبل انھوں نے ہندوستان میں مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں تین یونیورسٹیاں قائم کی تھیں اور یہ ان کی چوتھی یونیورسیٹی تھی۔ جب پنجاب کا بٹوارا ہوا تو اسے بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ میرے علم کے مطابق اس وقت موجودہ پاکستان اور بھارتی پنجاب میں صرف یہی ایک یونیورسٹی تھی۔ پنجاب کے بٹوارے کے بعد پنجاب بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایک کثیر تعداد میں ہندو اور سکھ طالب علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اسی طرح اساتذہ میں بھی ایک واضح تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی شامل تھی۔ پنجاب کا بٹوارا ہوا تو وہ لوگ بھارتی پنجاب چلے گئے۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا۔

ہر دیو سنگھ ورک کے مطابق جب طلبہ اور اساتذہ کی کثیر تعداد بھارتی پنجاب چلی گئی تو ان کی تعلیم کا مسئلہ درپیش ہوا کیونکہ پہلے سے اس علاقے میں کوئی یونیورسٹی بھی موجود نہیں تھی۔ [1] یہ بھی یاد رہے کہ متحدہ پنجاب کا صدر مقام لاہور تھا۔ تقسیم کے بعد بھارتی پنجاب کا عارضی صدر مقام شملہ بنا جسے بعد میں چندی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ ایسی صورت حال میں بھارت نے فیصلہ کیا کہ پنجاب یونیورسٹی کے نام سے ہی شملہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ کچھ سال تک اس کا ایک عارضی کیمپس شملہ میں کام کرتا رہا اور بعد میں اسے چندی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ بھارتی پنجاب کے لوگوں

---

[1] *Birth of Panjab University Chandigarh in 1947 and Story of its Birth* Pangs December 2021 DOI:10.13140/RG.2.2.26238.10563

کا یہ کہنا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ، اسی پنجاب یونیورسٹی کا ایک حصہ ہے جو 1882ء میں بنائی گئی تھی۔ (جیسے پنجاب تقسیم ہوا ویسے ہی پنجاب یونیورسٹی بھی تقسیم ہوئی۔)

میرے علم کے مطابق ایسی تقسیم شاید ہی کہیں ہوئی ہو۔ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ کی ویب سائٹ پر اس کی بنیاد کی تاریخ 1882ء ہی لکھی ہوئی ہے جبکہ اس وقت چندی گڑھ کا کوئی وجود بھی نہیں تھا۔ اس یونیورسٹی کا موٹو ہے:

Lead us into the light from darkness

پنجاب یونیورسٹی ہشیار پور کے کیمپس کے لیے ڈاکٹر لاجپت رائے (جو اس وقت امریکہ میں رہتے اور ان کا آبائی تعلق اسی علاقے سے ہے) نے جگہ خرید کر دی۔

ابھی سرہند دور تھا!

اب تقریباً دو پہر کے بارہ بج رہے تھے اور ہمیں سرہند پہنچنے کے لیے ابھی بھی ایک گھنٹہ درکار تھا اگر بھوک اور تھکاوٹ کا ملاپ ہو جائے اور دیس بھی پرایا ہو، جہاں آپ پہلی مرتبہ جا رہے ہوں، تو صورت حال کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ نوجوان بچے ہمارے ساتھ تھے جو عام طور پر اس طرح کے ماحول کے عادی بھی نہیں تھے، لیکن سفر تو بہر حال سفر ہی ہوتا ہے اس کے لیے کچھ نہ کچھ تکلیف تو ضرور برداشت کرنی پڑتی ہے۔ جالندھر سے نکلنے کے بعد ہمارے راستے میں پہلا قصبہ پھلور آیا۔ اس نام کا ایک قصبہ رجانہ اور سمندری کے درمیان بھی واقع ہے۔ جو پھلور سے آنے والے لوگوں نے ہی بسایا ہے۔ اس کے بعد وہ شہر آرہا تھا جسے دیکھنے کی چاہت اور تمنا بچپن سے ہی میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، یعنی لدھیانہ۔

ایسا ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرے پیر و مرشد مولانا عبدالحمید لدھیانوی (جو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہتے تھے) کا تعلق لدھیانہ سے تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں ایک بڑی تعداد لدھیانہ سے تعلق رکھنے والے علما کرام کی بھی موجود ہے۔ یہ وہ شہر ہے جسے ایک مسلمان نے آباد کیا تھا۔ کبھی اس شہر میں ساٹھ فیصد سے زائد مسلمان آباد تھے جو آج دو فیصد بھی نہیں ہیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ فیصل آباد، جو پاکستان کا ٹیکسٹائل کے لحاظ سے دوسرا بڑا شہر ہے،

اسے اس مرتبے تک پہنچانے میں ان لوگوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو پنجاب کے بٹوارے کے وقت لدھیانہ سے فیصل آباد آئے تھے۔ اجاڑے کے وقت فیصل آباد سے ایک بہت بڑی تعداد میں ہندو اور سکھ مشرقی پنجاب چلے گئے اس وقت حکمرانوں نے یہ طے کیا تھا کہ جہاں سے لوگ ایک ملک سے جائیں گے تو وہیں پر دوسرے ملک سے آنے والے لوگوں کو بسایا جائے گا اور ان کی بچی ہوئی جائیداد بھی انھیں دی جائے گی۔ اس لیے فیصل آباد میں ٹیکسٹائل سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت لدھیانہ کے ارد گرد سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ وہ لوگ لدھیانہ میں بھی ٹیکسٹائل کا کام ہی کرتے تھے۔ لدھیانہ ایک طویل عرصے سے بھارت بھر میں ہوزری کی مصنوعات کے لیے بے حد مشہور ہے۔ ان دو وجوہات کی وجہ سے مجھے لدھیانہ دیکھنے میں بے حد دلچسپی تھی۔ ہمارا لدھیانہ میں رکنے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن جس چیز سے آپ کو بہت محبت ہو اسے دور سے دیکھنے سے ہی آپ کو راحت مل سکتی ہے اور ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہونے جا رہا تھا۔

ہمارے راستے میں گورائیہ نام کا ایک قصبہ بھی تھا۔ گورایا جاٹوں کی ایک گوت ہے، ہوسکتا ہے کہ گورایا جاٹ یہاں رہتے ہوں۔ سیالکوٹ، نارووال میں بڑی تعداد میں گورایا جاٹ رہتے ہیں۔ شاید وہ لوگ بھی یہیں سے ہجرت کر کے پاکستان گئے ہوں۔ ہمارے دائیں طرف نکودر، موگا اور شاہکوٹ جیسے قصبے تھے۔ ان سب کا تعارف تو بہت مشکل ہے لیکن میں لدھیانہ پہنچنے سے پہلے نکودر اور پھلور کا تعارف ضرور کروانا چاہوں گا۔

نکودر: جو کبھی نیکی کا در تھا، جسے ایرانی مسلمانوں نے آباد کیا: جی ٹی روڈ سے دائیں طرف تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر نکودر نامی کا ایک قصبہ موجود ہے۔ جسے ایرانی مسلمانوں نے آباد کیا تھا اور اس کا نام ''نیکی کا در'' یعنی نیکی کا دروازہ رکھا گیا تھا جو بعد میں نکودر بن گیا۔ ضلع جہلم میں دینہ کے پاس بھی ایک قصبے کا نام نکودر ہے۔ یہ شہر سلاطین دہلی کے وقت سے آباد ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں تین بڑی قومیں آباد ہیں؛ ارآئیں، جاٹ، اور کمبوج، انھیں کمبوہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان راجپوتوں کے بہت سے قبائل بھی یہاں آباد ہیں۔ کسی دور میں یہاں راجپوتوں کے ایک قبیلے خانزادہ کی حکومت تھی وہ خاندان، جہانگیر کے دربار سے تعلق رکھتا

تھا۔ جہانگیر نے انھیں یہاں پر ایک بڑی جاگیر بھی دے رکھی تھی۔ بعد ازاں خانزادہ خاندان کو سکھوں نے شکست دی اور 1816ء میں یہ شہر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ریاست کا حصہ بن گیا۔ اس شہر میں دو اہم مقبرے ہیں جنھیں استاد شاگرد کا مقبرہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے دو مقبرے سرہند میں بھی ہیں۔ ان میں سے استاد کے مقبرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شاہجہاں کا استاد تھا۔ ان مقبروں کی عمارات حیران کن ہیں۔ اتنی خوب صورت عمارتیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ نکودر بارے بشیر اے مجاہد نے ایک کتاب بھی لکھی ہے، جس کا عنوان ہے سفر زندگی کا، آپ بیتی۔

میں اس بات کی کھوج میں لگا رہا کہ وہ کس علم کے استاد تھے۔ شاہجہاں نے ان سے کیا سیکھا؟ لیکن کچھ خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ موسیقی کے استاد تھے۔ ان مقبروں کی عمارات دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تعمیرات کے ماہر تھے۔ شاہجہاں کی تعمیرات کے پیچھے ان مزارات میں لیٹے استاد شاگرد کی سوچ کی کارفرما تھی، یہ بات کہاں تک درست ہے، معلوم نہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر بابا مراد شاہ کا بھی ایک مقبرہ ہے جس پر ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے بلکہ آزادیِ ہند کے بعد 1908ء میں ان کا یہ مزار بنایا گیا۔ میں نے ان کے مزار سے متعلق کئی ویڈیوز بھی دیکھی ہیں۔ پنجابی کے مشہور گلوکار گرداس مان بھی انھی کے شاگرد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر سائیں لاڈھی کا مزار بھی ہے۔ پنجاب کے بٹوارے سے قبل اس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی ساٹھ فیصد سے زائد تھی، جواب دو فیصد سے بھی کم ہے۔

دکھنی، یعنی جنوبی سرائے

مغلیہ سلطنت سے قبل اور اس کے بعد بھی دہلی اور لاہور کے درمیان حکمرانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور انھوں نے اپنی سہولت اور آرام کے لیے باغات اور عمارتیں بنائیں، جنھیں ہم سرائے کہتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک باغ کا ذکر (جس کا نام خاص باغ ہے) میں نے سرہند کا ذکر کرتے ہوئے کیا ہے۔ جالندھر کے بعد جی ٹی روڈ پر اسی طرح کی ایک عمارت جہانگیر پنڈ ''گاؤں'' کے

پاس بھی موجود ہے۔اس گاؤں کا نام جہانگیر بادشاہ کے نام پر رکھا گیا۔مغل حکمرانوں نے یہاں پر ایک سرائے بنائی گئی جسے دکھنی، یعنی جنوبی سرائے کہتے ہیں۔اسے جہانگیر کا قلعہ بھی کہا جاتا ہے۔

پرانے وقتوں میں مشرق مغرب شمال جنوب کو پُورب، پچھّم، اتر اور دکھن کا نام دیا جاتا تھا۔ پورب مشرق پچھّم مغرب، اتر شمال اور دکھن جنوب کو کہتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دادا (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) بھی دکھن کا لفظ ہی استعمال کرتے تھے۔کئی شاعروں نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔میں کچھ شاعروں کے اشعار یہاں پر نقل کر رہا ہوں جن میں یہ لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔

در ملک ہند، پورب و پچھّم ہے سوگ میں
سب سے ادھک عزا ہے بہ دکھن حسین کا
(مرزا)

رات نے خیمے ڈیرے ڈالے ہولے ہولے کہاں کہاں
پورب پچھّم اتر دکھن پھیلا کالا بھبھوت دھواں
(ابن انشاء)

میں بات دکھنی سرائے کی کر رہا تھا کہ بیچ میں دادا جان کی یاد آئی، جو ایک فطری بات تھی۔ میں اپنی زندگی میں والد صاحب کے ساتھ ساتھ اپنے دادا جی سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ دکھنی سرائے، جس کی میں نے بہت سی ویڈیو دیکھی ہیں، بہت ہی خوب صورت تھی۔اس کی وجہ اس میں رہائشی کمروں اور مسجد کا اہتمام ہے۔ اس میں باغات بھی ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اب تک اس کی اچھی دیکھ بھال بھی کی جارہی ہے اور اب یہ ایک اچھا تفریحی مقام بھی ہے۔ دکھنی سرائے، (جسے جہانگیر کا قلعہ بھی کہتے ہیں) 1640ء میں علی مردان خان نے تعمیر کروائی تھی جو شاہجہاں کا گورنر تھا۔ اس وقت شاہجہاں کی حکومت تھی اور جہانگیر کی وفات ہو چکی تھی۔اس کے بیٹے شاہ جہاں نے اپنے والد کے نام پر اس گاؤں کو آباد بھی کیا اور یہاں سرائے بھی بنوائی جو قلعہ تو نہیں ہے لیکن لوگ اسے قلعہ بھی کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ دلی اور لاہور کے درمیان سات مختلف مقامات پر سرائیں بنائی گئی تھیں۔ یہ سرائے مغلیہ طرز تعمیر کی ایک بہت ہی خوب صورت مثال ہے۔اس کے چاروں طرف اونچی دیوار اور تین منزلہ دو بڑے گیٹ بھی ہیں۔جس گیٹ کا رخ دہلی کی طرف تھا، اسے دہلی گیٹ کا نام دیا گیا جبکہ دوسرے کو لاہوری گیٹ کا نام دیا گیا کیونکہ اس کا رخ لاہور کی طرف ہے۔اس میں تقریباً ایک سو چوبیس کمرے، بہت بڑی مسجد اور باغ ہیں۔اس عمارت کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اس علاقے کی ایک بہت ہی خوب صورت عمارت ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی وڈیوز بھی بنائی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے واقعی یہ جگہ قابلِ دید ہے۔

پھلور

رنجیت سنگھ کا قلعہ، ایک زندہ صوفی کا دفن

پھلور لدھیانہ سے پندرہ کلومیٹر پہلے موجود ایک بڑا قصبہ ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی قصبہ ہے۔ جی ٹی روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے زمانہ قدیم سے لوگ لاہور اور دہلی کے درمیان اسی راستے سے سفر کرتے تھے۔ شاہجہان نے یہاں پر بھی ایک شاہی سرائے بنائی تھی۔ جسے رنجیت سنگھ نے انیسویں صدی کے شروع میں ایک قلعے میں بدل دیا۔ اسے دیوان محکم چند نے فرانسیسی اوراٹلی کے ماہرین کی مدد سے تیار کیا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت رنجیت سنگھ کی فوج میں فرانسیسی اور اٹالین لوگ بھی ملازمت کے لیے آتے تھے۔ یقینی طور پر وہ یہاں پر قبضے کرنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی فوج نہیں تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ملازم تھے اور اس کی خاطر جنگ بھی لڑتے تھے۔ یقیناً مارے بھی جاتے ہوں گے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آج ہم یورپ میں ملازمت کے لیے جاتے ہیں۔

سکھوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں نے اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے یہاں پر ایک پولیس ٹریننگ اکیڈمی بھی بنائی تھی۔ بھارتی حکومت نے چند دہائیاں قبل اس کا نام مہاراجہ رنجیت سنگھ پولیس اکیڈمی رکھ دیا ہے۔ یہ ہندوستان کی سب سے قدیم پولیس اکیڈمی ہے۔ یاد رہے کہ انگریزوں نے 1860ء میں ہندوستان بھر میں پولیس ایکٹ لاگو کیا تھا۔ اس شہر کے نام کے بارے میں مشہور عام روایت کے

مطابق ایک مقامی جٹ پھول کے نام پر اس کا نام پھول نگر رکھا گیا جو بعد میں پھول نگر سے پھلور ہو گیا۔ یہاں پر بنائی گئی سرائے، مغل حکمرانوں کے ڈاک کے انتظام کا ایک حصہ تھی۔[1]

میں نے پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے مطابق ستلج کے مغرب کی طرف کے تمام علاقہ جات رنجیت سنگھ کے پاس تھے جبکہ ستلج کے مشرقی علاقے انگریزوں کے پاس تھے۔ اس لحاظ سے پھلور انگریزوں اور سکھوں کی ریاست کے درمیان ایک سرحدی شہر تھا۔ اسی معاہدے کے تحت انگریزوں نے لدھیانہ میں فوجی چھاؤنی بھی بنائی تھی۔ ستلج دریا لدھیانہ اور پھلور کے درمیان بہتا ہے۔ ایک طویل عرصے تک پہاڑی علاقوں سے لکڑی کاٹ کر ستلج دریا میں ڈال دی جاتی تھی اور اسے پھلور سے نکال لیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے پھلور لکڑی کی ایک بڑی مارکیٹ بھی تھا۔ تحصیل پھلور کی آبادی ایک لاکھ سے بھی کم ہے جس میں آباد مسلمان آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں، ہیں جو کبھی نصف حصہ ہوا کرتے تھے۔

ہندوؤں کی ایک بہت مشہور نظم "جئے جگ دیش" سے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاردا رام پھلوری یہیں بیٹھ کر لکھتا تھا۔ پھلور میں پیر بابا عبداللہ شاہ غازی کا مزار بھی ہے۔ جو بہت ہی نیک اور خداترس تھے۔ اب تک لوگ ان کا نام عزت سے لیتے ہیں۔

اس قلعے کے بارے میں پولیس اکیڈمی کی ویب سائٹ پر ایک بہت ہی عجیب وغریب واقعہ بھی لکھا ہوا ہے۔ جس کے مطابق جب قلعے کی دیوار بنائی جا رہی تھی تو ایک دیوار کو جب بھی بنایا جاتا وہ رات کو گر جاتی تھی۔ رنجیت سنگھ نے اس بارے میں کئی سنتوں سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ ایک ایسا لڑکا جو کسی بیوہ کا اکلوتا بیٹا ہو، اس کی قربانی دی جائے گی تو پھر ہی یہ دیوار سلامت رہ سکتی ہے۔ اس کے بعد کسی بچے کی تلاش شروع کی گئی۔ ایک برہمن بیوہ ہندو عورت کے بچے کو تلاش کیا گیا۔ جب یہ بات اس کی ماں کو پتہ چلی کہ اس کے بچے کی قربانی کی جا رہی ہے تو اس نے

---

[1] *Punjab Tourism*. Tourism in Punjab, India, Government of India. (http://pp.pragyaware.com)

بہت چیخ و پکار کی لیکن اسے کوئی سننے والا نہیں تھا۔ اس وقت عبداللہ شاہ زندہ تھے۔ انھوں نے رنجیت سنگھ سے کہا کہ اگر اسے قربان کر دیا جائے اور بچے کو چھوڑ دیا جائے تو بھی دیوار قائم رہ سکتی ہے۔ رنجیت سنگھ نے بچے کو چھوڑ دیا اور عبداللہ شاہ کو زندہ دیوار میں چن دیا گیا۔ یہ جگہ قلعے کی شمال مغربی دیوار کے پاس ہے۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد یہاں پر ایک مزار بنا دیا گیا۔ اس مزار پر ہندو، سکھ اور مسلمان بڑی تعداد میں آتے ہیں اور اکیڈمی میں تربیت حاصل کرنے والے پولیس والے بھی ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اس واقعے پر یقین کرنا تو مشکل ہے لیکن اس کی شہادت ایک سرکاری ذرائع سے حاصل ہو رہی ہے اس لیے تسلیم کرنا بنتا ہے۔ اس طرح ایک مسلمان صوفی نے اپنی جان دے کر ایک بیوہ کے اکلوتے بچے کی جان بچائی۔۔۔ یہ بھی تصویر کا ایک رخ ہے!

اس اکیڈمی سے تربیت حاصل کرنے والے مقامی لوگ انگریزوں کے دست راست ہوتے تھے۔ اس کا بنیادی مقصد شمالی اور مغربی ہندوستان میں پولیس کے نظام کے لیے افرادی قوت مہیا کرنا تھا۔ چند سال قبل پھلوری کے نام سے ایک پنجابی فلم بھی بنائی گئی۔ جو بھارتی پنجاب میں خاصی مقبول ہوئی۔

❁❁❁

لدھیانہ

جو دراصل لودھی آنہ تھا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے

دریائے ستلج مہاراجہ رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان ایک طے شدہ سرحد کا کام کرتا ہے۔ ستلج کے پل کی دوسری طرف وہ شہر تھا جسے دیکھنے کی مجھے بے حد خواہش تھی۔ جب میں اس شہر سے گزرا تو میرے پیرومرشد مفتی عبدالحمید لدھیانوی کی شخصیت دل ودماغ پر چھا گئی۔ انھوں نے اپنی تعلیم دیوبند سے مکمل کی اور آزادیِ ہند کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ آپ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ایک بہت بڑی دینی، سیاسی اور سماجی شخصیت تھے۔ میں ان کے پاس اکثر جایا کرتا تھا۔ لدھیانہ کی پنجابی زبان ہماری پٹیالہ زبان سے تھوڑی سی مختلف ہے۔ وہ لدھیانوی لہجے کی پنجابی میں باتیں کرتے تھے۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے۔ انھوں نے عمر بھر کمیٹی باغ میں ہی عید کی نماز پڑھائی۔ ان کے بعد ان کے بھائی اب ان کے بڑے بیٹے نماز پڑھاتے ہیں۔ میں اس شہر کو دیکھنا چاہ رہا تھا جہاں مفتی صاحب پیدا ہوئے اور بڑے ہوئے۔ میری وہ خواہش پوری ہوئی گو کہ میں یہاں زیادہ دیر رک نہ سکا۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ آزادیِ ہند سے قبل لدھیانہ میں مسلمانوں کی تعداد دوتہائی ہوا کرتی تھی جہاں آج ایک فیصد بھی مسلمان نہیں ہیں۔ لدھیانہ کا تاریخ میں کیا مقام ہے، اسے کس نے بسایا اور اب بھارت کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں اس کا کتنا عمل دخل ہے؟ اس کا ایک مختصر احوال پیشِ خدمت ہے۔ میں نے لدھیانہ بارے جاننے کی خاطر درج ذیل مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف بر ٹانیکا، 1947ء میں لدھیانہ کے مسلمانوں پر کیا گزری؟
پروفیسر ڈاکٹر قاری محمد طاہر (روزنامہ پاکستان)
لدھیانہ اردو نیوز

(https://www.urdunews.com)

https://placenameswallah.com/ludhiana-pun

اس کے علاوہ مفتی عبدالحمید صاحب سے جو سنا اس سے بھی فائدہ حاصل کیا ہے۔

میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ لدھیانہ کا نام کسی لودھی کے نام پر ہے۔ جب میں نے اس کی تاریخ پڑھی تو پتہ چلا کہ پندرھویں صدی میں سکندر لودھی کے دو جرنیلوں، ایک کا نام یوسف خان اور دوسرے کا نام نہاند خان نے یہاں پر ڈیرے ڈالے تا کہ وہ لودھی سلطنت کو شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں سے بچا سکیں۔ یوسف خان نے دریائے ستلج کے دوسری طرف سلطان پور لودھی کے نام سے ایک شہر کی بنیاد رکھی۔ نہاند خان نے امیر ہوتا نام کے گاؤں کے مقام پر لودھی آنہ کی بنیاد رکھی۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی بھی مفتی صاحب نے لدھیانہ کے نام سے متعلق کوئی بات کی ہو۔ اس لیے اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ یہ لدھیانہ درحقیقت لودھی آنہ تھا جو چلتے چلتے لدھیانہ بن گیا۔

ایک اندازے کے مطابق اس کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے اور یہ ستلج کے پرانے کنارے پر واقع ہے۔ جو اس کے جنوب میں کئی کلومیٹر کے فاصلے پر بہہ رہا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسے لاہور کا قلعہ کبھی دریائے راوی کے کنارے پر تھا اور اب اس سے کئی کلومیٹر دور بہہ رہا ہے۔ لدھیانہ کو بھارت کا مانچسٹر بھی کہا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے فیصل آباد کو پاکستان کا مانچسٹر کہا جاتا ہے۔ یہ دہلی سے تقریباً تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے پرانے شہر کی طرح یہ شہر بھی دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک پرانا اور ایک نیا۔ اس شہر میں ستر فیصد کے قریب ہندو، پچیس فیصد سے زائد سکھ جبکہ صرف دو سے تین فیصد کے درمیان وہ لوگ رہتے ہیں جن کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا، یعنی مسلمان۔ یاد رہے آزادیِ ہند سے قبل اس شہر میں ساٹھ فیصد سے

زائد مسلمان آباد تھے۔ پنجاب کے بٹوارے کی وجہ سے مسلمان یہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیے گئے اور جو بھاگ نہ سکے، انھیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ پاکستان سے نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو اسی شہر میں لا کر بسایا گیا۔

اس شہر کی کئی بڑی خصوصیات ہیں جن میں ایک اہم یہ ہے کہ ایشیا میں یہاں سب سے زیادہ بائیسکل بنائے جاتے ہیں اور ان کی تعداد ایک کروڑ سالانہ سے بھی زیادہ ہے۔ ہندوستان میں بنائے جانے والے ٹریکٹرز کے پرزوں کا تقریباً دو تہائی بھی اسی شہر میں بنایا جاتا ہے۔ اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ جرمنی کو بھی ایسے پرزے برآمد کرتا ہے جو مرسڈیز کاروں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گھریلو سلائی مشین بنانے میں اس شہر کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

اس شہر کی ایک اور پہچان ہوزری کی مصنوعات بھی ہیں۔ خاص طور پر سویٹر کے لیے یہ دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہاں کی ٹی شرٹ بھی بہت مشہور ہے۔ اسی وجہ سے اسے بھارت کا مانچسٹر کہتے ہیں۔ یہ پنجاب کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس علاقے میں کبڈی بڑے شوق سے کھیلی جاتی ہے اور یہاں کا گرونانک سٹیڈیم کبڈی کے میچوں کے لیے بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر کئی مشہور گردوارے اور مندر بھی موجود ہیں۔

اگر آپ کو بھی پنجاب کی تاریخ پڑھنے کا موقع ملا ہو تو آپ نے کھنہ شہر کا نام ضرور پڑھا ہوگا جو لدھیانہ اور سرہند کے درمیان واقع ہے، وہ ہندوستان کی سب سے بڑی اناج کی منڈی ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ یہاں پر ایک بہت ہی مشہور سرائے لشکری خان ہے جو مغلوں کے دور میں بنائی گئی تھی، اسے اورنگ زیب کے ایک گورنر نے بنایا تھا۔ یہ سرائے بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ لدھیانہ کو تعلیم کے میدان میں بھی ایک بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے یہاں پر تین ہزار سے زائد پرائمری اور سیکنڈری سکول موجود ہیں۔ یہ بات بھی کافی اہم ہے کہ لدھیانہ میں دنیا کی بڑی زرعی یونیورسٹیز میں سے ایک پنجاب ایگریکلچر یونیورسٹی بھی موجود ہے۔

پنجاب ایگریکلچر یونیورسٹی 1962ء میں بنائی گئی۔ 1894ء میں انگریزوں نے یہاں پر

میڈیکل کالج بنایا۔ جہاں پہلی مرتبہ عورتوں کے لیے میڈیکل کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اس بات کا سہرا ایک انگریز خاتون Dame Edith Mary Brown کے سر ہے۔ اس شہر سے تعلق رکھنے والی بہت سی نامور سیاسی، ادبی، فلمی شخصیات بھی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

آپ نے بھگت سنگھ کا نام تو سنا ہی ہوگا، اس کا ایک ساتھی سکھ دیو تھا پر اسی شہر سے تعلق رکھتا تھا جسے بھگت سنگھ کے ساتھ ہی پھانسی دی گئی تھی۔ کرتار سنگھ سرابا کا شہر بھی یہی تھا جو ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑتا رہا اور اسے بھی پھانسی کی سزا ہوئی - اُس وقت اس کی عمر انیس سال تھی۔ سنیل متل (جو ایک مشہور بھارتی صنعتکار ہیں) کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔

لدھیانہ کا ذکر آئے تو ساحر لدھیانوی کو کون بھول سکتا ہے۔ ان کی پرورش بھی اسی شہر میں ہوئی۔ مجلس احرار کے بانی مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی بھی اسی شہر کے باسی تھے۔ اگر آپ کا فیصل آباد جانا ہو تو آپ نے صوفی برکت علی، دارالاحسان والے کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ وہ بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ مشہور فلم ایکٹر طالش اور ایک مایہ ناز ادیب سعادت حسن منٹو بھی اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے۔

چنڈی گڑھ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ذاکر حسین روز گارڈن کا ایک مختصر تعارف آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسی طرح کا ایک نہرو روز گارڈن بھی لدھیانہ میں بنایا گیا ہے۔ یہ باغ 1967ء میں بنایا گیا جو 127 ایکڑ پر محیط ہے۔ اس میں سترہ ہزار کے قریب گلاب کے پودے ہیں جو گلاب کی 1,600 اقسام پر مشتمل ہیں۔ اسے بہت ہی خوب صورت طریقے سے سجایا گیا ہے۔ یہ اس وقت لدھیانہ کی سب سے بڑی تفریح گاہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بھی بنایا گیا ہے۔ یہاں پر ہر سال گلاب میلے کے نام سے ایک بہت بڑا ثقافتی شو بھی منعقد کیا جاتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہیں۔

لدھیانہ میں 1999ء میں جی ٹی روڈ کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ وار میوزیم بنایا گیا۔ اس میوزیم میں سکندر کے دور میں ہونے والی جنگوں سے لے کر کارگل کی جنگ تک کی بہت سی چیزیں

رکھی گئی ہیں۔ یہ چار ایکڑ پر پھیلا ہوا ایک بہت بڑا میوزیم ہے۔ جیسے ہی آپ اس میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک بڑا بت ملتا ہے۔ پاکستان کے ساتھ ہونے والی تین بڑی جنگوں 1948,1965، 1971ء کے دور کی چیزیں بھی یہاں پر موجود ہیں۔ یہ بھی لدھیانہ کا ایک مشہور تفریحی مقام ہے۔ لدھیانہ میں لودھیوں کا بنایا ہوا ایک قلعہ بھی موجود ہے جس کا پرانا نام تو لودھی قلعہ تھا لیکن اب لوگ اسے پرانا قلعہ کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ اس کی عمارت کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ

''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی''

یہ پانچ سو سال پرانا قلعہ ہے جسے سکندر لودھی نے بنوایا تھا اور اس کا بنیادی مقصد مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کو روکنا تھا۔ اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ یہیں رہتا تھا۔ اس کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے رنجیت سنگھ نے بھی اسے اپنے پاس رکھا اور بعد میں ایک معاہدے کے تحت جب انگریزوں نے لدھیانہ کو اپنے کنٹرول میں لیا تو یہ قلعہ بھی ان کے پاس چلا گیا۔ یہ ایک تاریخی قلعہ ہے لیکن تازہ اطلاعات کے مطابق اس کی حالت کچھ بہت اچھی نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اب تک نظر انداز کیا جانے والا قلعہ ہی ہے۔

لدھیانہ میں کمال الدین خان کے نام سے منسوب ایک مسجد بھی ہے جسے عام طور پر بلوان والی مسجد کہا جاتا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد جہانگیر کے دور میں بنائی گئی تھی۔ یہاں پر بہت سے کمرے بھی اور ایک طویل برآمدہ بھی موجود ہے۔ اس کی عمارت کا حسن اور خوب صورتی انسان کو مسحور کر دیتی ہیں۔ یہ مغل طرز تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ یہ مسجد ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی یہاں پر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس وجہ سے مسجد میں ایک خاموشی چھائی رہتی ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہی خاموشی اس جگہ کا حسن بھی ہے میں نے حال ہی میں کئی ایسی ویڈیوز دیکھی ہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ لدھیانہ کے قریب ایک گاؤں میں، جہاں کبھی مسلمان بستے تھے، ایک بڑی مسجد تھی۔ مسلمان تو چلے گئے لیکن گاؤں والے، جن میں ہندو اور سکھ دونوں شامل ہیں، اب تک مسجد کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

یہ اللہ کا گھر تھا اسے کون مٹا سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر کی حفاظت کس سے کرواتا ہے، یہ اس کی مرضی ہے۔

لدھیانہ کے سحر سے نکل کر ہم سرہند کی طرف رواں دواں تھے۔ ہم نے بچوں کو تسلی دی کہ ساٹھ کلومیٹر کے بعد سرہند شہر میں ہم کھانے کے لیے رکیں گے۔

جی ٹی روڈ پر لدھیانہ سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر کھنہ شہر موجود ہے جو ایشیا کی سب سے بڑی اناج منڈی ہے۔ ہمارے دائیں طرف مالیر کوٹلہ، احمد نگر اور سنگرور شہر موجود تھے جب کہ ہمارے بائیں طرف ماچھی واڑا اور چمکور صاحب جیسے دو بڑے قصبے آباد تھے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو سرہند میں ایک منفرد ریستوران کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ اپنے اردگرد واقع درج بالا اہم قصبات کا مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

چمکور صاحب: گرو گو بند سنگھ اور وزیر خان کی جنگ

لدھیانہ سے مشرق کی جانب براستہ ماچھی واڑہ، چمکور صاحب کا فاصلہ ساٹھ کلومیٹر ہے۔ میں خواہش کے باوجود اسے نہ دیکھ سکا۔ مگر اس کا ذکر کیے بغیر سانجھے پنجاب کی بات مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک تاریخی قصبہ جس کا سکھ دھرم میں ایک اونچا مقام ہے۔

چمکور صاحب کو شری چمکور صاحب بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ضلع روپ نگر میں واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس شہر میں ستر فیصد کے قریب سکھ، پچیس فیصد سے زائد ہندو اور تقریباً پانچ فیصد مسلمان بھی آباد ہیں۔ یہاں پر دو بڑی لڑائیاں لڑی گئیں تھیں۔ جن میں سے ایک لڑائی کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے جس کی وجہ سے اس شہر کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس جنگ کے بارے میں سکھوں کی تاریخ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

آنند پور، ہشیار پور اور چندی گڑھ کے درمیاں شمال مشرق کی جانب شیوالک پہاڑی علاقے کے قریب ایک اہم مقام ہے۔ آنند پور صاحب ضلع روپ نگر (روپڑ) میں شوالک پہاڑیوں کے دامن اور دریائے ستلج کے قریب واقع ہے۔ یہ شہر سکھ مت کے سب سے مقدس مذہبی

مقامات میں سے شمار ہوتا ہے، کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں آخری دو سکھ گرو، گرو تیغ بہادر اور گرو گو بند سنگھ جی مقیم رہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں گرو گو بند سنگھ نے 1699ء میں ''خالصہ پنتھ'' کی بنیاد رکھی۔ سکھ دھرم میں یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ یہاں پر ہر سال بہار کے موسم میں سکھ برادری کا سب سے بڑا اجتماع اور تہوار منعقد ہوتا ہے، جو روحانی، مذہبی اور ثقافتی لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں پر سکھوں کے دو گرو گرو تیغ بہادر اور گرو گو بند سنگھ نے ایک عرصے تک قیام کیا۔

گرو تیغ بہادر کے قتل کے بعد گرو گو بند سنگھ نے سکھ دھرم کی قیادت سنبھالی اور خالصہ فوج کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ آنند پور کی ایک جنگ کے بعد گرو گو بند سنگھ ایک معاہدے کے تحت اس جگہ کو چھوڑ کر اپنے چالیس ساتھیوں اور دو بچوں کے ساتھ چمکور کے قریب روپ چند کی حویلی میں آ گئے۔ مغلیہ فوج، جس کی قیادت وزیر خان کر رہا تھا، نے اس جگہ کا گھیراؤ کر لیا۔ وہ جنگ کئی دن تک جاری رہی اور چالیس سکھ مارے گئے۔ اس جنگ میں گرو گو بند سنگھ کے دونوں بڑے بیٹے بھی مارے گئے۔ کسی طرح سے گرو گو بند صاحب بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دوران ان کے دو چھوٹے بیٹوں کو وزیر خان نے گرفتار کر لیا جو اس وقت اپنی دادی کے پاس تھے۔ ان دونوں بچوں کو سرہند کے قریب ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ اب اسی جگہ پر گردوارہ فتح گڑھ صاحب بنایا گیا ہے اور اسی وجہ سے اس علاقے کا نام فتح گڑھ صاحب رکھا گیا۔ اس کی تفصیلات اگلے صفحات میں بیان کی جائیں گی۔ اس جنگ میں قتل ہونے والوں کی یاد میں، جنھیں وہ شہید کہتے ہیں، ہر سال کئی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ اسی جنگ کی وجہ سے چمکور قصبے کو شری چمکور صاحب کا نام دیا گیا ہے۔

چمکور صاحب کے پاس ایک مچھلی واڑا نامی قصبہ بھی موجود ہے۔ دریا کے بالکل پاس ہونے کی وجہ سے اسے مچھلی واڑا کہا جاتا ہے، یعنی ایسی جگہ جہاں مچھلی کا کاروبار ہوتا ہے۔ اب اسے عام طور پر ماچھی واڑا کہا جاتا ہے۔ چمکور صاحب سے بچ نکلنے کے بعد گرو گو بند سنگھ نے دو پٹھانوں کی مدد سے مچھلی واڑا کے جنگلات میں پناہ لی۔ جہاں پر انھوں نے پناہ لی وہیں پر گردوارہ بھی بن چکا ہے۔ اس سے پہلے مچھلی واڑا کی ایک اور تاریخ بھی ہے جس کا تعلق ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے جانشینوں سے ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب ہمایوں نے شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد اپنے تخت کی خاطر کوشش کی تو اس کا آغاز پنجاب کی طرف سے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے مغل حکمرانوں کے حمایتی بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ ہمایوں نے دیپالپور، جالندھر اور کئی دیگر علاقے فتح کرنے کے بعد شیر شاہ سوری کے بیٹے سکندر شاہ سوری کی بھیجی ہوئی ایک بڑی فوج (جس کی قیادت نصیب خان اور تاتار خان کر رہے تھے) سے مچھلی واڑا میں جنگ کی۔ وہ ایک فیصلہ کن جنگ تھی جس کے بعد ہمایوں نے سرہند پر قبضہ کیا اور یوں وہ دہلی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

احمد نگر: جو کبھی بہادر نگر تھا

جی ٹی روڈ کے دائیں طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر احمد نگر نامی ایک قصبہ نقشے میں دکھائی دیتا ہے۔ نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی مسلمان کا بسایا ہوا شہر ہوگا۔ اس سے متعلق تو دو بڑی اہم باتوں کا پتہ چلا۔ ایک یہ کہ یہاں پر بیسویں صدی کے آغاز میں جب ریلوے لائن کا آغاز کیا گیا، ریلوے سٹیشن کے لیے جگہ درکار تھی۔ درکوٹ نام کے ایک خاندان نے اس وقت کے مالیر کوٹلہ کے نواب احمد علی خان سے زمین کا تبادلہ کیا اور زمین کا ایک ٹکڑا ریلوے سٹیشن بنانے کے لیے دے دیا۔ اس طرح اس جگہ کا نام، جو پہلے بہادر گڑھ تھا، بدل کر احمد نگر رکھ دیا گیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہمارے ہاں سندھ میں بھی پیش آیا تھا۔ آپ نے نواب شاہ کا نام تو سنا ہوگا۔ سید نواب شاہ علاقے کے ایک بڑے زمیندار تھے۔ جب انگریزوں نے اس علاقے میں ریل کی پٹڑی بچھائی تو انھیں ریلوے سٹیشن کے لیے جگہ کی ضرورت تھی۔ نواب شاہ صاحب نے اس کام کے لیے کئی ایکڑ جگہ دے دی۔ جس سے خوش ہو کر انگریزوں نے ریلوے سٹیشن کا نام نواب شاہ رکھ دیا۔ بعد ازاں وہاں پر ایک بڑا شہر بسا۔ اب شہر کا نام تو نوابشاہ ہے لیکن ضلع کا نام بے نظیر بھٹو کے نام پر بے نظیر آباد رکھ دیا گیا ہے۔

میں یہ سب جان کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو بھی چیز اللہ کے بندوں کے لیے بنائی جاتی ہے وہ تا دیر تک قائم رہتی ہے اور جو اپنی ذات تک محدود رہے وہ انسان کی موت کے

ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔

احمد نگر کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسے ایک منڈی کے طور پر پلان کیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی عمدہ مثال ہے کہ کس طریقے سے آزادیِ ہند سے قبل انگریزوں نے منڈیاں قائم کیں تھیں۔ جب میں نے احمد نگر میں واقع غلہ منڈی کی تفصیل پڑھی تو وہ مجھے ایک فیصد بھی اپنے شہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ کی غلہ منڈی سے مختلف نہیں لگی۔ اسی طرح سے چار دروازے، غلہ منڈی کی چوڑائی میں کم اور زیادہ لمبی دکانیں، منڈی کے چاروں طرف دیوار اور درمیان میں پانی کا بندوبست وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی میں نے پنجاب کے مختلف شہروں میں انگریزوں کی بنائی گئی غلہ منڈیوں کے نقشے دیکھے جو تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ احمد نگر غلہ منڈی، ٹوبہ ٹیک سنگھ غلہ منڈی سے ملتی جلتی نہیں بلکہ ایک جیسی ہی ہے جس سے متعلق جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

مالیر کوٹلہ

جہاں آزادیِ ہند کے وقت کسی مسلمان کا قتل نہیں ہوا، مسلم اکثریت کا شہر: لدھیانہ سے جنوب مشرق کی طرف ایک سڑک مالیر کوٹلہ اور سنگرور کی جانب جاتی ہے۔ مالیر کوٹلہ اسی سڑک پر لدھیانہ سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، جبکہ جی ٹی روڈ سے اس کا فاصلہ قریباً تیس کلومیٹر بنتا ہے۔ اس شہر کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ لاہور میں میرے کئی دوست ہیں جو ریاست مالیر کوٹلہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور میں نے ان سے کئی بار مالیر کوٹلہ کے بارے میں گفتگو بھی کی ہے۔ میرے دوست اویس ناصر خاں بھی انھی میں سے ایک ہیں جو ان دنوں ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر ہیں۔ میں ان کے والد صاحب سے بھی ملا ہوں جنھیں سب ''نواب صاحب'' کے نام سے پکارتے تھے۔

میرے علم کے مطابق، برصغیر کی تقسیم کے دوران ریاست مالیر کوٹلہ ان چند مقامات میں سے ایک تھی جہاں نہ تو فسادات پھوٹے اور نہ ہی خونریزی کا کوئی واقعہ پیش آیا۔ اس غیر معمولی امن وسکون کا سہرا بالخصوص ریاست کے آخری نواب، نواب افتخار علی خان کے حصے میں آتا

ہے، جنھوں نے اُس پُرآشوب دور میں صبر، تدبّر اور رواداری کے ساتھ حالات پر قابو پایا۔ نواب صاحب تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان ہی میں مقیم رہے اور 1982ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا مزار مالیرکوٹلہ میں سرہندی گیٹ کے قریب واقع شاہی قبرستان میں آج بھی ان کی یاد دلاتا ہے۔ اس امن کی ایک اہم بنیاد صوفی بزرگ بابا حیدر شیخ کی درگاہ کو بھی قرار دیا جاتا ہے، جنھوں نے پانچ صدیوں قبل مالیرکوٹلہ کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کی روحانی وابستگی اور تعلیمات نے اس خطے کے سماجی اور مذہبی ماحول کو یگانگت اور بھائی چارے کا گہوارہ بنا دیا۔ ریاست کے حکمران خاندان کے بعض افراد، جو شیخ صدرالدین شیروانی کی اولاد میں سے تھے، قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے لاہور کے ماڈل ٹاؤن، مظفرگڑھ اور خان گڑھ جیسے مقامات میں آباد ہو گئے۔ یوں مالیرکوٹلہ کی تاریخ میں ایک منفرد مثال قائم ہوئی کہ تقسیمِ ہند کے خونریز اور طوفانی حالات میں، جب پورا پنجاب قتل و غارت کی لپیٹ میں تھا، یہ شہر امن، رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کی علامت بن کر سامنے آیا۔

اگرچہ مجھے اس شہر کی سیاحت کا موقع نہیں ملا، لیکن اس کا ذکر ضرور کروں گا۔ اس شہر سے جڑے ایک تاریخی واقعے کی بنیاد پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پنجاب کے بٹوارے کے وقت ہونے والے دس لاکھ سے زائد افراد کا بے رحمانہ قتل اور ڈیڑھ کروڑ افراد کے گھر بار چھوڑنے کا دکھ روکا جا سکتا تھا، اگر اس وقت کے راجے، مہاراجے، فوج، انگریز افسران، ہندو، سکھ اور مسلمان لیڈر اور پولیس اسے روکنے کی سنجیدہ کوشش کرتے۔ لیکن وہ روکنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مقصد ایک ایسا مشرقی پنجاب تھا جو مسلمانوں سے خالی ہو، اور ایک ایسا مغربی پنجاب تھا جو ہندوؤں اور سکھوں کے بغیر ہو۔ ''سانجھا پنجاب'' ان کے سیاسی و نظریاتی مقاصد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے مل کر وہ جرم کیا جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اور میں بھی نہیں کروں گا۔

غلامی سے آزادی کا حصول پنجاب کے بٹوارے کے بغیر بھی ممکن تھا، بشرطیکہ متعلقہ قیادت اس پر آمادہ ہوتی۔ اگر تقسیمِ پنجاب کو ناگزیر سمجھا بھی جائے تو اسے پرامن طریقے سے

نافذ کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح، آبادیوں کی نقل مکانی بھی بغیر قتل و غارت اور خونریزی کے انجام پاتی۔ سوال یہ ہے کہ پھر ایسا کیوں نہ ہو سکا؟ اس سانحے کے اصل ذمہ دار وہی عناصر تھے جو اُس وقت اختیار اور طاقت دونوں رکھتے تھے، لیکن انھوں نے حالات کو سنبھالنے کے بجائے اپنے سیاسی و ذاتی مفادات کی تکمیل کے لیے انتشار کو ہوا دی۔ تاہم اس کے برعکس جہاں کسی حکمران نے دانشمندی اور انصاف سے فیصلہ کیا وہاں صورتِ حال یکسر مختلف رہی۔ مثال کے طور پر، ریاست مالیر کوٹلہ کے راجہ نے قتل و غارت کو روکنے کا فیصلہ کیا اور اس کی سختی سے پابندی کروائی۔ نتیجتاً مالیر کوٹلہ میں کسی ایک مسلمان کا بھی قتل نہ ہوا۔ یہ تھا مالیر کوٹلہ کے راجہ کا وہ قابلِ تعریف کردار جسے تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

یہ اس علاقے کا وہ واحد شہر ہے جہاں آج بھی مسلمانوں کی آبادی ستر فیصد سے زائد ہے۔ اس کے راجا نے بھی مالیر کوٹلہ میں ہی رہنا پسند کیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا جب کہ اس علاقے کے کسی شہر میں بھی مسلمانوں کی آبادی ایک یا دو فیصد سے زائد نہیں ہے۔ کوئی تو ایسی بات ہوگی جس کی وجہ سے اس علاقے میں تقسیم پنجاب کے وقت یہ انوکھا واقعہ پیش آیا۔ میں آپ کے سامنے اس ریاست کی مختصر تاریخ اور ایک تاریخی واقعہ کی تفصیل پیش کرنا چاہتا ہوں، جس سے آپ خود اندازہ کر سکیں گے کہ ایسا کیسے ہوا۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ افغانستان سے آئے ہوئے شیروانی قبیلے کے لوگوں نے سترھویں صدی میں ریاست مالیر کوٹلہ کی بنیاد رکھی جس کا صدر مقام مالیر کوٹلہ تھا اور اس کے حکمران نواب کہلاتے تھے۔ مغل حکمران کسی کو بادشاہ کہلوانے کی اجازت نہیں دیتے تھے انھیں راجا یا نواب کا لقب ہی دیا جاتا تھا۔ سترھویں صدی میں شیر محمد خان بہادر اس ریاست کے پہلے جب کے نواب احمد علی خان آخری نواب تھے۔ تقسیم کے بعد چند ماہ کے لیے نواب افتخار علی خان کو بھی نواب بنایا گیا۔ تاریخی طور پر یہ ریاست 1657ء میں (جب شاہ جہاں کا دور تھا) قائم اور 1948ء کو ختم ہوئی۔ یہ ریاست تقریباً تین سو سال تک قائم رہی۔ یہ ریاست بھی باقی ریاستوں کی طرح انگریزوں کی ایک طفیلی ریاست تھی۔ نوابین نے تو بھارت میں ہی رہنا پسند کیا البتہ ان کے

خاندان کے بہت سے لوگ پاکستان آ گئے۔

مالیرکوٹلہ ریاست بارے مزید جاننے کے لیے درج ذیل ماخذ بے حد مفید ہیں۔

https://www.sikhiwiki.org/index.php/Malerkotla

No One Died in Malerkotla (https://www.wilsonquarterly.com)

The Loneliness of the Model Minority: Muslim Belonging in Malerkotla, Punjab by Anna Bigelow (https://canopyforum.org)

Where peace reigns supreme (https//:www.tribuneindia.com)

مقامی روایت کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ بہلول لودھی پندرھویں صدی کے وسط میں دہلی پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ وہ دہلی پر حملہ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے اس کے قافلے کو کافی نقصان پہنچا۔ اسے دور کسی جھونپڑی میں کسی دیے کی روشنی دکھائی دی اور وہ وہاں چلا گیا۔ اس جھونپڑی میں اسے شیخ صدرالدین ملے۔ شیخ صدردین ایک نیک اور پارسا شخص تھے۔ بہلول لودھی نے ان سے کہا کہ اس کے لیے دعا کریں کہ اسے جنگ میں فتح حاصل ہو۔ دہلی کی اس جنگ میں بہلول لودھی کو فتح حاصل ہوئی۔ اس نے اس خوشی میں اپنی بیٹی کی شادی شیخ صدر الدین سے کر دی اور مالیرکوٹلہ میں ایک بڑی جاگیر بھی عطا کی۔ شیخ صدرالدین کی اولاد میں سے کچھ لوگوں نے ریاست کی ذمہ داری سنبھالی اور کچھ لوگوں نے صدرالدین کے مزار کی۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سترھویں صدی کے وسط میں یہاں کے ایک نواب نے اورنگزیب کی شیر کے شکار کے موقع پر جان بچائی تھی۔ جس سے خوش ہو کر اورنگزیب نے اسے ایک جاگیر دی اور یہاں پر ایک قلعہ بھی بنوایا۔ میں نے اس بات کی کافی کوشش کی کہ معلوم ہو سکے کہ مالیرکوٹلہ کا نام مالیرکوٹلہ کیوں رکھا گیا؟ لیکن مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد یہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کے بٹوارے کے وقت جب پورا پنجاب جل رہا تھا، مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاری تھی، ہر طرف قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا اور ایسے

حالات میں مالیرکوٹلہ میں کسی بھی مسلمان کو خراش تک نہ آئی اور سب لوگ محفوظ رہے یہ انتہائی حیرانی کی بات ہے کہ چاروں طرف آگ لگی ہوا اور ایک شہر، جو ان کے بیچ میں آباد تھا، کیسے محفوظ رہا؟ یقیناً اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہی ہوگی۔ اس لیے اس کا جاننا بھی ضروری ہے۔

میں نے پچھلے صفحات میں آپ سے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ گرو گوبند سنگھ، جن کے نام پر میرے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک محلہ گوبند پورہ آج بھی موجود ہے، کے دو بیٹوں، صاحبزادہ فتح سنگھ اور صاحبزادہ زوروار سنگھ، کو اورنگزیب کے گورنر وزیر خان نے دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وزیر خان نے یہ فیصلہ کیا اس وقت مالیرکوٹلہ کے نواب شیر محمد خان (جو وزیر خان کے رشتہ دار بھی تھے) نے اس کے خلاف بہت احتجاج کیا اور اسے کہا کہ یہ انسانیت اور اسلام کے خلاف ہے لیکن وزیر خان نہ مانا۔ نواب شیر محمد خان وہاں سے چلے گئے اور اس واقعے کے خلاف آواز بلند کی۔ انھوں نے وزیر خان سے یہ بھی کہا کہ بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ یہ بچے میرے حوالے کر دیں میں ان کی پرورش کروں گا۔ نواب نے اورنگزیب عالمگیر کو اس کے بارے میں خط بھی لکھا تھا۔

لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔

سکھوں کی تاریخ میں یہ بھی بات لکھی ہوئی ہے کہ جب گرو کو اس پورے واقعے کا پتہ چلا تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا کسی نے اس واقعے پر احتجاج بھی کیا تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ مالیرکوٹلہ کے نواب نے اس پر سخت احتجاج کیا تھا اور نعرہ حق بلند کیا تھا۔ اس واقعے کو نعرہ حق بلند کرنے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس بات سے خوش ہو کر گرو نے ایک حکم نامہ جاری کیا اور اپنی کرپان بھی نواب مالیرکوٹلہ شیر محمد خان کو دے دی۔

یہی وجہ تھی کہ جب پنجاب کا بٹوارا ہوا تو اس شہر کے سکھوں نے مسلمانوں کی حفاظت کی اور کسی کو بھی ہجرت پر مجبور نہیں کیا نہ کوئی لوٹ مار ہوئی، نہ کوئی اغوا ہوا اور نہ ہی کوئی قتل ہوا۔ اگر کوئی پاکستان آیا تو وہ اپنی مرضی سے ہی آیا۔ چند سال قبل ہونے والی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر میں ستّر فیصد مسلمان بیس فیصد ہندو جبکہ سکھ دس فیصد سکھ آباد ہیں۔ مجھے یہ جان کر بھی خوشی ہوئی

کہ اس شہر میں جہاں پنجابی میں تعلیم دی جاتی ہے، وہیں اردو میں بھی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور وہ یہاں ایک بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔

جس نواب نے گرو گوبند سنگھ کے بچوں کو بچانے کی کوشش کی، اس کے نام پر یہاں نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ سٹڈیز بھی بنایا گیا ہے۔ یہ وہی مالیرکوٹلہ ہے جس کے نواب کا احسان ہمارے خاندان پر بھی ہے۔

میں نے اپنے خاندان کے ایک بزرگ سے ان کے اجڑنے کی داستان سنی اور اس کی وڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر بھی رکھی ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ جب ان کے بڑوں کو شہید کر دیا گیا تو ایک قریبی گاؤں کے سکھ زمیندار نے ہم تمام بچوں کو اکٹھا کر کے اپنے پاس حفاظت سے رکھا۔ بعد ازاں ان تمام بچوں کو مالیرکوٹلہ کے نواب کے حوالے کر دیا۔ جنھوں نے ایک ریل گاڑی کا بندوبست کر کے ان تمام بچوں کو بحفاظت پاکستان پہنچایا۔

ایسا بھی ہوا ہے!

جس کا ذکر کہیں نہیں ملتا، شاید اس کا ذکر ہمارے قومی بیانیے کے خلاف ہوگا۔ تبھی اس طرح کی باتوں کو نہیں بتایا جاتا!

کھنہ

ایشیا میں اناج کی ایک بڑی مارکیٹ: اب ہم سرہند پہنچنے والے تھے اور دن کا ایک بج رہا تھا۔ بچے اکتاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے، میری اور عرفان صاحب کی باتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ سب کا خیال تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں کسی ریستوران میں پہنچنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو انتہائی منفرد ریستوران (جو سرہند میں واقع ہے) کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ راستے میں آنے والے کھنہ نامی قصبے (جو کہ ایشیا میں اناج کی سب سے بڑی مارکیٹ مانی جاتی ہے) کا ایک مختصر احوال بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

اردو اور پنجابی میں بھی خانہ کا لفظ حصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً چار خانے یعنی چار حصے وغیرہ۔ یہ لفظ ذرا بدل کر "کھنہ" پنجابی میں چوتھائی حصے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اب تو یہ لفظ عام

نہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ہم ایک دوسرے سے روٹی مانگتے ہوئے دو ہی لفظ استعمال کرتے تھے، چپہ روٹی، یعنی روٹی کا آٹھواں حصہ اور کھنہ روٹی، جس سے مراد چوتھا حصہ ہوتا تھا۔ اس شہر کا نام بھی اسی طرح سے، یعنی چوتھا حصہ رکھا گیا ہے۔

اس نام کی تفصیل کافی دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے ایک سردار نے اپنی بیٹی دیا کور کی شادی نابھہ کے راجا کے ساتھ کردی۔ بعد ازاں میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے وہ لڑکی اپنے والدین کے گھر واپس آ گئی۔ اس کا والدین کے گھر رہنا معاشرتی طور طریقوں کے خلاف تھا۔ جس پر اس کے والد نے اپنی جائیداد کا چوتھا حصہ اپنی بیٹی کے نام کر دیا اور اس جگہ (جہاں بیٹی نے اپنی رہائش وغیرہ رکھی) کو کھنہ کے نام سے جانا جانے لگا۔

یہ شہر جی ٹی روڈ پر سرہند سے بیس اور لدھیانہ سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ اسی علاقے میں شیر شاہ سوری نے ایک سرائے بھی بنائی تھی۔ اس شہر میں شرح خواندگی نوے فیصد کے قریب ہے اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے جبکہ مسلمان آبادی کا دو فیصد ہیں۔

اس شہر سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ میرے آباؤ اجداد اپنی فصل اسی شہر میں بیچنے کے لیے لاتے تھے۔ ان کے بیلوں کی گھنٹیاں اور ان کے قدموں کی چاپ میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔۔۔۔ میں تصور ہی تصور میں ساٹھ سال پیچھے چلا گیا!

سرہند نہر کے درمیان پانی پر بنایا گیا فلوٹنگ ریستوران

اس پورے سفر میں ہماری بس سے آگے ایک گاڑی میں پولیس کے لوگ سوار ہوتے تھے۔ پولیس والے ہوٹر کا بھی استعمال کرتے تھے اور اکثر جگہوں پر سگنلز بند کروا کر ہماری بس کو گزارا جاتا تھا۔ ایسا تو شاید وہ لوگ انگریزوں کے لیے بھی نہ کرتے ہوں۔ یہ خصوصی سلوک صرف پاکستان سے آنے والی بس کے ساتھ ہی کیا جاتا تھا۔ ایسا ہی سلوک پاکستان میں بھارت سے آنے والی بس کے ساتھ کیا بھی جاتا تھا۔ ہم تقریباً ایک بجے کے بعد سرہند پہنچے۔ اس سے پہلے بھی میں 2000ء میں سرہند آ چکا تھا۔

سرہند کے ساتھ میری جذباتی وابستگی کی وجہ بہت ہی واضح ہے۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ ہماری بس سرہند نہر کے پاس رکی۔ ہم اردگرد کسی ریستوران کی تلاش میں تھے۔ ہماری حیرانی کو بھانپتے ہوئے پولیس کے ایک آفیسر نے کہا کہ یہاں پر ایک بہت ہی منفرد ریستوران ہے جو نہر کے درمیان میں بہت سے خالی ڈرم رکھ کر ان کے اوپر بنایا گیا ہے۔ ہم اسے فلوٹنگ ریستوران کہتے ہیں۔

جب ہم نے اسے دیکھا تو پتہ چلا کہ واقعی سرہند نہر کے اندر بہت سے خالی ڈرم رکھ کر اور ان کے اوپر لکڑی کے تختے جوڑ کر وہ ریستوران بنایا گیا ہے اور نہر کے دونوں طرف سے اس میں جایا جا سکتا ہے۔ پہلی نظر میں وہ سب بہت ہی حیران کن لگا۔ وہ نہر چھ میٹر گہری اور پینتالیس میٹر چوڑی تھی۔ عام طور پر ہماری نہریں دو سے تین میٹر گہری ہوتی ہیں۔ اس کی اتنی گہرائی کی وجہ ہی سے یہاں پر یہ ریستوران بن سکا۔ ہم اس ریستوران میں چلے گئے اور مختلف میزوں پر بیٹھ گئے۔ نیچے پانی چلتا ہوا نظر آ رہا تھا اور پورا فرش ہلکے ہلکے ہچکولے بھی کھا رہا تھا۔ وہ فرش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ کہیں کہیں فرش میں شیشہ بھی لگا ہوا تھا جس سے ہم نیچے بہتے پانی کو دیکھ سکتے تھے۔ بھارت بھر میں یہ اپنی طرز کا پہلا ریستوران تھا۔ اسے دہلی اور امرتسر کے درمیان سفر کرنے والے مسافروں کے لیے ایک اہم جگہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ڈیزائن جیت ملہوترا اور راجندر سنگھ نے تیار کیا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اس نہر پر دو کلومیٹر کے علاقے میں تیس سے زائد فلوٹنگ ہٹ بنائے گئے ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اس ریستوران کی بجلی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسی ریستوران کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بجلی گھر بھی بنایا گیا ہے۔ جہاں پانی کی مدد سے بجلی بنائی جاتی ہے۔

میرے بڑے جب بھی اپنے دیس کی بات کرتے تھے تو وہ سرہند نہر کا ذکر بھی ضرور کرتے تھے۔ میں نے اس سے متعلق جاننا چاہا تو پتہ چلا کہ یہ بھارت کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی نہر ہے جو دریائے ستلج پر روپڑ کے مقام سے نکالی گئی ہے۔ روپڑ ایک قدیم شہر ہے جس کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ لدھیانہ کے پاس آ کر یہ نہر تین حصوں میں تقسیم ہو جاتی

ہے۔جس کا ایک حصہ پٹیالہ کی طرف جاتا ہے اور اسی پر یہ فلوٹنگ ریستوران بنا ہوا ہے۔

اس نہر کو بنانے کے لیے تین ریاستوں نے مل کر وسائل مہیا کیے تھے۔ان میں ریاست پٹیالہ، ریاست جنداور ریاست نابھہ شامل ہیں۔اس نہر کی منصوبہ بندی 1867ء میں کی گئی اور اس کا افتتاح 1882ء میں کیا گیا۔اس کی لمبائی تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر ہے۔فیروز پور کے قریب آ کر یہ نہر دوبارہ دریائے ستلج میں مل جاتی ہے۔دریا سے ملانے کا مقصد یہ ہے کہ سیلاب کی صورت میں فالتو پانی ستلج دریا میں ڈالا جا سکے۔سیلاب سے بچنے کا یہ ایک خوب صورت اور قابلِ عمل طریقہ ہے سرہند نہر کے بارے میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اگر یہ نہ بنائی جاتی تو شاید پنجاب اتنا خوشحال نہ ہوتا۔ یہ مشرقی پنجاب کے ایک بہت بڑے علاقے کو سیراب کرتی ہے۔میرے بزرگ بتاتے تھے کہ اس وقت کھدائی کے لیے کئی علاقوں سے ہزاروں مزدوروں کو لایا گیا تھا جنھوں نے نہر کی کھدائی کی تھی۔اس وقت مشینوں سے کھدائی کی سہولت میسر نہ تھی۔

میں نے اپنے بزرگوں سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا ہماری زمین بھی اسی نہر سے سیراب ہوتی تھی؟ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے علاقے میں زمینی پانی اچھا تھا اسی لیے اس نہر کا پانی ہمیں نہیں دیا گیا۔ہم بیلوں کی مدد سے زمین سے پانی نکالتے تھے۔وہ پانی سرہند سے آگے ان علاقوں تک پہنچایا گیا تھا جہاں زمینی پانی زراعت کے قابل نہیں تھا۔

آج میں اس نہر کو دیکھ رہا تھا جس کا ذکر میرے بزرگ کیا کرتے تھے۔اگر آج وہ ساتھ ہوتے تو بات ہی کچھ اور ہوتی!

کھانا بھی بہت خوب تھا۔ ہمارا یہاں پر قیام تقریباً ایک گھنٹے کا تھا۔اس دوران ایک مقامی تھانے دار صاحب سے میری دوستی ہوگئی۔ان کا نام انسپکٹر مہندر سنگھ تھا۔وہ سرہند ہی کے رہنے والے تھے۔میرا اور ان کی پنجابی زبان کا لہجہ بھی ایک جیسا ہی تھا۔میں نے جب انھیں بتایا کہ میرے آباؤ اجداد کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا تو ہماری دوستی ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔اس سفر کے بعد بھی ان سے خط و کتابت رہی۔اور وہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ان کے پاس بھی وقت تھا اور ہم بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔مجھے ان کی باتوں سے یہ محسوس ہوا

کہ انھیں پڑھنے لکھنے کا بھی شوق ہے اور تاریخ سے بھی اچھی دلچسپی ہے۔ میں نے اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے کچھ بات چیت کی جس کا تعلق سکھوں اور مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کے درمیان تعلقات سے تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے کے بعد اب ہم سرہند سے گزر کر دہلی کی طرف رواں دواں تھے۔اب میں ریاست پٹیالہ کے بارے میں چند دلچسپ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ریاست پٹیالہ

ہندوستان میں سکھوں کی پہلی باقاعدہ ریاست

ریاست پٹیالہ سے اس بناء پر میرا خاندانی تعلق ہے کہ میرے آباؤاجداد اسی ریاست کے رہنے والے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ ریاست پٹیالہ کئی وجوہات سے بھارت بھر میں ایک منفرد شناخت بھی رکھتی تھی۔ آزادیِ ہند کے بعد بھی اس ریاست نے کئی میدانوں میں اپنے آپ کو منوایا۔ اب تک میں نے جتنی بھی ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں بات کی ہے ان میں جس ریاست نے تعلیم اور کھیلوں کے میدان میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے، ان میں پٹیالہ بھی شامل ہے۔ اس علاقے کی تین ریاستیں، جو ساتھ ساتھ موجود تھیں، ریاست پٹیالہ، ریاست جند اور ریاست نابھہ پھولکی ریاستیں بھی کہلاتی تھیں۔ کیونکہ ان سب کے حکمران چودھری پھول سنگھ کی اولاد میں سے تھے۔

اس وقت ہم ریاست پٹیالہ سے گزر رہے تھے۔ پٹیالہ شہر ہمارے دائیں طرف تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم اسے دیکھ تو نہ سکے البتہ اس علاقے سے ضرور گزر رہے تھے جو کبھی ریاست پٹیالہ کا ایک اہم شہر تھا۔ ہمارے کچھ فاصلے پر ریاست نابھہ کا علاقہ بھی موجود تھا۔ ایک مختصر ذکر ریاست پٹیالہ کا جو کبھی میری ریاست بھی تھی۔ جو آج بھی میری پہچان ہے۔ جب لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ آپ کے بڑوں نے کہاں سے ہجرت کی، تو جواب میں کہتا ہوں، ’’ریاست پٹیالہ سے۔‘‘ یہ میرے تعارف کا ایک اہم حصہ ہے۔

ریاست پٹیالہ کی بنیاد 1763ء میں رکھی گئی اور یہ آزادیِ ہند تک قائم رہی- یہ ریاست ان ریاستوں میں سے ایک ہے جنھوں نے سب سے پہلے خود کو بھارت میں ضم کیا۔ یہ ریاست ساڑھے پانچ ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اس کی آبادی پندرہ لاکھ کے قریب تھی۔ اس کے رقبے کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ ضلع لاہور کا رقبہ تقریباً سترہ سو مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا دارالحکومت پٹیالہ شہر تھا جس کی بنیاد اس ریاست کے بابا اعلیٰ سنگھ نے ہی رکھی تھی۔ اس کا دوسرا اہم ترین شہر سرہند تھا جو صدیوں پرانا شہر ہے۔ اس شہر میں مجدد الف ثانیؒ کا مزار بھی ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں عالمگیر کی موت کے بعد پنجاب میں سکھوں اور مغلوں کے درمیان لڑائی جاری تھی اور اسی دوران احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کو شکست دی۔ اس کے بعد اس تمام علاقے پر ایسے افغان حکمرانوں کی بالا دستی قائم ہوگئی جنھیں دہلی کے حکمرانوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ یہ بھی یاد رہے اس دور میں بابا بندہ سنگھ بہادر نے بھی مغلوں کے ساتھ کی لڑائیاں لڑی۔ اس شہر کے حکمرانوں کا تعلق جسلمیر کے ایک خاندان سے تھا۔ ان کے ایک بڑے محراب سنگھ نے اس علاقے میں اپنے قدم جمائے اور ان کے پوتے موہن سنگھ نے ان کے نام پر ایک شہر محراب پور بھی بسایا اور یہیں اپنا مرکز بھی قائم کیا۔

موہن سنگھ، گرو ہر گو بند کے وفادار ساتھی تھے۔ انھوں نے گرو کا بہت ساتھ دیا اور گرو کے ساتھ مل کر مغلوں کے ساتھ کی لڑائیاں لڑیں۔ اس کا بڑا بیٹا روپ چند ایک جنگ میں مارا گیا۔ اس کے چھوٹے بیٹے نے اپنے بھائی کے بیٹے پھول کی پرورش میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی موت کے بعد پھول نے ایک مضبوط گروہ کی بنیاد رکھی۔ اس کا ایک بیٹا اعلیٰ سنگھ بھی تھا۔

بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت کے بعد اعلیٰ سنگھ کو اپنی ریاست قائم کرنے میں خاصی سہولت حاصل ہوئی۔ اس کے لیے انھوں نے خالصہ کی مدد بھی حاصل کی۔ ان تمام جنگوں میں کئی اہم کارنامے سرانجام دینے کے بعد اعلیٰ سنگھ کو اس علاقے میں ایک اہم حیثیت حاصل ہوگئی۔ بابا بندہ سنگھ مارا جا چکا تھا اور سکھوں کو کوئی مرکزی لیڈر میسر نہیں تھا۔ مختلف مسلیں یعنی گروہ قائم ہو گئے تھے۔ اعلیٰ سنگھ نے بھی اپنا ایک گروہ بنا لیا تھا۔ اس نے کچی گڑھی کے نام سے ایک عمارت بنوائی

جواب پٹیالہ شہر کے وسط میں قلعہ مبارک کے نام سے موجود ہے۔ اعلی سنگھ کے بارے میں ہمیں ایک بہت ہی مختلف بات بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ جب احمد شاہ ابدالی اور مراٹھوں کے درمیان لڑائی ہو رہی تھی، یہ جانتے ہوئے کہ مراٹھا لوگ بڑی دور سے آئے ہیں اور انھیں شکست بھی ہونے والی ہے، اس نے احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیا۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ احمد شاہ ابدالی مغل حکمرانوں کی مدد اور مراٹھوں کا راستہ روکنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس موقع پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام ہندو اور سکھ مل کر ابدالی کا مقابلہ کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ شمالی ہندوستان کے راجاؤں کی اکثریت نے یہ جانتے ہوئے کہ اگر مراٹھے اس علاقے میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ان کی ریاستوں کے لیے خطرے کا باعث ہوگا اور یہ بھی انھیں معلوم تھا کہ احمد شاہ ابدالی جیت کر حسب معمول واپس افغانستان چلا جائے گا، اس وجہ سے ان سکھ ریاستوں نے احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیا۔ اس بات سے خوش ہو کر احمد شاہ ابدالی نے اعلیٰ سنگھ کو نہ صرف ریاست قائم کرنے میں مدد دی اور اسے مہاراجا کا خطاب بھی دیا، بلکہ اسے اپنا جھنڈا بنانے کی بھی اجازت دی۔ اس طریقے سے 1763ء میں ریاست پٹیالہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ابدالی کے جانے کے بعد اس کے گورنر کو شکست دے کر اعلیٰ سنگھ نے سرہند کا کچھ علاقہ قبضے میں لے لیا۔ اعلیٰ سنگھ کے زیر قبضہ علاقے کو اعلیٰ کی پٹی کہا جانے لگا۔ پنجابی زبان میں پٹی لمبائی کے رخ ایک بڑے علاقے کو کہتے ہیں۔ اعلیٰ کی پٹی بعد میں ریاست پٹیالہ میں تبدیل ہو گئی۔ اسی دور میں پٹیالہ شہر میں قلعہ مبارک کی بنیاد بھی رکھی گئی۔

اعلی سنگھ جس ریاست کے لیے عمر بھر جنگ کرتا رہا اسے اس کی حکمرانی صرف دو سال ہی نصیب ہوئی اور وہ 1765ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا پوتا امر سنگھ گدی پر بیٹھا۔ ریاست پٹیالہ کے قائم ہونے کے چند سال بعد رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی۔ اب ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے والیان کو، جن میں ریاست کپورتھلہ، ریاست جند، ریاست پٹیالہ بھی شامل تھیں، یہ خوف پیدا ہوا کہ رنجیت سنگھ کہیں ان کی ریاستوں پر بھی قبضہ نہ کر لے۔ ایسے موقع پر ان سب ریاستوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے تحفظ کے لیے انگریزوں سے مدد

لیں۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان سکھ ریاستوں کے والیان نے کسی مسلمان کے خوف سے نہیں بلکہ ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ سے بچنے کے لیے غیر ملکی قابض حکمرانوں کی مدد حاصل کی۔ اس کام کے لیے ان ریاستوں اور انگریزوں کے مابین 1808ء میں ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے یہ طے پایا کہ انگریز ان ریاستوں کو تحفظ فراہم کریں گے۔ یہ ریاستیں انگریزوں کی وفادار ہوں گی۔ جنگ آزادی میں ان ریاستوں نے بطورِ ریاست انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ وہ ستلج کے مغربی حصے تک ہی محدود رہے گا۔ یوں ان ریاستوں نے اپنی بقاء کے لیے انگریزوں کی پناہ لی۔

ان ریاستوں نے جب یہ جانا کہ مراٹھوں سے کیسے بچنا ہے تو انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ دوستی کی اور جب انھوں نے رنجیت سنگھ سے خطرہ محسوس کیا تو انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا تاکہ وہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

اب تک میں نے جو پڑھا ہے اس کے مطابق ہندوستان کی اکثر ریاستوں نے اپنی حفاظت اور بقاء کے لیے کسی نہ کسی غیر ملکی کو ضرور بلوایا ہے۔

ریاست پٹیالہ کے دس حکمران رہے، جنھوں نے مختلف اوقات میں مختلف کام کیے۔ آج پٹیالہ کو پنجاب کا ایجوکیشنل کیپیٹل کہا جاتا ہے اور کھیلوں کی دنیا میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہے۔ پٹیالہ میں بنے ہوئے قلعوں اور محلات کے ساتھ ساتھ بے شمار تاریخی عمارتیں بھی اس شہر کی خوب صورتی اور دلچسپی میں بے حد اضافہ کرتی ہیں۔ اسے رائل سٹی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ہندوستان بھر میں پہلی کار اور پہلا ہوائی جہاز رکھنے کا اعزاز بھی ریاست پٹیالہ کے حکمرانوں کو ہی حاصل ہے۔ ریاست پٹیالہ کے حکمرانوں نے جس انداز سے ہر ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ تعلقات بنا کر رکھے، وہ اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اس موقع پر ایک سکھ خاتون ''بی بی صاحب'' کور کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ ایک کم عمر راجا کی بڑی بہن تھیں۔ مراٹھوں نے ریاست پٹیالہ پر حملہ کرنا چاہا۔ سب ان کی طاقت سے خوف زدہ تھے تو ایسے میں صاحب کور جی نے فوجوں کی قیادت کی اور اپنی ریاست کو بچایا۔ اس طرح ہندوستان

کی چند بہادر خواتین میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا۔ ریاست پٹیالہ نے انگریزوں سے وفاداری کا صحیح حق ادا کیا۔ گورکھوں، سکھوں اور افغانیوں سے جنگوں میں ریاست پٹیالہ نے انگریزوں کا بھر پور ساتھ دیا۔ جنگ آزادی کے دوران بھی یہ ریاست انگریزوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ریاست پٹیالہ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں سکھوں کا ساتھ دیتی تو کبھی بھی انگریزوں کو پنجاب میں قدم جمانے کا موقع نہ ملتا۔ ریاست پٹیالہ نے جہاں احمد شاہ کے ساتھ جنگ میں مراٹھوں کا ساتھ بھی دیا۔ مراٹھا قیدیوں کو چھڑانے کے لیے جرمانا بھی ادا کیا، ایک بڑی رقم دے کر بیس ہزار ہندوستانی قیدی بھی آزاد کروائے، وہیں پر احمد شاہ کے ساتھ صلح بھی کی، ہندوستان بھر میں پہلی اور آخری مرتبہ اس کے نام کا سکہ بھی جاری کیا، اس سے مہاراجا کا خطاب بھی حاصل کیا اور اس کی مدد سے سرہند کے علاقے پر قبضہ بھی کیا۔

کب جنگ کرنی تھی اور کب صلح میں فائدہ ہے، یہ سب ریاست پٹیالہ کے سکھ حکمران بخوبی جانتے تھے۔ انگریزوں کی مدد کرنے سے پہلے میں انھوں نے بے شمار مراعات بھی حاصل کیں ان کی فوج میں بھی شریک ہوئے، دنیا بھر میں ان کی خاطر جنگیں بھی لڑیں، کرنل اور پھر جنرل کے خطاب بھی حاصل کیے۔ برطانیہ کے شاہی خاندان کا قرب بھی حاصل کیا۔ ایسا کیسے ہوا؟ یہ سب ان کی سیاسی بلوغت کا نتیجہ تھا۔

آزادیِ ہند کے بعد بھی وہ اہم ترین عہدوں پر فائز رہے۔ آخری مہاراجا کے بیٹے کیپٹن امریندر سنگھ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی رہے ہیں۔ یوں یہ خاندان 1763ء سے اب تک حکمرانی کر رہا ہے۔ پہلے تو وہ صرف ایک مختصر علاقے، یعنی ریاست پٹیالہ تک ہی محدود تھے لیکن اب کئی دہائیوں سے پورے بھارتی پنجاب کے حاکم ہیں۔

اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ریاست پٹیالہ کے راجاؤں نے اپنی ریاست کو جنگ سے بچا کر سب سے صلح رکھی اور اپنی ریاست کو ایک قابلِ ذکر ترقی دی۔ انھوں نے کالج بنائے، پنجابی یونیورسٹی بھی بنوائی، گاما پہلوان کی سرپرستی بھی کی، موسیقی کی دنیا میں بھی پٹیالہ گھرانہ

کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے، ایک بڑا اسپورٹس کمپلیکس بھی بنوایا، موتی باغ بھی بنوایا گردوارے اور محلات بھی تعمیر کیے۔ ہندوستان میں ایسا کم ہی ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی ثقافت کو، جن میں پٹیالہ پگڑی، پٹیالہ شلوار، اور خواتین کے دیگر لباس بھی شامل ہیں، پروان چڑھایا۔

پٹیالہ شہران شہروں میں سے ایک ہے جسے دیکھنے کی ہمیشہ سے حسرت رہتی ہے۔

اگر اللہ کو منظور ہوا اور زندگی اور حالات نے ساتھ دیا تو ایک دن ضرور جاؤں گا!

میں نے اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی کہ آزادیِ ہند سے قبل اس ریاست میں مسلمانوں کی تعداد کتنی تھی اور ان کے حالات کیسے تھے؟ اس بارے میں کچھ باتیں تو میں نے اپنے والدین سے سنی تھیں اور کچھ مختلف کتابوں میں دیکھیں۔ ان سب سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ریاست پٹیالہ میں مسلمانوں کی تعداد پچیس فیصد کے قریب تھی۔ سرہند میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ میں نے اپنے بزرگوں سے جو سنا، اس کے مطابق ہندوؤں اور سکھوں کے جلوسوں کے موقع پر مسلمان پانی کی سبیلیں لگاتے تھے اور محرم اور عید میلاد النبی کے موقع پر سکھ اور ہندو مسلمانوں کو پانی پلاتے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ بھی علم ہوا کہ ان کے شہر میں کبھی بھی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ سکھ حکمران بھی اپنی اقلیت کا خیال رکھتے تھے۔ ان کے ذاتی ملازمین میں مسلمان بھی شامل تھے۔

اس طرح کا ایک اہم واقعہ بھی میں نے پڑھا کہ راجا کے ہاتھیوں کی خدمت کے لیے مسلمان ملازم ہوا کرتے تھے۔ آزادیِ ہند کے موقع پر وہ مسلمان بھی کیمپ میں چلے گئے۔ جس پر ہاتھیوں نے کھانا پینا بند کر دیا۔ یہ سب دیکھ کر انھیں واپس بلایا گیا اور راجا نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری لی۔ میں نے تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں پڑھی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ریاست پٹیالہ کے سکھ حکمرانوں نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا ہو۔ اس وقت پٹیالہ میں ہندوؤں کی تعداد پچاس فیصد سے زائد اور سکھوں کی تعداد چالیس فیصد کے قریب ہے جبکہ مسلمان صرف دو فیصد کے قریب ہیں۔ باقی یا تو مار دیئے گئے یا وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس پر میں نے پچھلے صفحات میں کافی کچھ تحریر کر دیا ہے۔

اب دوپہر کے تین بج رہے تھے اور ہمیں گھر سے چلے تقریباً دس گھنٹے ہونے کو تھے اور ابھی بھی ہنوز دلی دوراست والی کیفیت تھی۔ اردگرد کا ماحول دیکھ کر ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہ مختلف علاقہ نہیں ہے بلکہ اسی طرح کا ہے جیسے ہم لاہور کے گردونواح میں چھوڑ آئے ہیں۔ پٹیالہ اور انبالہ کے درمیان راج پورا کا ایک قصبہ آتا ہے جہاں اب بھی شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی ایک سرائے موجود ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور سفر کی داستان، جو میں نے انبالہ سے چنڈی گڑھ اور چنڈی گڑھ سے سرہند تک کا کیا۔ اس سفر کی داستان بھی بے حد دلچسپ ہے اور انسانی جذبات کا ایک انوکھا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔

میں نے بھارت کا تیسرا دورہ اگست 2000ء میں کیا تھا۔ اس سفر میں سیّد رفیق انجم جعفری صاحب (وقاص انجم جعفری صاحب کے والد صاحب) اور ساجد منظور میرے ساتھ تھے۔ اس دوران مجھے ایک اپنے کاروبار کے سلسلے میں چنڈی گڑھ آنا تھا۔ واپس ہم سرہند سے ہوتے ہوئے دلی پہنچے۔

❁ ❁ ❁

چندی گڑھ

بھارت کا ایک نیا اور امیر شہر

چندی گڑھ آنے کے لیے میں نے یہاں کے ایک مقامی شخص سے رابطہ کیا جو کیمیکلز کا کام کرتا تھا۔ میں انھی کی دعوت پر ان سے ملنے اور کچھ کاروباری معاملات طے کرنے کے لیے چندی گڑھ جا رہا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری اس شہر کو دیکھنے کی ایک دیرینہ خواہش بھی پوری ہو رہی تھی۔ پرمندر سنگھ مانگٹ، میرے ایک دوست رنبیر سنگھ مانگٹ کے بیٹے تھے۔ وہ ہماری رہنمائی اور مدد کی خاطر ہمارے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

ہم صبح دہلی سے سفر پر نکلے ہوئے تھے اور ہر تھوڑی دیر بعد رک جاتے تھے تاکہ علاقے کو غور سے دیکھ سکیں۔ ہم شام ڈھلے چندی گڑھ پہنچ گئے۔ جس علاقے میں ہمارا ہوٹل تھا ہم وہاں چلے گئے۔ وہ ایک مناسب درجے کا ہوٹل تھا لیکن اس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ اس علاقے میں واقع تھا جہاں ایشیا کا سب سے بڑا گلابوں کا باغ تھا۔ اس باغ کا نام بھارت کے ایک صدر ذاکر حسین کے نام پر رکھا گیا۔ چندی گڑھ میں کیا دیکھا، اسے کیسا پایا اور اپنے میزبان مدن لال (جو نفاست اور سلیقے میں اپنی مثال آپ تھے) سے ملاقات، پہلی اور شاید آخری مرتبہ تندوری مچھلی کھانے کا ایک منفرد تجربہ، رات کے وقت ہر چوراہے میں کھڑے گبرو سکھ نوجوانوں کو ٹھیٹ پنجابی لب و لہجے اور اونچی آواز میں باتیں کرتا دیکھنا، ایک ایسے شہر کی یاترا جہاں کوئی ٹریفک سگنل نہیں تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کئی اہم عمارات کی سیر کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل

میں چاہوں گا کہ آپ کو چنڈی گڑھ کی تاریخ، کس نے اس شہر کا سوچا، کیسے اسے بنایا گیا اور اب اس کی حالت سے متعلق کچھ عرض کروں۔

میں نے چنڈی گڑھ کا دورہ 2000ء میں کیا تھا لیکن یہ تحریر میں 2025ء میں لکھ رہا ہوں۔ اس لیے میں نے یہ کوشش کی ہے کہ چنڈی گڑھ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی موجودہ حالت کے بارے میں بھی آپ کی معلومات میں اضافہ کیا جائے۔

چنڈی گڑھ کا حدود اربعہ اور اس کی تاریخ

چنڈی گڑھ کی سرحد شمال مغرب اور جنوب میں پنجاب اور مشرق میں ہریانہ کی ریاست سے ملتی ہے۔ یہ شہر ان دونوں ریاستوں کا حصہ نہیں ہے بلکہ بھارت کے وفاقی علاقوں کا حصہ ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ 243 کلومیٹر جبکہ امرتسر سے 229 کلومیٹر ہے۔ آزادیِ ہند سے قبل اس علاقے میں کوئی خاص آبادی نہیں تھی۔ یہاں پر موجود چنڈی نامی ایک مندر کی وجہ سے اس شہر کا نام چنڈی گڑھ رکھا گیا۔ چنڈی گڑھ بارے جاننے کے لیے میں نے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا سے بھی مدد لی اور اس کے ساتھ ساتھ بھارت کی ایک سرکاری ویب سائٹ سے استفادہ کیا ہے: (business.gov.in//:http)۔

آزادیِ ہند سے پہلے صوبہ پنجاب کا دارالحکومت لاہور تھا۔ اس لیے بھارت کو اپنے پنجاب کے لیے ایک شہر کی ضرورت محسوس ہوئی، جہاں وہ اس کا دارالحکومت بنا سکے۔ پہلے سے موجود شہروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ کسی نئے علاقے میں نئے سرے سے ایک شہر بسایا جائے۔ اس کام کے لیے پوادی زبان بولنے والے لوگوں کے پچاس گاؤں کو شہر بسانے کے لیے حاصل کیا گیا۔ چنڈی گڑھ کی تعمیر 1960ء میں مکمل ہوئی اور اس وقت تک شملہ پنجاب کا عارضی دارالحکومت رہا۔ البتہ 1953ء میں تعمیر کا بہت سا کام باقی ہونے کے باوجود باقاعدہ طور پر چنڈی گڑھ کو دارالحکومت بنا دیا گیا۔ پھر جب 1966ء میں پنجاب کو تقسیم کر کے ایک نیا صوبہ ہریانہ بنایا گیا تو دونوں ریاستوں کا دارالحکومت چنڈی گڑھ ہی قرار پایا۔ اس طرح چنڈی گڑھ بھارت کا ایک ایسا شہر ہے جو دو ہمسایہ ریاستوں پنجاب اور ہریانہ کا صدر مقام ہے۔ چنڈی گڑھ

کے قرب وجوار میں واقع کچھ پرانے گاؤں ابھی بھی موجود ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے پنجاب یونیورسٹی کئی دیہات کی زمینیں لے کر بنائی گئی۔ زمین تو لے لی گئی لیکن وہ حصہ جہاں لوگوں کے گھر تھے وہ ویسے ہی رہے اور اب تک ایسے ہی موجود ہیں۔

چندی گڑھ شمال مغربی ہندوستان میں ہمالیہ کے قریب واقع ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے 1053 فٹ بلند ہے (لاہور سطح سمندر سے تقریباً سات سو فٹ بلند ہے)۔ چندی گڑھ کے اردگرد کا بیشتر حصہ گھنے جنگلوں پر مشتمل ہیں۔ ان جنگلوں میں بے شمار اقسام کے پودے، پرندے اور جانور پائے جاتے ہیں۔ مجھے یہ ایک دلچسپ بات بھی جاننے کو ملی کہ سردیوں کے موسم میں چندی گڑھ میں واقع جھیل سائبیریا اور یورپ کے کچھ حصوں سے نقل مکانی کرنے والے پرندوں کی میزبانی بھی کرتی ہے۔ ایک اور بات بھی میرے لیے نئی تھی کہ چندی گڑھ میں سو سال پرانے درختوں کو قومی ورثہ قرار دے کر ان کی بہترین حفاظت کی جاتی ہے۔ میں نے ایسا کسی دوسرے شہر کے بارے میں نہیں پڑھا۔ چندی گڑھ میں ایسے درختوں کی تعداد تیس سے بھی زائد ہے۔

چندی گڑھ میں واقع قابل دید مقامات کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ وسیع وعریض سکھنہ جھیل، راک گارڈن، جہاں ضائع شدہ اشیا کو استعمال کر کے مختلف مجسمے بنائے جاتے ہیں، ذاکر حسین روز گارڈن، جو ایشیاء کا سب سے بڑا گلاب کے پھولوں کا باغ بھی ہے، گارڈن آف خوشبو، گارڈن آف پالمز، تتلی پارک، جانوروں کی وادی اور جاپانی گارڈن کے علاوہ ہر سیکٹر میں موجود بے شمار خوب صورت باغات نے اس شہر کی خوب صورتی میں اضافہ کیا اس کے علاوہ میوزیم اور آرٹ گیلری نے بھی چندی گڑھ کی شان میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ چندی گڑھ میں ہندو آبادی کا اسی فیصد، سکھ تیرہ جبکہ مسلمان آبادی کا چار فیصد ہیں۔ کئی گوردواروں کے ساتھ چند پرانی مساجد بھی موجود ہیں۔

چندی گڑھ کو بھارت کے ''دولت مند شہروں'' میں شمار کیا جاتا ہے۔ آؤٹ سورسنگ اور آئی ٹی خدمات کے حوالے سے دنیا بھر کے پچاس شہروں میں چندی گڑھ چوتھے نمبر پر ہے۔ یہ شہر زیادہ تر تجارت، آئی ٹی اور مالیاتی معاملات کے اداروں کی وجہ سے بھی پورے بھارت میں جانا جاتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے 1952ء میں چندی گڑھ کے مجوزہ مقام کا دورہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ شہر ہندوستان کی آزادی کی علامت ہوگا۔ یہ ایک ایسا شہر ہوگا جو ماضی کی روایات کا قیدی نہیں بلکہ مستقبل میں قوم کے اعتماد کا اظہار بنے گا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی اس بات کی تصدیق اس چیز سے ہوتی ہے کہ جتنا بھی میں نے اس شہر کو دیکھا اس میں شاید ہی کوئی عمارت مغل یا انگریزوں کے طرز تعمیر پر ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے پاکستان کے نئے شہر اسلام آباد کی عمارتوں میں ہمیں ہندوستانی انگریزی یا مغل طرز تعمیر کے ساتھ ساتھ اسلامی طرز کی کوئی عمارت دکھائی نہیں دیتی۔ اکثر عمارتیں نئی طرز پر بنائی گئیں ہیں۔

جن کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا ان کے ساتھ پھر ایسا تو ہوتا ہی ہے،

جب وہ غروب ہو جائے پھر وہ چاہے مغلیہ سلطنت ہو یا سلطنت برطانیہ۔۔۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی اس سوچ پر خاصی تنقید بھی ہوئی ہے۔ جس کے مطابق وہ بھارت کی روایتی سوچ سے الگ سوچ رکھتے تھے۔ چندی گڑھ پر تنقید کرنے والے کہتے ہیں کہ اس شہر کی تعمیر کرتے وقت بھارتی معاشرے کی ضروریات کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ اسے جدید طرز پر بنا کر صدیوں سے قائم طرزِ تعمیر اور طرزِ معاشرت کو نظر انداز کیا گیا۔ یہی تنقید پاکستان میں اسلام آباد کے طرزِ تعمیر پر بھی کی جاتی ہے۔ ایسی تنقید کا جواب یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ حالات اور تقاضے بدل گئے ہیں اس لیے طرزِ تعمیر بھی بدل گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس شہر کی پلاننگ کرتے وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ شہر میں ہر چوک اتنا بڑا اور اس قدر فلائی اوور بنائے جائیں گے کہ شہر میں کسی ٹریفک سگنل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس منصوبے میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ جب میں نے شہر کے مختلف حصوں میں گھوم کر دیکھا تو مجھے حقیقت بھی یہی لگی۔ چوراہے اس قدر کھلے ہیں کہ ٹریفک جام ہونے کا اندیشہ بہت کم ہوتا ہے۔ صفائی کے لحاظ سے بھارت میں یہ شہر پہلے بیس شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ذاکر حسین روز گارڈن: گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا اور شاندار باغ

جب ہم ہوٹل پہنچے تو رات ہو چکی تھی اور تھکاوٹ بھی کافی تھی لہذا ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہوٹل

کے ریستوران سے ہی کھانا کھایا جائے اور جلد آرام کیا جائے تا کہ اگلا دن ہم اچھے طریقے سے گزار سکیں۔ کھانے کے بعد جب سونے کی باری آئی تو مجھے اپنے ڈرائیور کا خیال آیا۔ عام طور پر میرا یہ طرزِ عمل ہوتا ہے کہ ڈرائیور کے لیے اپنے کمرے میں اگر بستر نہ ہوتو کوئی گدا ڈال لیتے ہیں۔ غالباً ہمارے ڈرائیور کا تعلق کسی نچلی ذات سے تھا جسے ہندو اور سکھ اپنے پاس نہیں بٹھاتے اور یہ لوگ خود بھی بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقام وہی ہے جو تقدیر کے قاضی نے ان کے لیے لکھ دیا ہے اور وہ اپنے جیسوں میں ہی بیٹھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہاں وہ سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔ کوئی کرسی پر اور کوئی زمین پر بیٹھا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے کے برابر ہی سمجھتے ہیں!

راستے میں بھی میں نے دیکھا کہ وہ کسی وقت بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر نہ کھانا کھاتا نہ ہی چائے پیتا تھا میں اس کے پاس بھی بیٹھا لیکن اس نے ہمیشہ ہی دور بیٹھنا پسند کیا۔ ہم تین لوگ تھے اور ہم نے دو کمرے لے رکھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی سو جائے گا لیکن نا جانے کیا بات ہوئی کہ اس نے کہا کہ میں آپ کے کمرے میں رات بسر نہیں کروں گا۔ آپ مجھے کمبل لے دیں میں گاڑی میں ہی رات گزار لوں گا۔ یہ سب مجھے اچھا تو نہ لگا لیکن ہمیں ایسا ہی کرنا پڑا۔۔۔

اس کے بغیر ہم چندی گڑھ نہیں پہنچ سکتے تھے!

سارا دن ہم اس کے ساتھ ایک ہی گاڑی میں سفر کرتے رہے!

سونے کے وقت ہم اسے اپنے کمرے میں نہ سلا سکے!

مجھے اب تک اس بات کا افسوس ہے!

ذاکر حسین روز گارڈن چندی گڑھ کے ماتھے کا جھومر ہے۔ یہ باغ تیس ایکڑ اراضی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس باغ میں دو ہزار اقسام کے قریباً پچاس ہزار گلاب کے پودے لگائے گئے ہیں۔ یہ باغ ہندوستان کے پہلے مسلمان صدر، جناب ذاکر حسین کے نام سے منسوب ہے۔ اس باغ کی بنیاد 1967ء میں اس وقت کے چیف کمشنر چندی گڑھ ڈاکٹر ایم ایس رندھاوا نے رکھی۔ اس باغ

میں گلاب کے علاوہ بہت سے قیمتی اور نایاب پودے اور درخت بھی لگائے گئے ہیں۔ اس وجہ سے اس کی بوٹنی دنیا میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ باغ شہر کی بڑی تقریبات کے نہایت ہی موزوں ہے، جس طرح لاہور میں باغ جناح جس کا پرانا نام کمپنی باغ تھا۔

نئی چیز بنانے کی بجائے ہم لوگوں کی بنائی ہوئی چیزوں پر اپنا نام لکھ کر نہ جانے کیوں خوش ہوتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسا کرتے وقت قائدِ اعظم حیات ہوتے تو وہ کبھی اسے پسند نہ کرتے۔ وہ ایک اصول پسند اور انتہائی خوددار شخص تھے۔

اس کے علاوہ ذاکر روز گارڈن میں فروری یا مارچ میں ایک میلہ بھی لگایا جاتا ہے جسے سالانہ گلاب فیسٹیول کا نام دیا جاتا ہے۔

ذاکر حسین خان: بھارت کے تیسرے اور پہلے مسلمان صدر تھے۔ ذاکر حسین خان صاحب کی پیدائش 1897ء میں ریاست حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کا تعلق پشتونوں کے آفریدی قبیلے سے تھا۔ بعد ازاں ان کا خاندان فرخ آباد یو پی چلا گیا۔ آزادیِ ہند کے موقع پر ان کے خاندان کے بیشتر لوگوں نے پاکستان ہجرت کی۔ آپ کے بھائی محمود حسین تقسیم سے کئی سال پہلے تحریک پاکستان میں شامل ہوئے اور انھیں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا ممبر بھی بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے وزیر تعلیم اور امور کشمیر کے وزیر کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کے ایک بھتیجے انور حسین پاکستان ٹیلیویژن کارپوریشن کے ڈائریکٹر بھی رہے ہیں۔ ان کے ایک اور بھتیجے جنرل رحیم الدین خان، پاک فوج کی چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی اور بلوچستان اور سندھ کے گورنر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔

ذاکر حسین خان اور ان کے خاندان کے کئی لوگوں نے بھارت میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا اور ان میں سے کئی افراد بھارت میں اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے جیسے کہ ان کے چھوٹے بھائی، یوسف حسین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ ان کا ایک بھتیجا مسعود حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وائس چانسلر تھا۔ ان کے ایک داماد خورشید عالم خان کئی سال تک کرناٹک کے گورنر رہے کانگریس پارٹی کے سیاستدان سلمان خورشید بھی من موہن سنگھ کے دور میں بھارت کے وزیر خارجہ

بنے۔ان سب سے آپ اس بات کا تصور کر سکتے ہیں کہ یہ خاندان کتنا با اثر تھا۔

بھارت بھر میں کئی اداروں کے نام ان کے نام پر رکھے گئے جن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا انجینئرنگ کالج بھی شامل ہے۔ایشیا کا سب سے بڑا گلاب کا باغ بھی انھی کے نام پر ہے، جس کی ہم سیر کر رہے تھے۔باوجود اس کے کہ ان کا تعلق اقلیت سے تھا، یہ سب ان کی خدمات کا بدلہ تھا۔ جس کے بارے میں مسلم لیگ کا خیال تھا کہ آزادیِ ہند کے بعد جمہوریت کی وجہ سے مسلمانوں کو حکومتی معاملات میں مناسب مقام نہیں مل پائے گا، لیکن ذاکر حسین خان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

ایک سوال کا جواب میں ہمیشہ ڈھونڈ تا رہا ہوں کہ کیا مسلم لیگ کے قائدین کا خدشہ درست تھا؟ یا پھر ہندو اور انگریز قیادت مسلمانوں کو تقسیم کر کے ان کی طاقت کمزور کرنا چاہتی تھی۔

کیا درست ہے کیا نہیں۔۔۔سوال تو بہر حال کیا جا سکتا ہے۔۔۔

یوں تو چندی گڑھ میں کئی اہم مقامات ہیں۔جن میں چند ایک کا ذکر ضروری پیش خدمت ہے۔

راک گارڈن چندی گڑھ

ایک ایسا باغ جس کی تاریخ بہت ہی انوکھی ہے: اس سے پہلے کہ میں آپ کو راک گارڈن کے بارے میں بتاؤں، میں چاہوں گا کہ اس کی تاریخ اور اس کے بنانے والے کے بارے میں کچھ عرض کروں۔یہ ایک ایسی داستان ہے جس نے مجھے بھی کئی بار حوصلہ دیا ہے۔

ایک صاحب جن کا نام نیک چند سینی تھا، 1924ء میں شکر گڑھ، نارووال میں پیدا ہوئے۔ پنجاب کے بٹوارے کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ بھارت نقل مکانی کر گیا اور محکمہ تعمیرات عامہ میں روڈ انسپکٹر کی حیثیت سے بھرتی ہو کر چندی گڑھ آ گیا۔چندی گڑھ کے قریب ایک جنگل تھا جہاں ہر طرح کی تعمیرات پر بھی پابندی تھی اور لوگ بھی وہاں جانے سے کتراتے تھے۔اس دوران نیک چند نے اپنے فارغ وقت میں ارد گرد کے علاقوں سے فالتو اشیا اور پتھر اکٹھے کر کے ان سے مجسمے، دیواریں، اور بے شمار چیزیں بنانا شروع کر دیں۔اٹھارہ سال سے زیادہ عرصے تک وہ یہ کام اکیلا ہی کرتا رہا اور کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہونے دی۔

نیک چند کا وہ کام غیر قانونی تھا لیکن وہ اسے اٹھارہ سال تک چھپانے میں کامیاب رہا۔ اس نے اپنی بنائی ہوئی اشیاء کو تیرہ ایکڑ رقبے پر پھیلا لیا۔ جب حکام کو پتہ چلا تو اسے اس کے ختم کرنے کا ڈر پیدا ہوا۔ لوگوں نے اس جگہ پر بنی ہوئی اشیا کو دیکھا تو سب نے اسے بے حد سراہا اور یوں یہ ایک ایسا باغ بن گیا جو تن تنہا ایک شخص نے اٹھارہ سال میں بنایا اور کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہونے دی۔ اس کے لیے اسے کسی مالی امداد کی بھی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو کوڑے کباڑ سے ردی کی اشیاء اٹھا کر لاتا تھا اور آرٹ کی رسمی تعلیم کے بغیر اس نے ایک ایسا عجوبہ بنایا جہاں تاج محل کے بعد آج سب سے زیادہ سیّاح آتے ہیں۔ اس پر اسے بھارت کا سب سے بڑا سول اعزاز پدما شری بھی ملا اور اس کے نام کی ڈاک ٹکٹ بھی جاری ہوئی۔ نیک چند کی وفات ہو چکی ہے لیکن اب بھی اس باغ میں ردی کی اشیا سے چیزیں بنائی جاتی ہیں اور اب کئی لوگ مل یہ کام کرتے ہیں۔

میں اس باغ کو تو نہ دیکھ سکا لیکن اس کی کئی وڈیوز ضرور دیکھی ہیں۔ یہ باغ اب بھارت میں تاج محل کا مقابلہ کر رہا ہے اُس کے لیے ہندوستان کا خزانہ خالی ہو گیا تھا لیکن اِس کے لیے صرف کوڑا کرکٹ ہی استعمال کیا گیا۔ اب یہ باغ بھارت کے قومی ورثے کی فہرست میں شامل ہے اور اس باغ کو عالمی شہرت بھی حاصل ہے۔

کام دل لگا کر اور مسلسل کیا جائے تو دنیا اس کی قدر تو کرتی ہے۔ نیک چند اور اس کا باغ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

اس کے علاوہ چندی گڑھ میں دیگر کے کئی قابلِ دید مقامات بھی ہیں۔ جن کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے۔

پہاڑیوں کے دامن میں واقع چندی گڑھ کی سکھنا جھیل ایک مصنوعی جھیل ہے جو چندی گڑھ شہر کے منصوبے کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس جھیل کے اردگرد کا ماحول بہت ہی پرسکون ہوتا ہے۔ اس جھیل میں کشتی رانی کی سہولت بھی میسّر ہے۔ میں نے اس جھیل کی کئی وڈیوز دیکھیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جگہ آرام اور تفریح کے لیے بہترین ہے۔ اس جھیل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں سردیوں میں سائبیریا سے کئی اقسام کے پرندے بھی آتے ہیں۔ شکار پر مکمل پابندی ہونے کی وجہ

سے ان پرندوں کی بڑی تعداد یہاں آتی ہے۔لوگ دور دور سے انھیں دیکھنے آتے ہیں۔

چنڈی گڑھ میں تھنڈر زون ایک تفریحی اور واٹر پارک ہے۔اس میں لوگ بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں پر بچوں کے لیے مختلف قسم کی گاڑیاں بھی ہیں۔ چنڈی گڑھ کا ٹیرس گارڈن ایک بہت ہی مشہور جگہ اور سیّاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ یہ دس ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ جو باغات اور قدرتی نظاروں سے محبت کرنے والے سیّاحوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ چنڈی گڑھ میں بوگین ویلیا گارڈن نام کا ایک باغ بھی بے حد مشہور ہے۔ یہ باغ بیس ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔اس میں مختلف بوگن ویلیا کے مختلف اقسام کے پودے ہیں۔ یہاں سالانہ بوگین ویلیا میلہ بھی لگایا جاتا ہے۔''خوشبو کا باغ'' بھی چنڈی گڑھ کا ایک قابلِ ذکر مقام ہے۔ یہ باغ خوشبودار پودوں جیسے مہندی، ہارشنگر، رات کی رانی، موتیا، چمپا، ڈی ماسک گلاب اور کئی خوشبو بکھیرنے والے پودوں کی وجہ سے مشہور ہے۔اس کے علاوہ یہاں پر جاپانی باغ اور تتلی باغ بھی قابلِ ذکر مقامات ہیں۔

میں مدن لال صاحب سے مل کر ہوٹل واپس آ گیا۔اس دوران شاہ صاحب نے بھی کافی آرام کر لیا تھا اور اب وہ تازہ دم تھے۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا کہ اب ہم شہر کی سیر کو چلتے ہیں۔اس پر وہ خوشی سے راضی ہو گئے۔ میں نے پرمندر سے بھی کہا کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے کوئی کام ہے۔اور ہمارے ساتھ جانے سے معذرت کر لی۔ میں اجنبی شہر میں کسی مقامی ساتھی کے بغیر گھومنے میں ہمیشہ دقّت محسوس کرتا ہوں لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں چنڈی گڑھ میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کوئی نہ تھی کہ زبان اور کلچر کی وجہ سے مجھے لاہور اور چنڈی گڑھ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔سب ایک جیسا ہی لگ رہا تھا۔فرق صرف اتنا تھا کہ سکھوں کی پگڑیاں زیادہ تعداد میں نظر آ رہی تھیں۔

ہم اپنے ڈرائیور کے ساتھ شہر کے مختلف حصّوں میں گھومتے رہے۔ایک دو بڑے پلازوں میں بھی گئے اور چیزوں کی قیمتیں جانیں اور تھوڑی بہت خریداری بھی کی۔ بہت زیادہ گھومنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ نئے تعمیر شدہ شہروں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔سب ایک

جیسے ہی لگتے ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں اسلام آباد کی سڑکوں پر پھر رہا ہوں۔ اُسی طرح سے کھلی سڑکیں، کشادہ چوک اور بلند و بالا عمارتیں۔ ان عمارتوں کی شکل وصورت میں کسی بھی طرح کی کوئی ایسی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جو کسی طرزِ تعمیر کی نمائندگی کرتی ہو۔ ان کے طرزِ تعمیر میں نہ کوئی ہندوستانی طرزِ تعمیر کی جھلک نہ ہی برٹش کا اندازِ تعمیر اور نہ وہ مغلوں کے ذوق کا شائبہ تھیں۔ بس یہ سیدھی سیدھی کھڑکیاں اور دروازے ہی موجودہ دور کا آرکیٹیکچر ہے۔ اس لیے مجھے ان سب میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

ایک چیز جو بہت مختلف تھی وہ خواتین کا بڑی تعداد میں سڑکوں پر موٹر سائیکل چلانا تھا۔ میں آج سے بیس سال پرانی بات کر رہا ہوں۔ اس دور میں لاہور، اسلام آباد اور کراچی میں ہمیں شاید ہی پورے دن میں کوئی خاتون موٹر سائیکل چلاتی نظر آتی تھی (اب سن 2025ء میں صورتِ حال تیزی سے بدل رہی ہے۔ اس سے وہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جاسکتی ہیں)، اور اب ان کی تعداد میں یقیناً کافی اضافہ ہو گیا ہوگا۔ ایک اور چیز جو دیکھنے کو ملی وہ یہاں کی کھلی سڑکیں اور چوراہے تھے۔ ہمیں کسی بھی جگہ پر سگنل نہیں ملا۔ ہم ہر چوراہے سے آرام سے گزر گئے۔ مجھے کسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب اس شہر کی پلاننگ ہوئی تھی تو اس کے بارے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اس شہر میں کبھی بھی ٹریفک جام نہیں ہوگی اور اب تک ایسا ہی ہے۔ بے شمار پلوں کی وجہ سے ہر طرف ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔

اس شہر میں سکھ آبادی کا پندرہ فیصد جبکہ ہندوؤں اسّی فیصد سے بھی زائد ہیں۔ میں نے یہ بھی جانا کہ سکھوں کی دکانیں بہت تھیں اور زیادہ تر دکانوں کے مالک وہی تھے۔ آپ کو اس بات کا اندازہ دکاندار کے لباس اور دیواروں پر لگی تصویروں سے ہو جاتا ہے کہ دکان کا مالک کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے پوری کوشش کے باوجود کسی مسلمان کی کوئی دکان ملی اور نہ ہی کوئی مسجد۔ اس کی وجہ چندی گڑھ میں مسلمانوں کی انتہائی کم آبادی ہے۔ اس وقت چندی گڑھ میں مسلمان آبادی کا چار فیصد بھی نہیں ہیں۔

تندوری مچّھلی اور بے فکرے پنجابی سکھ نوجوان

ہم کافی دیر تک گھومتے رہے اور اس دوران جب مغرب کا وقت ہو گیا تو واپس ہوٹل لوٹ آئے۔ ہوٹل والوں سے پوچھا کہ کیا کوئی ایسا ریستوران ہے جہاں روایتی کھانا ملتا ہو؟ انھوں نے کہا کہ اگر آپ تھوڑا سا پیدل چلیں تو مارکیٹ میں آپ کو بہت ساری ایسی جگہیں مل جائیں گی۔ ہم تینوں مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔ جب اس مارکیٹ میں پہنچے تو وہاں پر دو چیزیں بڑی ہی دلچسپ تھیں۔

عام طور پر ہمارے ہاں اندرونِ لاہور یا چھوٹے قصبوں میں ایسا ہوتا ہے کہ شام کے وقت چوراہوں میں بڑی تعداد میں نوجوان کھڑے ہو کر آپس میں گپ شپ کرتے ہیں، ایسا اب نئی آبادیوں میں نہیں ہوتا اور ان جگہوں پر اگر کوئی ایسا کرے تو لوگ اس کا برا مناتے ہیں لیکن پرانے محلّوں میں کہیں نہ کہیں اس کا رواج اب بھی موجود ہے۔ میں نے دیکھا کہ مارکیٹ کے ایک طرف تقریباً دس بارہ نوجوان لڑکے، جن کی عمریں بیس پچیس سال کے لگ بھگ ہوں گی اونچی آواز میں گپ شپ کر رہے تھے۔ اس طرح کا منظر میں نے بھارت میں کہیں بھی نہیں دیکھا تھا اس لیے اسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

یہ روایت پنجاب اور خاص طور پر پنجابی لوگوں میں بہت عام ہے کہ شام کے وقت وہ چوکوں، چوراہوں میں کھڑے ہو کر یا کسی پارک کے کونے میں بیٹھ کر اونچی آواز میں گپ شپ اور مذاق کرتے ہیں۔ ایسا ہی مجھے یہاں دیکھنے کو بھی ملا جو میں نے اب تک بھارت میں کہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک طرح سے پنجابی کلچر کی نمائندگی تھی۔ ان لڑکوں میں اکثر سکھ تھے جو اپنے لباس سے پہچانے جا رہے تھے۔ میں دور کھڑا ہو کر ان کی باتیں سنتا رہا۔ وہ آپس میں مذاق کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ میں دور کھڑا ان کی باتوں کو سنتا رہا وہ میرے ہی لہجے میں (جس لہجے میں میں پنجابی میں بات کرتا ہوں) بات کر رہے تھے تو مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ منظر اب تک مجھے یاد ہے۔

وہ سب دیکھ کر مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ میں بھی لڑکپن میں اپنے محلے میں اس طرح کی ٹولی

کا حصہ تھا۔ لاہور میں آ کر میں اس طرح کے کسی بھی ٹولے کا حصہ نہ بن سکا۔ اس لیے میں نے اس سے بہت زیادہ لطف اٹھایا اور اپنا بچپن یاد کیا۔ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے جس میں یہ کام اچھے لگتے ہیں۔

میں ایک اور بات کرنا چاہوں گا کہ اس طرح کی گپ شپ نہ صرف تا دیر قائم رہنے والی دوستیوں کو جنم دیتی ہے بلکہ اس سے اچھی تعلیم وتربیت بھی ہوتی ہے۔ بچوں کو یہ پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ایک گروپ میں کھڑے ہو کر کیا بات کرنی ہے اور کس طریقے سے جواب دینا ہے؟ یہی وہ دوستیاں ہوتی ہیں جو عمر بھر کا ساتھ ہوتی ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی ہوتے ہیں۔ اس طرح کی چھوٹی موٹی گپ شپ بچوں کے لیے بے حد مفید ہوتی ہے۔ جو لوگ کالونیوں میں رہتے ہیں، جہاں اس بات کا رواج ختم ہو گیا ہے، وہاں پر بچے اس طرح کے ماحول سے جو کچھ سیکھنا چاہیے وہ بھی سیکھ نہیں پاتے ہیں۔ اس لیے ہم انھیں ممی ڈیڈی ٹائپ بچے کہتے ہیں۔ اور وہ ممی ڈیڈی ٹائپ بچے دنیا کی گرمی سردی کا مقابلہ کرنے میں کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ میں والدین سے کہوں گا کہ انھیں اپنے بچوں کو مختلف لوگوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ ایک کھلے ماحول میں گپ شپ کا موقع دینا چاہیے تا کہ ان کے اندر حوصلہ پیدا ہو اور وہ یہ بھی جان سکیں کہ ایک گروپ میں کھڑے ہو کر کس طریقے سے بات کرتے ہیں۔ اگر وہ زیادہ وقت موبائل پر کارٹون دیکھنے میں گزاریں گے تو وہ کچھ سیکھ نہیں پائیں گے اور کارٹون ہی بن جائیں گے۔

اللہ کرے ایسا نہ ہو!

ہم ایک قریبی ریستوران میں چلے گئے، وہاں بہت رش تھا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ کی خاص ڈش کیا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ تندوری مچّھلی، جو ہم تندور میں بناتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ پاکستان میں اس طرح سے سجی تو بنائی جاتی ہے لیکن مچھلی نہیں۔ ہم نے تندوری مچّھلی کھائی۔ جس کا لطف ہی کچھ الگ تھا۔ ایک اچھی بات جو وہاں پر نظر آئی وہ یہ کہ پبلک مقامات پر شراب پینے پر پابندی تھی۔ پرمندر نے مجھے بتایا تھا کہ ہریانہ وہ پہلی ریاست ہے جس نے سرِ عام شراب پینے پر پابندی عائد کی تھی اور اس کی وجہ سے اسے ڈرائی اسٹیٹ بھی کہا جاتا تھا۔ شہر بھر میں سگریٹ کی کوئی دکان نہیں ملی۔ اس کی وجہ سکھوں کی سگریٹ سے شدید نفرت

ہے۔ان کے دھرم میں سگریٹ اور حقّے کی سخت ممانعت ہے۔ممانعت تو شراب اور گوشت کی بھی ہے لیکن اس کی اتنی پابندی نہیں کی جاتی جتنی سگریٹ کی کی جاتی ہے۔

صبح ہماری واپسی تھی اور ہم نے واپس جانے کے لیے فتح گڑھ کا راستہ لیا۔ پر مندر، فتح گڑھ میں گردوارہ جانا چاہ رہا تھا۔ اور اس طرح مجھے سرہند میں اپنے آباؤ اجداد کے گھر دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ فتح گڑھ میں کیا دیکھا، اس کی داستان ان شاء اللہ اگلے صفحات میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔اب ہم چندی گڑھ سے موہالی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ دو جڑواں شہر ہیں بالکل اسی طرح جیسے اسلام آباد اور راولپنڈی۔موہالی پنجاب کا ایک ضلع ہے جبکہ چندی گڑھ ایک وفاقی علاقہ ہے۔

موہالی،جس کا سرکاری نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر ہے

ہم صبح آٹھ بجے کے قریب چندی گڑھ سے نکلے اور ہماری منزل ضلع فتح گڑھ تھی، جہاں ایک شہر سرہند بھی واقع ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے لیکن اس کی اصل اہمیت، اس کا میری ذات سے گہرا تعلق ہے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں سے میرے آباؤ اجداد نے آج سے 53 سال پہلے ایک انتہائی ناگفتہ بہ صورت حال میں ہجرت کی تھی۔انھوں نے اپنے اس گھر بار کو چھوڑا جہاں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔وہ سب لوگ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر اور لٹ لٹا کر پاکستان ہجرت پر مجبور ہوئے تھے۔اس دوران ایک کثیر تعداد کو شہید کر دیا گیا اور بہت ساری عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ یہ وہی شہر تھا جس کے بارے میں میرے والد صاحب اپنے مال و دولت سے زیادہ اس بات کا غم کرتے تھے کہ وہ اپنے دیس میں اپنے آباؤ اجداد کی قبریں چھوڑ آئے ہیں، جو نہ جانے کس حال میں ہوں گی۔میں اب اس شہر میں جا رہا تھا۔جذبات کا کیا عالم تھا، الفاظ میں اظہار کرنا بہت مشکل ہے۔

اس سے قبل کہ میں آپ کو اپنے اگلے حالات و واقعات سے آگاہ کروں میں چاہوں گا کہ وہ شہر، جس میں سے ہم گزر رہے تھے، جس کا نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر ہے کے بارے میں کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔یاد رہے ہم یہ سفر 2000ء میں کر رہے تھے اور اس وقت تک موہالی ضلع نہیں بنا تھا۔اسے 2006ء میں ضلع بنایا گیا اور اب یہ پنجاب کا آٹھواں

ضلع ہے۔اب جب میں نے اس سے متعلق پڑھا تو بہت سی دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں جنھیں میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ضلع موہالی کا سرکاری نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر ہے۔عام طور پر اسے موہالی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔صاحبزادہ اجیت سنگھ، گرو گوبند سنگھ کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔وہ چمکور کی دوسری جنگ کے دوران اپنے بھائی صاحبزادہ جوجار سنگھ کے ہمراہ جنگ کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ ان کے دوسرے دو بھائیوں، زووارہ سنگھ اور صاحبزادہ فتح سنگھ (جن کی عمریں بالترتیب نو اور سات سال تھیں) کو عالمگیر کے گورنر وزیر خان کے حکم پر ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔اس مقام پر اب گوردوارہ فتح گڑھ صاحب ہے۔یہ جگہ سرہند کے قریب ہی واقع ہے۔اسی وجہ سے اب اس شہر اور ضلع کا نام فتح گڑھ رکھا گیا ہے۔مجھے بھی اس دیوار کو دیکھنے کا موقع ملا، جس کی تفصیل اگلے صفحات میں کی جائے گی۔

موہالی شہر میں بابا بندہ سنگھ بہادر وار میموریل کا افتتاح 2011ء میں ہوا۔بندہ سنگھ بہادر سکھوں کے ایک اہم ترین فرد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔بندہ سنگھ بہادر 1670ء میں پیدا ہوئے۔وہ گرو گوبند سنگھ کے ایک خاص شاگرد تھے۔انھوں نے مغل سلطنت کے خلاف مسلح جدوجہد کی قیادت کی اور کئی اہم معرکے بھی سر کیے۔میرے نزدیک ان کا سب سے اہم کارنامہ زمینداری نظام کا خاتمہ تھا جس کے نتیجے میں عام کسانوں کو بے حد فائدہ پہنچا۔ایک جنگ میں مغلوں نے انھیں قید کر لیا اور کہا جاتا ہے کہ انھیں شدید تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا اور اس طرح ان کی موت واقع ہوئی۔بابا بندہ سنگھ بہادر سکھوں کے نزدیک بہادری کی ایک علامت سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے پنجاب کے کئی علاقوں میں جگہ جگہ ان کے مجسمے دکھائی دیتے ہیں۔

گردوارہ شری امب صاحب بھی موہالی کی ایک پہچان ہے، پنجابی میں آم کو امب کہتے ہیں۔اس گردوارے کے بارے میں سکھوں کا یہ کہنا ہے کہ ساتویں گرو، شری گرو ہر رائے صاحب نے یہاں کا دورہ کیا تھا اور سردیوں کے موسم میں آم کھانے کی فرمائش کی تھی۔جس پر مقامی لوگوں نے کہا کہ اس موسم میں آم تو نہیں ہوتا۔آپ نے لوگوں سے کہا کہ جاؤ جا کے دیکھو۔اس پر لوگ

گئے اور انھوں نے سردیوں میں درختوں پر آم دیکھے، جس پر سب حیران ہوئے۔ اسی وجہ سے اس جگہ پر ایک گردوارہ بنایا گیا جس کا نام گردوارہ امب صاحب رکھا گیا۔ یہ ایک طویل قصہ ہے جو انتہائی دلچسپ ہے اور اس میں عقیدت کی انتہا بھی نظر آتی ہے۔

موہالی کا اسٹیڈیم پاکستان میں کافی مشہور ہے۔ یہاں پر پاکستان اور بھارت کے درمیان کئی اہم میچ ہوئے جو مارو یا مرجاؤ کی کیفیت پر مبنی تھے۔ یہ اسٹیڈیم کئی لحاظ سے ایک جدید اسٹیڈیم ہے۔ اس میں تیس ہزار کے قریب شائقین کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہ اسٹیڈیم بھارت کا 19 واں ٹیسٹ کرکٹ میدان ہے۔ اس کا افتتاح 1993ء کو ہیرو کپ کے دوران ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے مابین ایک روزہ بین الاقوامی میچ سے ہوا۔ یہاں پر ورلڈ کپ کے بھی کئی میچ کھیلے گئے ہیں۔ سب سے اہم میچ جو مجھے ابھی تک یاد ہے وہ ورلڈ کپ کا بھارت اور پاکستان کے مابین کھیلا جانے والا سیمی فائنل تھا۔ اس میچ کو دیکھنے کے لیے بھارت کے وزیراعظم من موہن سنگھ اور پاکستان کے یوسف رضا گیلانی نے بھی شرکت کی، وہ میچ پاکستان ہار گیا تھا۔ جس پر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان نے یہ میچ جان بوجھ کر ہارا ہے تا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات کو معمول پر لایا جاسکے۔ ہمیں بھی اس اسٹیڈیم کو دور سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس علاقے میں ایک ایسا ڈیم بھی موجود ہے جس کی بنیاد انگریزوں کے دور میں رکھی گئی لیکن اس کی تکمیل آزادیِ ہند کے بعد ہوئی۔ اس کا نام ہماچل پردیش کے ایک بھکرا نامی گاؤں، جو اس ڈیم میں ڈوب چکا ہے، کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ڈیم کی لمبائی پانچ سو میٹر اور چوڑائی نو میٹر ہے۔ اس کی جھیل کا نام گوبند ساگر ہے۔ پانی کی مقدار کے لحاظ سے یہ بھارت کا تیسرا سب سے بڑا پانی ذخیرہ کرنے والا ڈیم ہے۔ یہ ڈیم دریائے ستلج پر بنایا گیا ہے۔ اس کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت تیرا سو میگا واٹ سے بھی زائد ہے۔ اونچائی کے اعتبار سے اس کا شمار دنیا کے بلند ترین ڈیموں میں ہوتا ہے۔

موہالی میں فتح برج بھی بنایا گیا ہے اس کی اونچائی سو میٹر ہے (مینار پاکستان کی اونچائی ستر میٹر اور قطب مینار کی اونچائی 73 میٹر ہے)۔ یہ ایس اے ایس نگر ضلع پنجاب کے چھپر چیری کے

تاریخی گاؤں میں واقع ہے۔ اسے 2011ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ میں یہ سفر 2000ء میں کر رہا تھا۔ اس لیے ہم اسے دیکھ نہ سکے۔ یہ برج اس مقام پر واقع ہے جہاں بندہ سنگھ بہادر نے مغل فوج کے کمانڈر وزیر خان کے خلاف فیصلہ کن جنگ جیتی تھی۔

یہ جنگ 1710ء میں مغل اور سکھ افواج کے درمیان سرہند سے بیس کلومیٹر دور ایک چھپر چیری نامی گاؤں کے پاس لڑی گئی۔ ایک طرف بندہ سنگھ بہادر تھا اور دوسری طرف وزیر خان تھا۔ اس جنگ میں سکھوں کو فتح ہوئی اور وزیر خان مارا گیا۔ اس طرح سکھوں نے پنجاب میں اپنی پہلی ریاست کی بنیاد رکھی۔ بندہ سنگھ بہادر نے لوہ گڑھ (ہریانہ) میں اپنا دارالحکومت بنایا۔ بعد ازاں مغلوں نے اس جنگ میں ہونے والی شکست کا بدلہ لیا اور بندہ سنگھ کو گرفتار کر کے اسے موت کی سزا بھی دی۔ سکھوں کے نزدیک وزیر خان کا نام بہت زیادہ قابلِ نفرت ہے جس کی وجہ گوروگوبند صاحب کے بچوں کا دیوار میں زندہ چنوانا تھا۔ اس کا وہ فعل ہر لحاظ سے قابلِ مذمت تھا۔ اس بات کی نہ ہی ہمارا دین اجازت دیتا ہے اور نہ ہی جنگی اصول۔ بہر حال یہ ایک واقعہ تھا جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔ ایسے ہی واقعات نے ہندوستانی معاشرے میں وہ دوریاں پیدا کیں جنھوں نے صدیوں سے قائم معاشرے کو ایسا تقسیم کیا جسے دوبارہ اصل حالت میں واپس لانے کے لیے نہ جانے کتنی صدیاں درکار ہوں گی۔

میرے بزرگ مجھے بتاتے تھے کہ بٹوارے کے وقت جب سکھ مسلمانوں کو قتل کرتے تھے تو وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ ہم تمھارے عالمگیر اور وزیر خان کے سکھوں پر کیے گئے مظالم کا بدلہ لے رہے ہیں۔ وزیر خان اور عالمگیر کے اقدامات ایک ایسے بادشاہ کے طور پر تھے جو اپنی سلطنت کو بچانا چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مسلمان بھی تھے لیکن بطور مسلمان ان سے ایسے کاموں کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

موہالی سے اپنے دیس تک: ایک سفر جس کا تصور بھی حسین تھا

ہم جیسے ہی چندی گڑھ سے نکلے تو میں نے اردگرد دیکھا کہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ

تھا۔میرے اندازے کے مطابق یہ علاقہ پنجاب کے ان علاقوں میں شامل ہے جوزراعت کے لیے سب سے موزوں مانے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ہاں،لاہور، گجرات سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کی زمین ہے،اسی طرح کی زمین تھی۔ میری یادداشت کے مطابق زراعت کے نقطۂ نظر سے اس سے زیادہ خوب صورت علاقہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔

ہم موہالی سے ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ ہمیں ایک جگہ رکنا پڑا۔ میں نے اس علاقے کی تاریخ پڑھتے ہوئے یہ جانا کہ جب پنجاب میں گولڈن ٹیمپل کے واقعہ کے بعد ہندوسکھ فسادات شروع ہوئے تو 1986ء میں اس علاقے میں ایک بہت ہی اہم واقعہ رونما ہوا۔جس میں 38 ہندووں کو خالصتان کے حامی سکھوں نے اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ ایک بس میں سفر کررہے تھے۔ ان پر سکھوں کے اُس گروہ نے حملہ کیا جو چاہتے تھے کہ ہندوؤں کو پنجاب سے نکال دیا جائے اور خالصتان نامی ایک خودمختار ملک بنایا جائے۔ یہ واقعہ بہت دیر تک لوگوں کی گفتگو کا موضوع رہا۔

بے گناہ لوگوں کا قتل کسی بھی تحریک کو اس کی منزل سے دور کر دیتا ہے!

میں نے اس بارے میں ایک صاحب سے جاننے کی کوشش کی تو ان کا کہنا تھا کہ کوئی بھی سکھ اس واقعے پر خوش نہیں یہ صرف چند لوگوں کا کام تھا جو خالصتان کے حامی تھے۔خالصتان کا حامی ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن بے گناہ لوگوں کا قتل درحقیقت ایک بہت بڑا پاپ ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا۔

موریندا

جو ماتا گوجری کی وجہ سے ایک عالمگیر شہرت رکھتا ہے: گوروگوبند سنگھ کے دو بچوں کو دیوار میں زندہ چنوانے کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔اس واقعے کا ایک اہم کردار ماتا گجری صاحبہ ہیں۔ ماتا گجری جسے ماتا گوجری بھی کہا جاتا ہے،سکھ مذہب کے نویں گوروگروتیغ بہادر کی بیوی اور سکھ مذہب کے دسویں گروگوبند سنگھ کی والدہ تھیں۔ ان کے پوتوں کو جب دیوار

میں چنوانے کا حکم دیا گیا تھا تو اسوقت وہ بچے ماتا گجری کے پاس ہی تھے۔ مورنڈا پنجاب کے ضلع روپ نگر میں واقع ہے۔ یہاں پر وہ کوتوالی بھی موجود ہے جہاں ماتا گجری اور اس کے دونوں پوتوں کو فتح گڑھ صاحب لے جانے سے قبل قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ ماتا گجری کی بھی موت بھی اسی جگہ پر واقع ہوئی۔ اسی وجہ سے یہ شہر سکھوں کو نزدیک ایک اہم شہر گردانا جاتا ہے۔ اس شہر میں اس واقعے کی یاد میں گردوارہ شری کوتوالی صاحب بھی بنایا گیا ہے سکھوں کے نزدیک یہ واقعہ عالمگیر اور وزیر خاں کی وجہ سے پیش آیا۔

یہاں اپنے احساسات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

سفر تو کٹ ہی رہا تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم بہت سست روی سے چل رہے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ مجھے منزل تک پہنچنے کی جلدی تھی اسی وجہ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ میری منزل تو میرے والد اور والدہ کے گھر تھے جہاں ان کی پیدائش ہوئی، جہاں ان کا بچپن گزرا، جہاں میرے آباؤ اجداد کی قبریں ہیں، جہاں انھیں اپنے دھرم بدل کر جان بچانا پڑی، جہاں میری سوتیلی والدہ اغوا کی گئیں، جہاں میرے بزرگوں کا قتلِ عام ہوا، جہاں وہ ایک بادشاہ کی زندگی گزار رہے تھے، جہاں سے میرا صدیوں پرانا رشتہ تھا، جو علاقہ میری پہچان تھا۔۔۔ وہ پہچان آج بھی ہے۔۔۔ آج کئی دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی لوگ ہمیں سرہندی کہہ کر پکارتے ہیں جہاں وہ ہستی مدفن ہے جن کے ہاتھوں ہم لوگ مسلمان ہوئے۔۔۔ یہ سب دیکھنے کے لیے میں مسلسل اپنے مغرب کی جانب دیکھ رہا تھا۔۔۔ جہاں سورج غروب ہو رہا تھا۔۔۔ وہیں میرا ماضی بھی دفن ہے۔۔۔ اس لیے وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔۔۔ ایک دن بھی اب ایک صدی جتنا طویل لگ رہا تھا۔۔۔ لیکن گھڑی کے تو جذبات نہیں ہوتے، اسے تو اپنی رفتار سے ہی چلنا ہوتا ہے۔۔۔ اسے تو سبھی کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔۔۔ اب وہ شہر آنے ہی والا تھا۔

بسی پٹھانا اور تلانیا میرے بزرگ جس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے

اس علاقے کی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے یہ بھی علم ہوا کہ فتح گڑھ سے کچھ پہلے دوسری سڑک پر گردوارہ فتح گڑھ سے تقریبا پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں بسی پٹھانا ہے۔ اس کے

پاس ہی تلانیاں نامی ایک گاؤں بھی ہے۔اس سے مجھے یاد آیا کہ میرے آباؤاجداد بتاتے تھے کہ بسی اور تلانیاں میں ان کا کافی آنا جانا تھا۔آج بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بسی اور تلانیاں سے ہجرت کر کے جانے والے لوگوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔میری خوش قسمتی تھی کہ میں آج اس گاؤں کو دور سے دیکھ رہا تھا جہاں میرے آباؤاجداد آیا جایا کرتے تھے۔میں وہ سب کچھ تصور ہی تصور میں دیکھ رہا تھا۔ان کے جانور،ان کی فصلیں،سب کچھ میری نظروں کے آگے سے گزر رہا تھا۔

ایک مرتبہ تو میں اداس ہو گیا لیکن پھر مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہوئی کہ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد ہوں جسے اپنے آباؤاجداد کے علاقے دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔مجھے ایک اور بات یاد آئی وہ یہ کہ آزادیِ ہند کے وقت اس علاقے میں میرے بزرگ کسی کھلی جگہ پر اپنے جانور لے کر آئے تھے۔

جب میں نے اس بستی سے متعلق جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس گاؤں کی بنیاد 1540ء میں رکھی گئی۔نام سے یہ ظاہر ہے کہ یہ پٹھانوں کا ایک گاؤں تھا۔سب پٹھان مسلمان ہی ہوتے ہیں۔اس لیے یہ گاؤں بھی مسلمانوں کا ہی تھا اور اب تک اس کا پرانا نام ہی چل رہا ہے۔ حالانکہ اب یہاں پر شاید ہی کوئی مسلمان رہتا ہو۔میرا خیال ہے کہ شروع میں اسے بستی پٹھانا کہا جاتا ہوگا لیکن آہستہ آہستہ یہ بسی پٹھانا ہو گیا اور پھر صرف بسی ہی رہ گیا۔اس گاؤں میں سکھوں کے گورو گوبند سنگھ بھی تشریف لائے تھے۔ان کی یاد میں یہاں ایک تاریخی گردوارہ بھی موجود ہے۔اس شہر کے بارے میں کئی قصے مشہور ہیں۔کسی جوگی کا بھی ایک قصہ ہے جو عبادت میں اس قدر مصروف تھا کہ اس کی ایک ٹانگ جل گئی لیکن اسے پتہ ہی نہ چلا۔اس کی یاد میں یہاں پر ایک مندر بھی بنایا گیا ہے۔

مجھے ایک ایسی بات کا بھی علم ہوا جس کا تصور بھی بہت مشکل ہے۔کہتے ہیں کہ 1925ء میں یہاں کے معروف صنعت کار پی ٹی آر جیداس نے ہندوستان میں بننے والی پہلی سلائی مشین تیار کی تھی۔ہندوستان کے صنعتی علاقوں سے کہیں دور ایک نئی مشین کا اس علاقے میں تیار ہونا بہت عجیب بات ہے۔اب بھی اس علاقے میں سلائی مشینیں بنانے کی بہت سی فیکٹریاں موجود ہیں۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی

ہمارے راستے میں دو اہم مقامات آرہے تھے، ایک جہاں پر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی دفن ہیں اور دوسرا اس کے پاس ہی گردوارہ فتح گڑھ، جس کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کیا ہے۔ ہم دونوں جگہوں پر گئے۔ ہم نے پہلے مجدد الف ثانی کے مزار پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو شیخ احمد سرہندی عرف مجدد الف ثانی کے مزار سے متعلق بتاؤں میں چاہوں گا کہ ان کی زندگی اور خدمات کے متعلق چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی پیدائش 1564ء میں سرہند میں ہوئی، آپ 1624ء میں وفات پا گئے۔ آپ ایک عظیم اسلامی اسکالر، حنفی فقہ کے پیروکار اور نقش بندیہ سلسلے کے ایک صوفی تھے۔ آپ کے عظیم کارناموں میں اکبر کے دین الٰہی کی مخالفت اور دین کی صحیح تشریح کرنا شامل ہے۔ اس وجہ سے آپ کو مجدد کہا جاتا ہے۔ آپ نے بچپن میں ہی قرآن حفظ کر لیا تھا۔ بعد ازاں آپ تعلیم کی غرض سے سیالکوٹ گئے۔ اس کے بعد آپ نے کئی بزرگوں سے اسلام کی تعلیم حاصل کی۔

شیخ احمد سرہندی کی تعلیم کا بنیادی نقطہ صوفی طریق کار اور شریعت کی پابندی کو ساتھ لے کر چلنا تھا۔ آپ کا ایک مشہور قول ہے کہ جو کچھ بھی نبی کے بتائے گئے راستے سے باہر ہے وہ حرام ہے۔ شیخ احمد سرہندی کا کہنا تھا کہ شریعت کا تصور ایک مکمل اور جامع اصطلاح ہے جس میں ظاہری عبادات، عقیدے اور صوفی طریقہ کار سب شامل ہیں۔ وہ شیعہ مسلک کے کافی بڑے ناقد تھے اور شاید اسی وجہ سے ہی 1619ء میں مغل بادشاہ جہانگیر کے حکم سے، جو ان کی اس سوچ کا سخت مخالف تھا، آپ کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا تھا، جس سے کئی سال بعد آپ کی رہائی ہوئی۔

شیخ احمد سرہندی سے متعلق سکھ دھرم میں ایک مختلف رائے پائی جاتی ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر نے سکھوں کے پانچویں گرو ارجن کو پھانسی دی تھی۔ اس کا الزام بھی شیخ احمد سرہندی کے سر ہے۔ جہانگیر سکھوں کے سخت خلاف تھا اور انھیں اسلام کا سخت دشمن سمجھتا تھا۔ سکھوں کا کہنا ہے کہ اس کی اس سوچ کے پیچھے شیخ احمد سرہندی کا ہاتھ تھا۔ یہ بات کہاں تک درست

ہے معلوم نہیں لیکن ایک بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اسی وجہ سے شیخ احمد سرہندی صاحب کو مجدد کہا جاتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی مغل حکمرانوں بالخصوص اکبر کے دین کی نئی شرح کے بہت خلاف تھے۔ جہانگیر نے بھی اسی بات کو اپنانے کی کوشش کی، جس کی انھوں نے سخت مخالفت کی۔اس کے ساتھ ساتھ وہ شیعہ مسلک کی بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کے بھی خلاف تھے۔

ان باتوں نے انھیں ایک طرف تو مجدد بنایا لیکن دوسری طرف کچھ لوگ ان کے شدید دشمن بن گئے اور اس کا نتیجہ گوالیار کا قلعہ تھا! مارچ 2021ء میں میاں مقصود احمد صاحب نائب قیم جماعت اسلامی پاکستان کی کوشش سے چند نامی گرامی مشائخ، الخدمت فاؤنڈیشن کے دفتر میں تشریف لائے- ان میں ایک صاحب پیر غلام مجدد سرہندی فاروقی بھی تھے۔ ان کا تعلق مٹیاری سندھ سے تھا۔ میں بھی اس محفل میں موجود تھا۔ میرا تعلق بھی چونکہ سرہند سے تھا اور شیخ احمد سرہندی کی وجہ سے ہی ہمارا خاندان بھی مسلمان ہوا تھا اس لیے میری دلچسپی دوسرے لوگوں سے بڑھ کر تھی۔

اس موقع پر میں نے اپنے خاندان کی تاریخ پر لکھی ہوئی کتاب سرہند سے ٹوبہ ٹیک سنگھ تک بھی انھیں پیش کی۔اس پر وہ بہت خوش ہوئے۔ اس موقع پر ہم نے آپس میں اس موضوع پر تھوڑی بہت بات چیت بھی کی۔اپریل کے شروع میں مجھے مٹیاری سندھ جانے کا موقع ملا۔ میں نے ان سے رابطہ کیا۔ان کا بڑا پن کہ انھوں نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ اس طرح جب میں شیخ احمد سرہندی کے خیالات اکبر، جہانگیر، عالمگیر، سکھ، ہندوؤں سے متعلق تاریخ پڑھ رہا تھا تو مجھے سکھوں کے خیالات بھی جاننے کا موقع ملا۔ سکھوں کے مطابق مغلوں نے سکھوں پر جو بھی ظلم کیا، مغلوں کی اس سوچ کو پروان چڑھانے میں شیخ احمد سرہندی کا نام سب سے پہلے ہے۔میں نے یہ بات پیر صاحب سے پوچھی۔وہ مجدد صاحب کے خانوادے میں سے ہیں اور سندھ کے علاوہ دنیا بھر میں اس جماعت کے سربراہ بھی ہیں۔انھوں نے جو کچھ مجھے بتایا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

انھوں نے کہا کہ جہاں تک مجدد صاحب کے ہندوؤں کے بارے میں خیالات کا تعلق ہے تو وہ بڑے واضح ہیں۔ انھوں نے اکبر کے دور میں ہندو عورتوں سے شادی (جو نہ صرف بادشاہ

کرتے تھے بلکہ بااثر مسلمان بھی یہی کام کرتے تھے) کی سخت مخالفت کی۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اکبر کے دین الٰہی کی بھی مخالفت کی۔مجدد صاحب اس بات کے حامی تھے کہ ہندوؤں کے ساتھ ایک خاص حد تک سماجی روابط رکھے جائیں،لیکن اپنے دینی معاملات کو دین کی صحیح روح کے ساتھ ہی لے کر چلنا چاہیے۔

سکھوں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک صاحب ہندوؤں کی بجائے مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں۔اس کی ایک مثال میاں میر صاحب کا گولڈن ٹیمپل کی سنگ بنیاد رکھنا بھی ہے۔اس کے علاوہ سکھ کسی بھی طرح کی مورتی کی پوجا نہیں کرتے اور یہ بات بھی انھیں مسلمانوں کے قریب کرتی ہے لیکن بہت ساری باتیں ہندوؤں سے بھی ملتی جلتی ہیں۔اس لیے آج بھی ہندو بابا گورونانک کو اپنا ایک راہ نما مانتے ہیں اور اپنے مندروں میں ان کی تصاویر لگاتے ہیں۔پیر صاحب نے مزید کہا کہ سکھوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی جس کی بناء پر وہ مجدد صاحب کے خاندان کے خلاف ہو گئے۔یہ معاملہ اس حد تک بڑھا کہ 1858ء میں مجدد صاحب کے خاندان کو سرہند سے ہجرت کر کے کابل اور پشاور جانا پڑا اور بعد میں کچھ لوگ سندھ میں جا بسے۔

اس دوران مجدد صاحب کے دربار کے پاس واقع ان کی مسجد کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔حتیٰ کہ مسجد کو بطور اصطبل بھی استعمال کیا گیا۔پیر صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ سب کچھ اس غلط فہمی کی بنیاد پر تھا کہ سکھوں پر ہونے والے مظالم خاص طور پر بچوں کے قتل کا واقعہ مجدد صاحب کی تعلیمات ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔سرہند کی اس مسجد کی تعمیر کے لیے سندھ میں آپ کے خانوادے کے لوگوں نے چندہ بھی اکٹھا کیا۔اس طرح سندھ کے لوگوں نے سرہند کی اس مسجد کی تعمیر میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔اب صورت حال بالکل مختلف ہے اس وقت بڑی تعداد میں سکھ مجدد صاحب کے عرس پر آتے ہیں اور زائرین کی خدمت بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے گردواروں میں ان کے کھانے اور رہائش کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔

پیر صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان جنگ کو ہوا دینے میں

ہندوؤں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ہندو ہی تھے جو مغل حکمرانوں کو سکھوں کے خلاف اکساتے تھے تا کہ ان دونوں کے درمیان دوری قائم رہے۔ پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ پنجاب کے بٹوارے کے وقت مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان سکھوں نے ہی پہنچایا۔ ہندوؤں نے بھی پہنچایا ہوگا لیکن سکھوں سے کم۔

کیا بات درست ہے، کیا نہیں ۔۔۔ یہ جاننا ضروری بھی ہے ۔۔۔ لیکن مشکل بھی۔

ہم تینوں شیخ احمد سرہندی کے مزار (جسے عام طور پر روضہ شریف کہا جاتا ہے) کے صدر دروازے سے گزر کر کافی آگے ایک دو منزلہ عمارت کے پاس پہنچ گئے۔ ایک صاحب نے ہمیں یہ بتایا کہ ان کی قبر مبارک نیچے ہے لیکن نیچے سے راستہ بند ہے۔ آپ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جائیں۔ وہاں آپ کو قبر کا تعویذ ملے گا۔ ہم اوپر چلے گئے ہم نے ان کے لیے فاتحہ خوانی کی۔ بعد ازاں واپسی پر میں نے دیکھا کہ وہاں پر کتابوں کی کئی دکانیں بھی تھیں اور رہنے کے لیے بڑے بڑے ہال بھی بنے ہوئے تھے۔

میں نے اس بات کی کافی کھوج لگائی کہ ہمارا خاندان کب مسلمان ہوا؟ لیکن مجھے صحیح معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ صرف اتنا جاننے کو ملا کہ میرے دادا کے دادا محمد بخش مانگٹ کا نام تو مسلمانوں جیسا تھا۔ ان سے پہلے کے لوگ کب مسلمان ہوئے؟ کسی کو علم نہیں۔ یہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہوا (اس کا ذکر میں اگلے صفحات میں کروں گا) کہ جس محلے میں ہم رہتے تھے وہاں ایک چارسو سال پرانی بہت بڑی مسجد اب بھی موجود ہے لیکن ویران ہے۔ اب اس علاقے میں کوئی بھی مسلمان نہیں رہتا۔

شیخ احمد سرہندی کا سالانہ عرس ہر سال منایا جاتا ہے۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بھارت کے علاوہ پاکستان، افغانستان، انڈونیشیا، بنگلہ دیش اور دیگر مسلم ممالک سے شرکت کرتے ہیں۔ پاکستان سے بھی ہر سال ایک وفد اس عرس میں شرکت کے لیے جاتا ہے۔ جس میں بڑی تعداد میرے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سرہند سے ہجرت کر کے آنے والوں کی ایک کثیر تعداد رہتی ہے۔ روضہ شریف ایک

بڑے احاطے میں واقع ہے۔اس احاطے میں مجدد صاحب کے علاوہ خواجہ محمد صادق اور خواجہ محمد معصوم کے روضے بھی موجود ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ کابل کے حکمران خاندان کے کچھ افراد کی قبریں بھی وہاں موجود ہیں۔ یہاں ایک عظیم الشان مسجد بھی ہے۔اب اس مزار کی دیکھ بھال بھارتی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

گردوارہ فتح گڑھ صاحب

ایک تاریخی واقعے کی یادگار عمارت: فتح گڑھ پنجاب کا ایک ضلع ہے،اس میں سرہند نام کا ایک قصبہ ہے۔ پٹیالہ شہر سے اس کا فاصلہ 40 کلومیٹر ہے اور چندی گڑھ سے یہ مغرب میں 42 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ میں نے پچھلے صفحات میں وزیر خان کے حکم پر گورو گوبند سنگھ کے بچوں کو دیوار میں چنوانے کے واقعے کا ذکر کیا ہے، فتح گڑھ کا نام ان کے چھوٹے بیٹے فتح سنگھ کے نام پر رکھا گیا جس کی عمر چھ سال تھی اور اس کے بھائی زوراور سنگھ کی عمر نو برس تھی۔اب یہ سکھ مذہب کی ایک اہم زیارت ہے۔سکھوں نے 9 دسمبر 1705ء کو اس واقعے کے بعد اس جگہ کو فتح گڑھ کا نام دے کر 1843ء میں یہاں ایک بڑا گردوارہ بنایا گیا۔اس شہر میں سکھوں کے اور بھی کئی بڑے گردوارے ہیں۔ہم اس کے صدر دروازے کے پاس پہنچ کر اپنے ہاتھ منہ، پاؤں دھو کر سر پر کپڑا رکھ کر گردوارے میں داخل ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت (یعنی آج سے 25 سال قبل) صحن میں دھوپ سے بچاؤ کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ ابھی حال ہی میں میں نے کچھ ویڈیوز دیکھی ہیں جس میں دھوپ سے بچنے کے لیے ایک شیڈ دکھائی دیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کا مہینہ بھی ہم ایک طرف سے گزر کر آگے گئے جہاں مجھے دو سکھ ملے۔ وہ اسی لہجے میں بات چیت کر رہے تھے جو میرے بزرگوں کا تھا۔ایک مدت بعد مجھے وہ لہجہ سننے کو ملا تھا۔اب ہمارا لہجہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، فیصل آباد اور پھر لاہور میں رہ کر کافی بدل گیا ہے۔ یہ لہجہ پنجاب کے دوسرے پنجابی لہجوں سے کافی مختلف ہے۔ہم ہال کے اندر چلے گئے۔حسب توقع بہت صفائی ستھرائی تھی۔ اس وقت بہت کم لوگ تھے۔ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے ایک ہال میں چلے گئے۔ایک صاحب نے ہماری راہ نمائی فرمائی اور وہ دیوار بھی دکھائی جہاں بچوں کو زندہ دفن کیا گیا تھا۔اس وقت دیوار میں وہ جگہ ایک

بڑی کھڑکی کی مانند تھی، جہاں ایک بڑا چوکور سوراخ تھا۔ اب جو میں نے کچھ وڈیوز دیکھیں ان میں مجھے وہ کھڑکی نظر نہیں آئی بلکہ کچھ اور چیزیں رکھی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ پرمیندر سنگھ کے لیے یہ بہت ہی سنہری موقع تھا۔ اس نے بہت ادب سے سب چیزوں کو دیکھا اور بہت خوش ہوا کہ اس دورے میں اسے سکھوں کے ایک مقدس گردوارے جانے کا بھی موقع ملا۔ میں بھی تاریخی مقامات کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ میرا ماننا ہے کہ عمارتیں غلط بیانی نہیں کرتیں۔ کتاب میں غلط لکھا ہو سکتا ہے۔۔۔ لیکن عمارت جو بات بیان کرتی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ اینٹوں کی زبان میرے نزدیک کتابوں کی زبان سے زیادہ معتبر ہوتی ہے۔

اب اس شہر میں گروگرنتھ صاحب یونیورسٹی اور بابا بندہ سنگھ بہادر انجینئرنگ کالج جیسے تعلیمی ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں۔ کسی بھی سیاسی یا مذہبی راہ نما کی یاد میں کسی تعلیمی ادارے کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ ان کے ماننے والوں نے اپنے لیڈر یا گورو کو تعلیم سے جوڑا ہے۔

استاد شاگرد کا مقبرہ

روضہ شریف کے مغرب میں ایک کلومیٹر کے فاصلے پر دو مقبرے موجود ہیں یہ عام طور پر استاد صیاد خان اور ان کے شاگرد کے مقبروں کے نام سے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان عمارتوں کو ان کی زندگی کے دوران، سولھویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ دونوں کے درمیان تقریباً دو سو میٹر کا فاصلہ ہے۔ یہ دونوں مزار فنِ تعمیر کے ایک شاہکار کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ قدیم اور تاریخی یادگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہاں اردگرد کئی مشہور اور تاریخی عمارتیں موجود تھیں جن میں سے چند ایک کا ذکر پیشِ خدمت ہے۔

عام خاص باغ، میر میراں کا مقبرہ اور حویلی دیوان ٹوڈرمل، المعروف جہاز حویلی، برگد (بوہڑ) کے قدیم درخت۔

سرہند میں ایک اہم تاریخی مقام عام خاص باغ بھی ہے۔ اس باغ سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ باغ مغل بادشاہوں کے لیے ایک سرائے کا کام کرتا تھا۔ بادشاہوں کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی

اسے استعمال کرتے تھے۔اس باغ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ ایک طرح سے مغل بادشاہوں کا گیسٹ ہاؤس تھا جو وہ دہلی اور لاہور کے درمیان سفر کرتے ہوئے استعمال کرتے تھے۔اس شاہی سرائے کی تعمیر کا آغاز اکبر کے دور میں ہوا۔ یاد رہے کہ زمانہ قدیم سے قائم جی ٹی روڈ سرہند سے ہی ہوکر گزرتی تھی، اس لیے اسے ایک فوجی روٹ کی حیثیت حاصل تھی۔اس باغ میں ایک عجیب وغریب سردخانہ بھی بنایا گیا تھا، جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔اس کے علاوہ یہاں پرفواروں کا انوکھا نظام بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک وسیع رقبے پر باغ بھی موجود تھا۔اب اس کا انتظام حکومت پنجاب کے پاس ہے۔

ہم اس باغ کے اندر تو نہ جا سکے لیکن اسے دور سے ضرور دیکھا۔میری یادداشت کے مطابق میرے بزرگ جن مقامات کا کثرت سے ذکر کیا کرتے تھے،ان میں یہ جگہ بھی شامل تھی۔

عام خاص باغ سے پانچ کلومیٹر شمال میں میر میراں نامی ایک مقبرہ بھی موجود ہے۔عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ مقبرہ اس علاقے میں پتھر سے بنائی گئی واحد اہم عمارت ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ میر میراں ایک صوفی تھے جو اس علاقے میں رہتے تھے۔ان کی شادی بہلول لودھی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔بہلول لودھی ایک بڑی سیاسی شخصیت تھے۔اس مقبرے کے پاس ایک تالاب بھی ہے۔جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہلول کی بیٹی نے اپنے شوہر کی موت کے بعد تعمیر کروایا تھا۔سلطان بہلول کو سرہند میں ہی تاج پہنایا گیا تھا۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاست کا والی بھی ہوگا۔میر میراں کی وفات کے بعد موجودہ مقبرہ بہلول لودھی نے تعمیر کیا جسے میر میراں کا مزار کہا جاتا ہے۔

دیوان تو ڈرمل سرہند کے مغل نواب،وزیر خان کے دربار میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔اس کا تعلق ایک ہندو گھرانے،اگروال سے تھا۔ان سے متعلق ایک تاریخی واقعہ بہت مشہور ہے جس کی مثال ملنا تقریباً ناممکن ہے۔

تاریخی واقعات کے مطابق جب وزیر خان نے گورو گوبند سنگھ کے بچوں کو دیوار میں چنوا کر مار دیا تو اس دوران ان کی دادی بھی مرگئی۔ان کی لاشوں کی آخری رسومات

ادا کرنے کے لیے وزیر خان نے کوئی بھی جگہ دینے سے انکار کر دیا تو ٹوڈرمل نے زمین خرید کر آخری رسومات ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔اس کام کے لیے اس نے بہت بڑی قیمت پر زمین کا ایک چھوٹا ٹکڑا خریدا۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آخری رسومات ادا کرنے کے لیے اس سے مہنگی زمین آج تک نہیں خریدی گئی۔

کہتے ہیں کہ وزیر خان نے کہا کہ سونے کے سکوں کو کھڑی حالت میں جوڑا جائے اور اس طرح جتنی زمین پر وہ سکے پھیل جائیں گے اتنی زمین آخری رسومات ادا کرنے کے لیے دے دی جائے گی۔پھر ایسا ہی ہوا۔ٹوڈرمل نے یہ قیمت ادا کی اور ایک جگہ خریدی تا کہ بچوں اور ان کی دادی کی آخری رسومات ادا کی جائیں۔ٹوڈرمل کے اس کام کی وجہ سے وقتی طور پر تو وزیر خان نے زمین دے دی لیکن بعد میں سزا کے طور پر ٹوڈرمل خاندان کی تمام تر جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اسے ہر چیز سے محروم کر دیا۔اس وقت سے اس کی حویلی (جسے جہاز حویلی بھی کہتے ہیں) آج بھی موجود ہے۔

آج اس جگہ پر گردوارہ جیوتی موجود ہے۔دونوں گردواروں کو ملانے والی سڑک کو دیوان ٹوڈرمل روڈ کہا جاتا ہے۔ ہم اسے بھی دور سے ہی دیکھ سکے۔آج بھی سکھ ٹوڈرمل کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ان کی یاد میں دیوان ٹوڈرمل میموریل ہال بھی بنایا گیا ہے۔

یہ ایسے تاریخی واقعات ہیں جنھیں تسلیم کرنا تو مشکل ہے ہی لیکن جھٹلانا بھی ناممکن ہے۔

فتح گڑھ صاحب کے پاس ہی چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قدیم برگد کا درخت ہے۔کچھ لوگوں کے بقول یہ درخت دنیا کے بڑے اور قدیم درختوں میں سے ایک ہے۔ یہ چار ایکڑ پر پھیلا ہوا صدیوں پرانا درخت ہے جو اب بھی پھیل رہا ہے۔اس کے پھیلاؤ کو کوئی بھی نہیں روک سکتا۔عام لوگ اسے ایک مقدس درخت مانتے ہیں۔ہم کافی دیر تک وہاں پر رکے اور پھر واپسی کا سفر اختیار کیا۔اب ہمارا سفر اس محلے کی طرف تھا جسے منصوری ٹبہ کہتے ہیں۔میرے والد صاحب کی پیدائش اس محلے میں واقع ایک گھر میں ہوئی۔ جسے میرے والد نے شدید بیماری کی حالت میں خدا حافظ کہہ کر روضہ شریف میں پناہ لی اور پھر ایک ریل میں سوار ہو کر ایک انجان ملک اور ان

دیکھی دنیا کی طرف اپنی جان بچانے کے لیے سفر شروع کر دیا۔ یہ میرا بھارت کے دورے کا وہ دن تھا جس کی آس لیے میرے بزرگ روتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن اس سے پہلے آپ کے لیے سرہند اور ریاست پٹیالہ کی تاریخ کا جاننا بے حد ضروری ہے۔

سرہند

ایک تابناک ماضی لیے ہوئے: سرہند، فتح گڑھ صاحب کا پرانا نام ہے۔ یہ دہلی سے لاہور جانے والی سڑک، جی ٹی روڈ پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ 250 کلومیٹر جبکہ لاہور سے دوسو کلومیٹر کے قریب ہے۔ اب یہ پنجاب کے ضلع فتح گڑھ صاحب کا ضلعی صدر مقام ہے۔ اس کے نام کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس علاقے میں ساہرند اس نامی کوئی قبیلہ رہتا تھا جس کا ذکر ساتویں صدی کے دوران ہندوستان کا دورہ کرنے والے چینی سیاح ہی وین سانگ نے بھی کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وسطی ایشیا سے آنے والے لوگ اسے ہند کا سرا بولتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کا نام سرہند ہو گیا۔

ہندوشاہی کے دورِ حکومت میں یہ شہر ان کی مشرقی سرحد پر واقع ایک اہم چوکی تھا۔ غزنوی کے حملوں کی وجہ سے ہندوشاہی کا دارالحکومت سرہند منتقل کر دیا گیا۔ غزنوی کے بعد یہ شہر چوہانوں کے قبضے میں آ گیا۔ غوری کے حملوں کے وقت دہلی کے آخری راجپوت حکمران پرتھوی راج چوہان کے دورِ حکومت میں بھی دفاعی نقطہ نظر سے یہ شہر ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ سلاطین دہلی بھی اس شہر کی اہمیت سے واقف تھے۔ فیروز شاہ نے اس علاقے کو سیراب کرنے کے لیے ستلج سے ایک نہر بھی کھدوائی تھی۔ کسی دور میں بہلول خان لودھی، جو ملک سلطان شاہ لودھی کا گورنر تھا، وہ اس علاقے میں سلطان کا لقب استعمال کرتا تھا۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں تین سو سے زائد مساجد، باغات، مقبرے، کارواں سرائے اور کنویں تھے۔ یہ شہر کتنی بار اجڑا، کسی کو علم نہیں۔ میرے بزرگ بتاتے تھے کہ اس شہر میں جس کسی نے بھی کوئی عمارت بنانا ہوتی تو وہ شہر سے باہر ویرانے میں چلا جاتا جہاں تھوڑی سی کھدائی کے بعد اسے بے شمار اینٹیں مل جاتیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس

شہر کے ارد گرد بے شمار کھنڈرات پائے جاتے تھے۔مغلیہ سلطنت کے دور میں سرہند، دہلی اورلاہور کے درمیان ایک مضبوط قلعہ بند شہر تھا۔تجارتی نقطہ نظر سے بھی یہ شہر کافی اہمیت رکھتا تھا۔ پورے ہندوستان میں اس شہر کی عمارتوں کا کوئی ثانی نہ تھا۔شہنشاہ جہانگیر نے بھی سرہند کے کئی دورے کیے اور شہر کی خوب صورتی میں اضافہ کیا۔اس وقت سرہند سرکار کا دائرہ آنند پور تک پھیلا ہوا تھا جو سترھویں صدی کے آخری سالوں میں گرو گوبند سنگھ کا گڑھ تھا۔سرہند مغلیہ سلطنت کی ایک اہم فوجی چھاؤنی بھی تھا۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ 1555ء میں ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے بیٹے کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ سرہند ہی میں لڑی۔جس میں اسے فتح حاصل ہوئی اور مغلیہ سلطنت کا دور ایک بار پھر سے شروع ہوا۔مغلیہ سلطنت کے دوران اس کی خوشحالی کی وجہ سے اسے ایک اہم مقام حاصل تھا۔مغلوں کو اس علاقے سے سب سے زیادہ آمدنی حاصل ہوتی تھی۔شہنشاہ شاہجہاں نے ہی عام خاص باغ کی تعمیر کا آغاز کیا تھا۔

گرو گوبند سنگھ کی موت اور اس کے بچوں کو دی جانے والی سزا نے سکھوں میں انتقام کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔ان لوگوں نے انتقام لینے کے لیے بندہ سنگھ بہادر کی سربراہی میں جمع ہو کر سرہند پر زبردست حملہ کیا۔1710ء کی لڑائی میں وزیر خان مارا گیا اور سکھوں نے سرہند پر قبضہ کرلیا اور بھائی باج سنگھ کو گورنر مقرر کیا۔تاہم کچھ عرصے بعد مغل افواج نے اس شہر پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔دریائے راوی اور جمنا کے درمیانی تمام علاقے بابا بندہ سنگھ بہادر کی ریاست میں شامل تھے۔وہ اپنے وقت کی ایک بڑی ریاست تھی۔میرے علم کے مطابق سکھوں کی اس سے بڑی ریاست نہ اس سے پہلے تھی اور نہ ہی بعد میں کبھی ہوئی۔ویسے تو سکھ ریاستیں موجود تھیں لیکن وہ بہت چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1748ء میں ابدالی نے بھی سرہند پر قبضہ کیا لیکن وہ ایک عارضی قبضہ تھا۔پھر ایک وقت آیا کہ سکھوں اور مراٹھوں نے مل کر سرہند میں موجود ابدالی کے نامزد کردہ گورنر، شہزادہ تیمور ولد احمد شاہ کو پنجاب سے باہر نکال دیا۔انھی لوگوں کا پیچھا کرتے ہوئے

مراٹھے پشاور تک گئے تھے۔ جب 1761ء میں احمد شاہ نے پانی پت میں مراٹھوں کو شکست دی تو اس سے سکھوں کو شدید دھچکا لگا لیکن جلد ہی 1762ء میں سکھوں نے سرہند پر حملہ کر دیا۔ فوج دار، زین خان نے ایک بڑی رقم دے کر اپنی جان چھڑوائی لیکن دو سال بعد ہی 1764ء میں سردار جسا سنگھ آہلوالیہ نے سرہند پر ایک اور حملہ کر دیا۔ اس بار زین خان مارا گیا اور سرہند پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ شہر کو اجاڑ کر امرت سر میں واقع مقدس مقامات کی مرمت اور تعمیر کی گئی۔

یہ شہر کئی سال تک سکھوں، مغلوں اور ابدالیوں کے درمیان فٹ بال بنا رہا۔ جو بھی آیا اس نے اس کی تباہی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سکھوں کو اس شہر سے بے انتہا نفرت تھی جس کی وجہ بچوں کے ظالمانہ قتل کا واقعہ تھا۔ اس لیے سکھوں نے فتح حاصل کرنے کے بعد شہر میں واقع تاریخی یادگاروں کو بارود سے اڑا دینے کا حکم دیا کیونکہ سکھ اس جگہ کی اینٹیں بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ تباہ شدہ ڈھانچوں سے اینٹیں لے کر دریائے ستلج میں پھینکتے اور اسے ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ایک یورپین سیّاح نے (جو 19ویں صدی میں یہاں سے گزرا) لکھا ہے کہ اس نے اس سے زیادہ کھنڈرات ہندوستان بھر کے کسی دوسرے شہر میں نہیں دیکھے۔

میرے بزرگوں کے دیس، مجدد کی بستی۔۔۔ سرہند شریف کے ساتھ جو ہوا۔۔۔ بہت برا تھا۔

ایک مدّت تک یہ شہر خالصہ دل کے مختلف سرداروں کے قبضے میں رہا لیکن اس شہر میں سکھ بچوں پر ہونے والے ظلم کی وجہ سے سکھ اس شہر کو منحوس ہی سمجھتے تھے لہٰذا کوئی بھی سکھ سردار اس کا والی بننے کو تیار نہ تھا۔ آخر کار اسے ایک سردار کے حوالے کر دیا گیا جو بھائی بگھاٹو کی اولاد میں سے تھا۔ اسی دور میں کئی سکھ ریاستیں بھی قائم ہوئیں جن میں ایک ریاست پٹیالہ بھی تھی، جس کا بانی سردار اعلیٰ سنگھ تھا۔ وہ ریاست آزادیِ ہند تک برقرار رہی۔

منصوری ٹبہ: میرے والد کی جائے پیدائش

میرے بزرگوں کے مطابق ہمارا آبائی گھر سدھنا قصائی کی مسجد کے پاس منصوری ٹبہ نامی محلے میں تھا۔ ہم نے ایک صاحب سے اس کا پتا معلوم کیا اور اس محلے کی طرف چل پڑے۔ وہ محلہ روضہ صاحب کے جنوب مغرب میں دو سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہمارے گھروں

کے پاس ہی چار سو سالہ پرانی مسجد، جس کا نام سدھنا قصائی کی مسجد ہے، بھی موجود ہے۔ ہم سدھنا قصائی کی مسجد کے پاس سے گزرے تو ہم نے بائیں جانب ایک بڑا سا درخت دیکھا۔ اس درخت کا ذکر میرے بزرگ اکثر کرتے تھے۔ ہم اس کے پاس سے گزرے تو سامنے ایک گلی تھی۔ اس گلی میں ہمارا گھر تھا۔ کون سا تھا؟ وہ معلوم کرنا باقی تھا۔

میرے والد صاحب نے جن کی وفات 1998ء میں ہوگئی تھی (اور ہم یہ سفر 2000ء میں کر رہے تھے) مجھے بتایا تھا کہ ان کے ایک ہندو دوست بھی ان کے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ مجھے ان کا نام یاد تھا۔ ان کے نام کا آخری حصہ سیٹھ تھا۔ ہم اپنی گلی میں پہنچ گئے۔ اتنی دیر میں ایک صاحب (جن کی عمر کوئی پچاس بچپن سال ہوگی) سے ہم نے پوچھا کہ اس محلے میں مسلمانوں کے گھر کون سے تھے؟ جس پر انھوں نے کہا کہ جہاں آپ کھڑے ہیں یہ گھر مسلمانوں کے ہی تھے۔ مین گلی کے اندر ایک چھوٹی سی گلی اور بھی موجود تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ علی بخش کا گھر کون سا تھا؟ اس پر انھوں نے کہا کہ کیا آپ علیہ موجی کا پوچھ رہے ہیں۔ علیہ میرے دادا کے والد علی بخش کا عرفی نام تھا اور ہمارا خاندان موجی کے نام سے مشہور تھا۔ دیہات میں اب بھی خاندان کسی ایک منفرد نام سے پہچانے جاتے ہیں جیسے نمبرداروں کا گھر، کونے والے، تالاب والے وغیرہ۔ میں نے جواب میں کہا ہاں میں انھی کا پوچھ رہا ہوں۔ جس پر انھوں نے بتایا کہ چھوٹی گلی کی نکڑ پر واقع کونے والا گھر اور اس کے سامنے والا گھر علیہ موجی کا ہی تھا اور اس گلی کے سرے پر واقع گھر بھی ایک مسلمان کا ہی تھا۔ یہ گلی آگے سے بند تھی۔ اس میں یہ تین ہی مکانات تھے۔ آمنے سامنے والے ہمارے جبکہ آخر میں ہمارے ایک رشتہ دار کا گھر تھا۔

گھر تو گھر ہوتا ہے۔۔۔ میں کچھ لمحے اس گھر کو کھڑا دیکھتا رہا۔ مجھے بتایا گیا کہ اب اس گھر میں ایک ہندو خاندان آباد ہے جو پاکستان سے نقل مکانی کر کے آیا تھا۔ کچھ عرصے قبل ہی اس کی چھت اور دروازوں کی مرمت کی گئی تھی۔ باقی در و دیوار ویسے ہی تھے۔ میں نے اپنے والد صاحب کے دوست کا پوچھا تو پتا چلا کہ وہ بھی دنیا چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا یار یعنی میرے والد بھی دنیا چھوڑ چکے تھے۔ اس لیے ان کو اپنے والد کا سلام نہ پہنچا سکا اور نہ ہی ان کا حال چال پوچھ سکا۔

یہ سب جان کر میں تصور ہی تصور میں 53 سال پیچھے چلا گیا۔ جب وہ، جن کا یہ گھر تھا، یہ گھر ۔۔۔ چھوڑ کر کہیں دور ریل کی پٹڑی کنارے ایک جھگی میں جا بسے تھے، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے فیصل آباد جانے والی ریل کی پٹڑی کے بیرونی سگنل کے قریب۔

کیسے چھوڑا، کیوں چھوڑنا پڑا، اس شہر میں آج بھی لوگ ہمارے خاندان کو اسی نام سے جانتے ہیں، اس شہر میں مسلمان تو آج بھی بستے ہیں، میرا خاندان کیوں نہ اپنے صدیوں پرانے محلے میں رہ سکا، وہ کئی مربع زمین کے مالک تھے، مالی آسودگی تھی، ان وقتوں میں وہ ہر سال زمین یا مکان خریدتے تھے، آٹھ جوان بھائی تھے، شہر بھر میں ایک باعزت خاندان تھا؟

اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ خوشحال تھے اور ان کی دولت پر کچھ لوگوں کی نظر تھی اور وہ ان کی خوشحالی کو لوٹنا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ انھیں یہاں سے نکالا جائے اور پھر نکال دیا گیا۔

میں نے بارہا اپنے بڑوں سے پوچھا ہے کہ ہجرت کی وجہ کیا تھی؟ کیا پاکستان کا مطلب کیا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، تھا؟ یا وہ واقعی کسی مسلمان ملک میں جا کر ایک اسلامی ریاست کا حصہ بننا چاہتے تھے؟ ان کا یہ جواب ہوتا تھا کہ ہم ان پڑھ دیہاتی لوگ تھے۔ ہمیں ان باتوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ ہاں صرف یہ معلوم تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ تعلیم کسی کے پاس بھی نہیں تھی۔

میں یہ پوچھتا تھا کہ پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے اپنا گھر بار چھوڑا، آپ کی بہن اور بہنوئی کو قتل کیا گیا، میرے والد صاحب کی پہلی بیوی کے ساتھ ساتھ آپ کے خاندان کی دیگر عورتوں کو بھی اغوا کیا گیا، عزیز و اقارب قتل ہوئے، گھروں پر حملے کیے گئے؟ ان کا جواب ہوتا تھا کہ سکھوں کے جتھے ہم پر ہلہ بول دیتے اور قتل و غارت شروع کر دیتے تھے۔ وہ سب کچھ بھول جاتے تھے کہ ہم ان کے ساتھ اسی شہر میں صدیوں سے رہ رہے ہیں، ہمارا دھرم مختلف تھا لیکن ہماری ذاتیں تو ایک جیسی تھیں، جیسے جاٹ اور راجپوت وغیرہ۔ تب وہ ہمیں صرف مُسلے (وہ نفرت کی وجہ سے ہمیں مسلمان نہیں بلکہ مُسلے کہتے تھے) سمجھتے تھے۔ یہی ہمارا جرم تھا۔

میں اکثر ان سے یہ بھی پوچھتا تھا کہ وہ کون لوگ تھے جو ہلہ بولتے تھے؟ کیا وہ آپ کے شہر

کے لوگ تھے؟ جواب تھا کہ نہیں۔ ہمارے اہلِ محلہ نے تو ہمیں پناہ دی تھی۔ میرے والد صاحب سخت بیمار تھے۔ ان دنوں ہماری ایک ہمسائی ہندو عورت انھیں اپنے گھر لے گئی جبکہ میرے نانا اپنے خاندان کے ساتھ ایک سال سے زائد عرصہ ایک سکھ نمبردار کی پناہ میں رہے۔ اس دوران انھیں کوئی بھی کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا سکا۔ یہ چند اوباش قسم کے لوگ تھے۔ جن میں کچھ مذہبی جنونی بھی تھے، وہ مغلیہ دور میں سکھوں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ لینا چاہتے تھے، کچھ چور اچکے بھی تھے، جو مال و دولت لوٹنا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔

میرا یہ یقین ہے کہ جو اس میں شامل نہیں تھے۔۔۔ انھوں نے بھی ان کی اگر مدد نہیں کی تو روکا بھی نہیں، جب کہ وہ روک سکتے تھے۔ ان کا نہ روکنا بھی اس سارے واقعے میں ان کی شمولیت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ بھی مسلمان آبادی کا انخلا چاہتے تھے۔ اس لیے جتھے اس مقصد کو حاصل کرنے میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ ایسا ہی پاکستان میں ہوا اور ایسا ہی بھارت میں ہوا۔

یہ میری ذاتی رائے ہے، آپ کو اس سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اس کے ثبوت میں میرے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فسادات کے دوران فسادیوں کو اس کام سے روکا جا سکتا تھا، روکا نہیں گیا، امن قائم ہونے کے بعد عارضی کیمپوں سے لوگوں کو بلا کر ان کے گھروں میں واپس لایا جا سکتا تھا، لایا نہیں گیا، تحفّظ فراہم نہیں کیا گیا، جہاں تحفظ فراہم کیا گیا وہاں سے کم لوگوں نے ہجرت کی ہے، جیسے مالیرکوٹلہ۔ جنھوں نے قتل و غارت کی، لوٹ مار کی ان پر مقدمات چلائے جا سکتے تھے۔ بیس لاکھ سے زیادہ افراد کے قتل کی ایک بھی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی، بھارت میں اور نہ ہی پاکستان میں۔ میرے پاس بس یہی دلیل ہے۔ اس قتل و غارت کا مقصد یہاں اور وہاں اقلیتوں کے صفائے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا- جو لوگ اس وقت اقتدار کے خواہاں تھے ان کی یہی منشاء تھی۔۔۔ کہ

''نہ ہوگا بانس نہ بجے کی بانسری''

پھر بانس کو جڑ ہی سے اکھاڑ دیا گیا۔۔۔۔

سرہند، جو کبھی ایک مسلمان شہر تھا، اب اس میں چند مسلمان ہی رہ رہے ہیں وہ بھی وہاں

روضہ صاحب کے اندر، لائل پور جہاں ساٹھ فیصد سے زائد ہندو اور سکھ آباد تھے وہاں تو اب ایک فیصد بھی موجود نہیں۔ جو اقلیتوں کی صفائی چاہتے تھے وہ کامیاب ٹھہرے۔۔۔

آزادیِ ہند کے وقت ہونے والے فسادات میں کسی نے بھی، وہ ہندو ہو، سکھ ہو یا مسلمان، کسی عیسائی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔۔۔ ان کو بھارت اور پاکستان (دونوں جگہ) میں کوئی بھی نقصان نہ پہنچا سکا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میرے نزدیک تو ایک ہی وجہ تھی کہ وہ انگریزوں کی سرپرستی میں تھے۔۔۔ انگریزوں کا خوف۔۔۔ آخر دونوں کا دھرم ایک تھا۔

ان کے نزدیک بیس لاکھ افراد کا قتل، کروڑوں لوگوں کی نقل مکانی، مالی نقصان، جس کا کوئی اندازہ نہیں، دو ہمسائیوں کے درمیان نفرت کی ایک مستقل دیوار، کئی جنگیں اور معاشرتی تقسیم کچھ بھی معنی نہیں رکھتا۔ اوپر سے یہ سب جن کے ساتھ بیتا، انھیں یہ کہہ کر چپ کروایا جاتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کی آزادی آپ کی انھی قربانیوں ہی کا نتیجہ ہے۔۔۔

ہم بھی چپ رہے

''کیونکہ ریاست کی یہی خواہش تھی''

حالانکہ جب بیس لاکھ انسانوں کا قتل ہوا اور تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی ہوئی تو اس وقت ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ قربانی تو آزادی سے پہلے دی جاتی ہے۔۔۔ بعد میں تو بٹوارا ہوتا ہے۔۔۔ جو بھی ہوا۔۔۔

ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا!

اور نہ ہی مستقبل میں ایسا ممکن ہے!

سیانے کہتے ہیں کہ راجے تو بدلتے رہتے ہیں راج (رعایا) نہیں۔۔۔

لیکن اب کی بار راجہ نہیں بدلا بلکہ راجاؤں نے راج بدل لیا۔۔۔

کچھ کو نکال دیا اور کچھ کو اپنے پاس بلا لیا!

یہ کس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کیا گیا۔۔۔ آج بھی لوگوں کو معلوم ہے۔۔۔ لیکن ابھی تک خاموشی نہیں ٹوٹی۔۔۔ کب ٹوٹے گی۔۔۔ وہ وقت دور نہیں۔

میں نے انھی سوچوں کے ساتھ اپنے والد کی جائے پیدائش کو دیکھااور دیر تلک دیکھتا رہا۔۔۔ پلک جھپکے بغیر۔۔۔تا کہ اس گھر (جو چند لمحوں کے لیے ایک مکان سے گھر میں تبدیل ہو گیا تھا، کا عکس تادیر میرے ذہن میں نقش رہے۔ اب بیس سال بعد گلی کی نکڑ والا گھر، ہلکے پیلے رنگ کا) ہلکے سبز رنگ کے دروازے، سامنے والا گھر بغیر پلستر کے اور میرے ساتھ باتیں کرنے والا ایک درمیانے قد کاٹھ کا ادھیڑ عمر شخص، اس کی باتیں، میرے دادا کے والد کو ان کے عرفی نام سے جاننے والا شخص۔۔۔

مجھے یاد ہے وہ سب ذرا ذرا۔۔۔

مومن خان مومن نے جو کہا ہے وہ یہاں پر بھی کہا جا سکتا ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر، وہ کرم کہ تھا میرے حال پر
مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے جو سب میں روبرو، تو اشاروں ہی میں گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم، تو وفا جتانے کو دم بہ دم
گلہ ملامتِ اقرباء، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی ایسی بات ہوئی اگر کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہمیں ایک گاؤں بھی جانا تھا اس لیے ہم زیادہ دیر رکے بغیر اس گلی سے آ گئے ۔۔ جہاں میرے والد ایک مرتبہ دلہا بھی بنے تھے ۔۔۔ نکاح بھی ہوا ۔۔۔ رخصتی نہ ہو سکی ۔۔۔ اور ان کی منکوحہ کو ایک سکھ نے زبردستی اپنی بیوی بنا لیا ۔۔۔

اس موقع پر پنجاب کی اک دھی امریتا پریتم کے الفاظ پھر یاد آئے ۔۔۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتھوں قبراں وچوں بول

تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول

یہ سب سوچ کر میں یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ

تم کیا جانو سردیوں کے تنہا چاند کا دکھ!

چند قدم چلنے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر مڑ کر دیکھا ۔۔۔ کہ کہیں گلی کا کوئی کونا ایسا نہ رہ جائے جسے میں دیکھ نہ پاؤں ۔۔۔ پھر گلی کا موڑ آ گیا ۔۔۔ اور سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سدھنا قصائی مسجد کی تعمیر نو

ابھی حال ہی میں چند ایسے واقعات ہوئے ہیں جن کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

کچھ لوگوں نے مل کر فیس بک پر ایک پیج انڈیا پاکستان ہیری ٹیج کے نام سے بنایا ہے۔ اس پر بھارت اور پاکستان سے لوگ ہجرت کے واقعات لکھتے رہتے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی مفید پیج ہے۔ میں نے اس پر لکھا کہ کوئی ہے جس کا تعلق سرہند سے ہو۔ ایک صاحب جن کا نام سنی سوری ہے وہ سرہند کے رہنے والے ہیں لیکن اس وقت وہ کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ ان سے میرا رابطہ ہو گیا۔ میں نے سوری صاحب سے اپنے آبائی گھر اور سدھنا قصائی کی مسجد کی تصاویر منگوائی جو انھوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعے بھجوا دیں جن سے مجھے موجودہ صورت حال سے آگاہی ہوئی۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں مسجد کی مرمت کروانے کی کوشش کروں، جو ویران پڑی ہے، اور اگر یہ اسی طرح پڑی رہی تو ایک دن یہ کھنڈر بن جائے گی۔

میں نے اس کام کے لیے کئی لوگوں سے رابطہ کیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ میرے آباؤ اجداد شیخ احمد سرہندی کے خانوادے کے ذریعے ہی مسلمان ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں میں

نے پیر غلام مجدد سرہندی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ کوئی ایسا شخص ہو جو اس سلسلے میں میری رہنمائی کر سکے۔ انھوں نے شیخ احمد سرہندی کے مزار کے انچارج سید شعیب سے رابطہ کرنے کے لیے کہا۔ میں نے سید صاحب سے رابطہ کیا انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ مسجد گورنمنٹ کے ایک محکمے کے پاس ہے۔ میں ان سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔ انھوں نے محکمے کے ذمہ داران سے بات کی، انھوں نے کہا کہ یہ مسجد سرکاری تحویل میں ہے، اس لیے اس کی مرمت ہم خود کریں گے۔ اس طرح سے انھوں نے مسجد کی مرمت کا کام شروع کر دیا۔ سید صاحب نے اس کی مجھے تصاویر بھی بھجوائیں۔

البتہ افسران نے یہ کہا کہ مسجد میں کوئی سامان دینا چاہیں تو وہ ہم لے سکتے ہیں۔ اب مسجد کی مرمت کا کام جاری ہے۔ مرمت مکمل ہو گی تو پھر اس میں کوئی سامان دینے کی باری آئے گی۔

اس طرح سے میری نیت کی وجہ سے ستر سال سے زائد عرصے سے بند مسجد کی مرمت کا کام شروع ہوا۔ ایک صاحب جو اس مقام کے انچارج ہیں اور مسلمان ہیں، سید صاحب نے ان سے بات بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ ابھی کچھ دیر سے کام بند ہے لیکن جلد ہی دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ وہ صاحب کبھی کبھی اس مسجد میں نماز بھی پڑھ لیتے ہیں اس طرح سے ستر سال سے زائد عرصے کے بعد اس سدھنا قصائی کی مسجد میں نماز کی ادائیگی شروع ہوئی۔

سدھنا قصائی کی مسجد جس کا نام ایک صوفی کے نام پر رکھا گیا: جس محلے میں ہمارے گھر تھے وہیں پر سدھنا قصائی کی مسجد بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مسجد بالکل ویران تھی۔ کھنڈر بتا رہے تھے کہ عمارت تو خوب ہو گی۔ ایک ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی وہ مسجد، بڑے عالی شان گنبد، وسیع و عریض صحن اور ساتھ میں ایک تالاب اس بات کا پتا دے رہے تھے کہ وہ ایک عظیم مسجد تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اتنی بڑی مسجد اسی علاقے میں بنائی جاتی ہے جہاں اسلام کے ماننے والوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہو۔ اس کی ویرانی بھی یہی بتا رہی تھی کہ اب اس علاقے میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے ورنہ مسجد کی یہ حالت نہ ہوتی۔ میں نے حال ہی میں فیس بک (Face-book) پر بنے ایک گروپ India Pakistan heritage club کی مدد سے

سنی سوری صاحب سے رابطہ کیا۔ تو انھوں نے ہمارے محلے اور سدھنا قصائی کی مسجد کی ایک ویڈیو بھیجی۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسجد اب بھی ویران ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ سے آباد کرے اور یہ کام میرے ہاتھوں ہو۔ میں نے اس کام کے لیے کوشش شروع کر دی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اس میں کامیاب کرے۔ آمین!

میں نے اس بات کا کھوج لگانے کی بے حد کوشش کی کہ یہ جان سکوں کہ سدھنا قصائی کون تھا اور اس کے نام پر آج سے چار سو سال پہلے یہ مسجد کیوں بنائی گئی اور سے کس نے بنوائی؟ مجھے جو پتہ چلا وہ بہت مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ چار سو سال قبل جب اس علاقے پر مغل حاکم تھے تو سدھنا قصائی یقینی طور پر ان کے دربار سے منسلک ہی کوئی شخص ہوگا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے بھی یہ جاننے کی کوشش کی لیکن کچھ خاص معلومات نہ مل سکیں۔ جو بات مجھے پتہ چلی اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے لیے بھی وہ حیران کن ہوگا۔

سدھنا 1180ء میں سہون سندھ میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤاجداد پیشے کے لحاظ سے قصاب تھے۔ اس لیے انھیں بھی سدھنا قصائی کہا جانے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی دکان کے قریب سایہ دار درخت اور پینے کے پانی کی سہولت موجود تھی۔ اس وجہ سے گاہکوں کے علاوہ مسافر، صوفی، جوگی، غرض ہر طرح کے لوگ اس سے مستفید ہوتے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے شروع ہی سے ایسے کاموں میں دلچسپی تھی۔ اس دوران ہندوؤں سے اس کی ایک بحث بھی چھڑ گئی۔ ہندوؤں کے نزدیک گوشت کا کام ایک پاپ تھا۔ اس لیے وہ سدھنا قصائی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ہندوؤں کو یہ کہتا تھا کہ پتھر خدا نہیں ہیں کیونکہ یہ بے جان ہیں اور کسی جاندار کو کوئی راہ نمائی فراہم نہیں کر سکتے۔ روحانی تسکین کی خاطر اس نے سہون کو چھوڑا کر خدا کی محبت کی تبلیغ کرنے والے ایک جوگی کا روپ اختیار کر لیا اور چلتا چلتا سرہند آ گیا۔

جب سدھنا قصائی جوان تھا اور مضبوط جسم کے ساتھ اچھی صورت کا بھی مالک تھا تو ایک دفعہ شمالی ہندوستان میں سفر کے دوران ایک برہمن عورت نے اس کے ساتھ تعلقات استوار کرنا چاہے، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ عورت نے اپنی شکست دیکھ کر سدھنا قصائی پر الزام لگایا۔

عدالت قائم کی گئی۔ جج نے سدھنا قصائی کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور ان کے ہاتھ کاٹ دیے گئے۔ کہتے ہیں کہ کچھ عرصے بعد ان کے جسم سے دوبارہ ہاتھ نکل آئے۔ جس پر لوگ انھیں ایک ولی کا درجہ دینے لگے۔ اب وہ ایک سنت یا صوفی کے طور پر مشہور ہو گئے لیکن وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے سرہند آنے کا فیصلہ کیا۔

مجھے یہ بھی جاننے کا موقع ملا کہ سدھنا قصائی نے ست گورو رویداس جی مہاراج کے مذہب میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس فرقے کا تعلق سکھ مذہب سے ہی جوڑا جاتا ہے۔ مجھے اس کی تفصیل تو نہ مل سکی لیکن ایک بات کا ضرور پتہ چلا کہ سدھنا قصائی کی کہی ہوئی کئی باتیں سکھوں کی مذہبی کتابوں کے علاوہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ میں مذہبی معاملات میں بات کرتے ہوئے خاصی احتیاط کرتا ہوں لیکن پھر بھی اگر کوئی خلافِ واقعہ بات ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں اور اپنی بات کی تصحیح کرنے کے لیے تیار ہوتا ہوں۔

یہ بات تو مجھے معلوم ہو گئی کہ سدھنا قصائی کون تھا لیکن اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مسجد کس نے بنائی اور اس کا نام سدھنا قصائی مسجد کیوں رکھا گیا؟ یہ سوال ابھی تک تشنہ ہے۔ آپ کو بھی اگر کوئی بات معلوم ہو تو ضرور آگاہ کریں۔ ایک صاحب (جن کا نام سبھاش پریہار ہے) نے ایک کتاب میں یہ لکھا کہ اس مسجد کی تعمیر کی کڑیاں دہلی میں نظام الدین سے ملتی ہیں۔ جس سے لگتا ہے کہ یہ مسجد سلاطین دہلی کے آخری دور میں خلجی یا تغلق خاندان سے تعلق رکھنے والے کسی بادشاہ کے زمانے میں بنائی گئی۔ مغلیہ دور میں اس شہر میں صرف باغ اور سرائے ہی ملتے ہیں۔

میں نے سید صاحب سے یہ بھی کہا کہ آپ ہمارے گھر کا بھی حال پوچھ کر بتائیں۔

وہ ہمارے محلے میں گئے جو لوگ ہمارے گھروں میں رہتے رہے ہیں ان سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے ان سے بات کی۔ ابھی بھی میرا ان سے رابطہ ہے۔ وہ اس وقت تک لائل پور یعنی موجودہ فیصل آباد سے نقل مکانی کر کے سرہند جا پہنچے تھے۔ وہاں اس خاندان کو لائل پوریا کہا جاتا ہے جب کہ ہم سرہند سے آ کر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہوئے، جس کی وجہ سے ہمیں سرہندی کہا جاتا ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ وہ لوگ جو ہمارے گھر میں رہ رہے ہیں وہ ضلع لائل پور سے

گئے تھے اور ہم سرہند سے آ کر ضلع لائلپور کی ایک تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہوئے۔

یہ سب ہجرت اور نقل مکانی کی وجہ سے ہوا، اس کی وجہ پنجاب کا بٹوارا بنا۔

علی بخش مانگٹ: میرے دادا کی اولاد، ایک صاحب فراست اور باکردار شخص

میں اس موقع پر اپنے خاندان کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

میرے دادا کے دادا کا نام محمد بخش مانگٹ تھا ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام علی بخش مانگٹ، جن کی ہم اولاد ہیں، تھا۔ ان کے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ میرے دادا کرم الٰہی مانگٹ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ آبائی زمین چند ایکڑ تھی۔ پڑدادا اعلیٰ بخش ایک سمجھدار آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کی اچھی تربیت کی۔ زمین شہر کے قریب تھی اس لیے وہ سبزیاں کاشت کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے آمدن کافی بہتر تھی۔ اس دور میں، جب مسلمان ہندو ساہوکاروں کے مقروض تھے، انھوں نے مکان اور زمین بھی خریدی۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ نیل کی کاشت کرتے تھے۔ میں نے اپنی آبائی زمین کا کچھ حصہ دیکھا جو اب ایک شہری کالونی میں تبدیل ہو چکا ہے۔

آزادیِ ہند سے پہلے میرے دادا اور ان کے پانچ بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ دو کی شادی پاکستان آ کر ہوئی۔ دادا کی بہن اور بہنوئی کو ان کے گھر میں شہید کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے بچے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ میرے دادا اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں سمیت پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ سب لوگ سرہند شہر میں رہتے تھے جہاں سے روضہ شریف بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شہر میں رہنے والوں کا نقصان دیہات کی نسبت کافی کم ہوا۔ میرے بزرگوں نے حسین پورہ میں حافظ حلیم صاحب سے بھی ایک زمین خریدی جو ریاست پٹیالہ میں ایک ٹھیکیدار تھے اور مہاراجہ کے بھی انتہائی قریب سمجھے جاتے تھے۔

مجھے میرے چچا جمال الدین نے بتایا کہ جب ہم نے زمین خریدی سرہند کے پاس ہی ایک گاؤں میں ایک بڑا زمیندار (جس کا نام سوڈھی تھا) رہتا تھا۔ اس نے ہمارے بزرگوں سے کہا کہ آپ عدالت میں پیسے لے کر نہ آئیں۔ پیسے میں لے آؤں گا اور آپ کی جگہ پر ادائیگی

کروں گا اور پھر وہ پیسے میں بعد میں آپ کے گھر سے لے لوں گا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ جب آپ اپنے گھر سے پیسے لے کر چلیں تو کوئی ڈاکو آپ سے چھین نہ لے۔ پھر ایسا ہی ہوا، اسی نے ادائیگی کی۔

جب میں نے یہ واقعہ سنا تو مجھے احساس ہوا کہ دونوں کو کس درجے کا اعتماد تھا۔ کتنا خیال تھا کہ ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔ پھر کیا ہوا۔ سب کچھ بدل گیا۔ ایسا کہنا مناسب نہیں۔ کچھ لوگ بدلے اور انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ چور اچکے اور لفنگے تھے۔ جنھوں نے لوٹ مار کی، عورتوں کو اغواء کیا، یہاں بھی اور وہاں بھی۔

ایک کہانی اور بھی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور جذبات سے بھرپور بھی۔

ایک دن میرے دادا حضور کو پتہ چلا کہ ان کے دو بھانجوں کو، جو بہت چھوٹی عمر کے تھے اور جن کے ماں باپ کو شہید کر دیا گیا تھا، سکھوں نے پکڑ لیا ہے اور ان لوگوں نے میرے دادا کو پیغام پہنچایا کہ دو خوب صورت بیل اگر انھیں دے دیے جائیں تو ان کے بھانجوں کو واپس کر دیں گے ۔۔۔ ورنہ ان کی موت ۔۔۔۔ بھانجوں سے زیادہ کیا چیز عزیز تھی۔

تو پھر وہی ہوا بیلوں کے بدلے ۔۔۔ بھانجے ۔۔۔ سودا مہنگا تو نہیں تھا لیکن ۔۔۔ ایسا جنھوں نے کیا انھوں نے صدیوں اکٹھے رہنے کو داغ لگا دیا۔

بچوں کی جان بخش دی گئی اور وہ پاکستان آئے اور اب بھی گجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں حیات ہیں۔ بیل تو یقیناً مر گئے ہوں گے ۔۔۔ جو مان تھا وہ بھی ٹوٹ گیا ۔۔۔

میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جنھوں نے مظالم ڈھائے وہ نہ تو مسلمان تھے، نہ ہندو اور نہ ہی سکھ ۔۔۔ وہ ظالم تھے۔ ایسے لوگوں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا لیکن ایسا کرتے وقت وہ دھرم کا نام ضرور استعمال کرتے ہیں۔

دالو ماجرہ: میرے والد کا ننھیال اور پہلا سسرال

منصوری ٹبہ سے نکل کر ہماری اگلی منزل انبالہ کی طرف جانے والی سڑک (جی ٹی روڈ) فتح گڑھ صاحب سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع دالو ماجرہ گاؤں تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا

جو سڑک سے چند سو میٹر پیچھے واقع تھا۔اس گاؤں کے ساتھ بھی میرے خاندان کی ایک کہانی جڑی ہوئی ہے۔اس گاؤں میں میرے والد کی پھوپھی اوران کے خاوند کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگوں کو شہید کیا گیا تھا۔اب وہ خاندان گجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں آباد ہے۔اس گاؤں میں پیش آنے والے ایک اورواقعے کا تذکرہ کرنا مشکل ہے لیکن تاریخ بیان کرنا بھی ضروری ہے تاکہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ کیا ہوا،کس نے کیااور کیوں ہوا؟

آزادیِ ہند سے دوسال قبل میرے والد محترم اوران کے چچازاد بھائی چودھری محرم علی کی شادی چودھری برکت علی کی دو بیٹیوں ، رحموں بی بی اور ثریابی بی کے ساتھ ہوئی۔رحموں بی بی کی عمر تقریباً 18 سال تھی۔میرے والد صاحب کی عمر بیس سال کے قریب تھی جب کہ ثریابی بی کی عمر دس کے قریب اور چودھری محرم علی کی عمر تقریباً بارہ سال ہوگی۔علاقائی رواج کے مطابق پہلے نکاح کیا جاتا تھا اور پھر دو تین سال بعد رخصتی ہوتی تھی۔یہی اس دفعہ بھی ہوا۔ ہمارا سارا خاندان بارات لے کراسی گاؤں میں آیا تھا جہاں اب میں جارہا تھا۔حسب روایت نکاح ہو گئے اور رخصتی کا وقت دو تین سال بعد طے ہوا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔پنجاب کے بٹوارے کے بعد جب فسادات شروع ہوئے تو سب سے پہلے میرے والد کی پھوپھی صاحبہ اوران کے میاں صاحب کو گھر کی دہلیز پر شہید کر دیا گیا جبکہ ان کے بچوں نے بھاگ کر کسی سکھ کے گھر پناہ لی۔

مارنے والے اور پناہ دینے والے دونوں سکھ ہی تھے لیکن دونوں کے کام بے حد مختلف تھے!

اس کے علاوہ بھی خاندان کے کئی لوگوں کو شہید کیا گیا۔اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ میری دادی کے بھائی کو بھی شہید کیا گیاان کی بیوی اپنی بچیوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگی۔۔۔لیکن پیچھا کرنے والے طاقتور تھے۔۔۔اس بیچاری خاتون کے پاس اغوا ہونے سے بچنے کے لیے صرف ایک ہی راستہ بچا۔۔۔وہ تھا جوہر کی رسم۔۔۔جو ہندوستان میں صدیوں سے رائج تھی۔۔۔

شکست کی صورت میں خواتین کی اجتماعی خودکشی۔۔۔

ایک دفعہ پھر یہ رسم دہرائی گئی۔

میری دادی کی بھابی نے دیگر عورتوں سمیت اپنی چھوٹی بچی کو گود میں لے کر کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ دوسری بچی، جو ذرا بڑی تھی، ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ اسے بھی کسی رحم دل سکھ خاتون نے پناہ دی۔ بعد میں اس بچی کو میری دادی نے ہی پالا اور اپنے بیٹے، میرے چچا فضل کریم صاحب کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔۔۔

وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔۔۔ان کو تو کوئی دفنا بھی نہ سکا

میرے والد کے سسرال بھی شہید کیے جا چکے تھے اور ان کی ساس اپنی دو بچیوں کے ساتھ کوئی پناہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک سکھ نے میرے والد کی منکوحہ رحموں بی بی کو پکڑ لیا اور اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ والد صاحب کی ساس جو کوشش کر سکتی تھی انھوں نے کی لیکن ان کی بیٹی کو واپس نہ کیا گیا بلکہ اسے کسی اور کو بیچ دیا گیا اور وہ کسی نامعلوم گاؤں میں چلی گئی جس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

رحموں بی بی میری سوتیلی والدہ تھیں،

آج زندہ ہے یا نہیں اس کا کسی کو علم نہیں!

یاد رہے جو عورتیں اغوا کیے جانے کے کئی سال بعد کچھ لوگوں کی کوشش سے پاکستان آئیں۔۔۔ان میں سے اکثر کی گودوں میں سکھوں اور ہندوؤں کے بچے تھے۔

یہ بھی پنجاب کے بٹوارے کا ایک تاریک پہلو ہے۔۔۔ایسا صرف مسلمان عورتوں کے ساتھ ہی نہیں ہوا۔۔۔سکھ اور ہندو عورتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔۔۔ چند ایک کو تو میں بھی جانتا ہوں۔

میں اس گاؤں میں یہی دیکھنے گیا تھا کہ کیا یہ وہی گاؤں تھا جہاں یہ لوگ صدیوں سے اکٹھے رہ رہے تھے اور پھر وہ وقت آیا جب کچھ سکھ مسلمانوں کی جان کے دشمن ہو گئے اور کچھ سکھ مظلوموں کو پناہ دینے کا کام کرتے رہے۔

اس ہجرت کا زخم کتنا گہرا ہے، تین نسلوں کے بعد بھی اس کی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ یہ تحریر آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک قیمتی سرمایہ ہے تا کہ انھیں بھی اس بات کا احساس ہو سکے کہ ماضی میں

ایسا بھی ہوا تھا۔ایسا کیوں ہوا؟ تو شاید وہ اس کا جواب بھی تلاش کر لیں۔

لیکن اگر پتہ ہی نہیں ہوگا تو کیسا سوال اور کیسا جواب۔۔۔؟

میری ماں کا گاؤں: میری زندگی کا یادگار سفر

ہماری منزل قریب ہی واقع ایک گاؤں تھا جس کا نام نلینہ خورد تھا لیکن اسے سوڈھی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں کیونکہ جب میں بھارت گیا تھا تو میں نے اپنی والدہ محترمہ سے ان کے گاؤں کے بارے میں پوچھا تھا لیکن جب ہم نے وہاں ایک صاحب سے اس گاؤں کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا اس کا نام سوڈھی ماجرا ہے۔ جب ہم نے اسے مزید بتایا تو اس نے ہماری راہ نمائی کی اور یوں میں اس گاؤں تک پہنچ گیا جہاں میری والدہ پیدا ہوئی تھیں۔

جہاں ایک نیک دل سکھ نمبردار نے انھیں ایک سال سے زائد عرصہ تک اپنی پناہ میں رکھا تھا۔۔۔ایک سکھ نے ایک دوسرے سکھ کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل کر انھیں ایک ڈھال فراہم کی۔۔۔

جس کا ہم پر بڑا احسان ہے۔۔۔

میں آج اسی محسن کو دیکھنے آیا تھا۔۔اور اس کا شکریہ بھی ادا کرنے آیا تھا، لیکن وہ تو اگلی دنیا سدھار گیا تھا۔۔۔اس کا پوتا ضرور ملا۔۔۔ جسے دیکھ کر مجھے یوں لگا۔۔ کہ یہ وہی ہے جس کے بڑوں نے ہم پر اس وقت احسان کیا جب احسان کرنے کی سزا موت ہوتی تھی۔۔۔

پنجاب کے بٹوارے کا یہ بھی رخ ہے۔۔۔ایسا دونوں طرف ہی ہوا۔۔۔ان باتوں کی بناء پر میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ جنھوں نے قتل و غارت کی۔۔۔ دونوں طرف۔۔۔ان کا کوئی دھرم نہیں تھا۔۔۔انسانیت ان کے پاس سے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔۔۔وہ ظالم بھیڑیے تھے۔۔۔ انسانوں کے روپ میں۔۔۔ انھوں نے مذہب کا، وطنیت کا، غیر مذہبوں کے قتل کا لبادہ ضرور اوڑھ رکھا تھا۔۔۔البتہ جو انھیں روک سکتے تھے اور انھوں نے نہ روکا، وہ بھی شریک جرم ہی ہیں۔

کیا مہاراجہ پٹیالہ کی فوج ایسے ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتی تھی؟ یقیناً پکڑ سکتی تھی۔۔۔لیکن۔ انھوں نے یہ ظلم و ستم ہونے دیا۔۔۔ یہ ان کی کمزوری تھی یا خواہش، کون جانے سچ کیا ہے؟ میں یہ

کہوں گا کہ راجا کمزور نہ تھا، بلکہ یہ اس کی خواہش تھی۔۔۔ یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے، ممکن ہے کئی لوگوں کو اس سے اختلاف ہو۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ جب سب سے پہلے راولپنڈی کے قریب ایک گاؤں میں سکھوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا، اس وقت جو خاموش رہے وہ کمزور نہیں تھے، بلکہ ایسا ان کی خواہش پر ہو رہا تھا، وہ خود کرتے تو پکڑے جاتے، کسی سے کروایا، کام بھی ہو گیا اور داغ بھی نہ لگا۔ امیر مینائی نے کیا خوب کہا ہے،

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھُپے گا کُشتوں کا خوں کیوں کر؟
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہمارے گھر کے پاس عابد زیدی صاحب کا گھر تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا گھرانہ تھا۔ وہ بھی ہماری طرح ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد تھے۔ تقسیم کے وقت ان کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ میں نے آزادیِ ہند کے حالات جاننے کے لیے ان سے بات کی تو انھوں نے جو بتایا وہ بھی قابلِ غور ہے۔ ان کا آبائی علاقہ مراد آباد، یوپی تھا۔

وہ ایک مرتبہ مراد آباد (اپنے آبائی شہر) گئے۔ جہاں پر ایک صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی جن کا نام ڈاکٹر پرتھوی تھا۔ انھوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے نقل مکانی کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نام لے کر بتایا کہ فلاں فلاں شخص نے، جو ٹوبہ ہی کا رہنے والا تھا (میں ان کا نام نہیں لکھ رہا) ان کے ساتھ بے حد ظلم کیا تھا۔ ان کے خاندان کے کئی افراد کو قتل کیا، گھر بار لوٹا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسے خاندان کا ذکر بھی کیا جس نے ان کی مدد کی اور اپنی جان کی بازی لگا کر انھیں محفوظ مقامات پر پہنچایا۔ اس خاندان کے ایک صاحب کا نام احسان برکی تھا۔ ڈاکٹر پرتھوی کو سب یاد تھا۔۔۔ ظالم کا نام بھی اور محسن کا نام بھی جو احسان برکی کے بزرگ تھے۔۔۔ دونوں طرف دونوں ہی طرح کے کردار تھے۔

ہم راستہ پوچھتے پوچھتے نلینہ خورد پہنچ گئے۔ میری والدہ نے مجھے دو لوگوں کا بتایا تھا، ایک نمبردار کا اور دوسرا ایک خاندان جو گاؤں کا چرواہا تھا، جسے بھرائی کہتے تھے۔ جب میں نے یہ سفر کیا، اس وقت میری والدہ حیات تھیں۔ میں نے واپس آ کر یہ سب داستان انھیں سنائی تھی۔

ہم نے گاؤں جا کر نمبر دار کے گھر کا پتہ کیا تو علم ہوا کہ وہ اگلے جہاں سدھار گئے ہیں۔ البتہ ان کے پوتے ابھی آنے ہی والے ہیں۔ ہم نے ان سے بھرائی خاندان کے گھر کا پوچھا جو انھوں نے بتا دیا۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بھرائی خاندان کا گھر ساتھ والی گلی میں ہی تھا۔ ان کے گھر جا کر ہم نے اپنا تعارف کروایا۔ ہمیں دیکھ کر کئی لوگ ہمارے پاس آ گئے۔ بھرائی خاندان کا بزرگ تو فوت ہو چکا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے اور ان میں سے بھی بڑا فوت ہو گیا تھا۔ باقی دو اب گاؤں میں چوکیدار کا کام کرتے تھے۔ وہ دونوں اپنی تنخواہ لینے سرہند گئے ہوئے تھے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ گاؤں کے چوکیدار کی تنخواہ سرکار ادا کرتی ہے۔ گھر کی خواتین نے ہمارے لیے چارپائیاں بچھا دیں۔ کچھ ہی دیر میں پیتل کے گلاسوں میں ہمارے لیے چائے آ گئی۔ میرے بچپن میں بھی ہمارے گھروں میں پیتل کے گلاسوں میں گرم چائے پی جاتی تھی۔ اب کی بار ایسا ماں کے گاؤں میں ہو رہا تھا جبکہ ہم اپنے گھروں میں پیتل کی بجائے چینی کے برتنوں کو رواج دے چکے ہیں۔

ایک بوڑھی خاتون جس کی عمر آزادیِ ہند کے وقت دس سال ہو گی اسے میرے ننھیال کے بہت سے لوگوں کے نام یاد تھے۔ وہ سب کا نام لے لے کر ان کا حال پوچھ رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے پلو سے محبت کی نمی کو بھی پونچھ رہی تھی۔۔۔ وہ میری ماں کی سہیلی تھی، ان کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا، اسے سب یاد تھا، لیکن آنسو تھے کہ زبان پر حاوی تھے، بات کرنا مشکل ہو رہا تھا، میں نے بھی سننے کی بجائے آنسوؤں کی جھڑی دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔

مجھے بھی کچھ ایسا ہی کرنا پڑ رہا تھا!

اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا سکھ لاٹھی کے سہارے چلا آ رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے چل رہا تھا، وہ بھی آ کر بیٹھ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا، منشی خان کا کیا حال ہے۔۔۔ میں ایک دم ہکا بکا رہ گیا۔۔۔ پھر جب مجھے سمجھ آئی تو میں نے جانا کہ وہ صاحب میرے بڑے ماموں منشی خان کا پوچھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہیں۔ اس پر اس نے بھی اپنی آنکھیں صاف کیں اور کہنے لگا میرا نام مستری سیاں سنگھ ہے۔۔۔ منشی میرا آڑی تھا (ہماری پنجابی میں آڑی لنگوٹیے یار کو کہتے ہیں)۔

مستری سیاں اس سے زیادہ کوئی بات نہ کرسکا۔۔۔اور چپکے سے اٹھ کر چلا گیا، اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، مجھے تو بس یہی سنائی دیا، اوئے منشی، کتھے چلا گیاں اے کیوں چلا گیاں اے؟

میں نے پاکستان آکر اپنے ماموں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔۔۔ ماموں نے بھی اس کا حال پوچھا۔۔۔اور پھر اپنے صافے کا پلو ڈھونڈنے لگ گئے۔۔۔میرا رومال میری جیب میں ہی تھا جسے نکالنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔

ابھی ہم چائے ہی پی رہے تھے کہ نمبردار کا بیٹا آگیا۔ یاد رہے نمبردار اور میرے ننھیال آپس میں رشتے دار بھی تھے۔شاید چند پشت پہلے ہی میرا ننھیال مسلمان ہوا ہوگا، حقیقت تو معلوم نہیں لیکن لگتا کچھ ایسا ہی ہے۔نمبردار کے بیٹے کا نام شیر سنگھ تھا اور وہ چھ فٹ قد کا ایک گبھرو جوان تھا۔ ایک بات نہایت ہی دلچسپ تھی۔ وہ کچھ یوں تھی کہ میرے بیٹے آصف کی آنکھوں کا رنگ سبزی مائل ہے۔اور شیر سنگھ کی آنکھوں کا رنگ بھی آصف سے ملتا جلتا تھا۔ جو اس بات کی نشانی تھی کہ میرے ننھیال اور شیر سنگھ کا خاندان ایک ہی لڑی (نسل) سے ہے۔

میں نے کئی الفاظ جوڑ جاڑ کر شیر سنگھ کا شکریہ ادا کیا۔۔۔کہ اس کے دادا نے میرے نانا کو پناہ دی تھی۔۔۔اس نے ہمیں کھانے کا کہا جس پر ہم نے معذرت کی۔۔۔کچھ تصاویر لیں۔۔۔ اور بس رنگ تو مل گئے لیکن جب عقائد مختلف ہوئے تو پھر سب رشتے بھی ختم ہو گئے۔۔۔اس گاؤں میں وہ سب میرے ننھیال کے ساتھ ہی کیوں ہوا۔۔۔ بھرائی خاندان بھی تو مسلمان تھا۔۔۔اس کے ساتھ ایسا کیوں نہ ہوا۔۔۔؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جو میں کسی ایسے مسلمان گھرانے سے کرنا چاہتا تھا جس نے موقع ہونے کے باوجود پاکستان ہجرت نہ کی ہو۔ بھرائی خاندان کی ایک بوڑھی عورت نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ اس نے نہ صرف میری میزبانی کی بلکہ بہت کچھ بتایا بھی۔اس کی گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

امّاں جی نے بتایا کہ ہم غریب لوگ تھے اور اب بھی غریب ہی ہیں۔ ہماری کوئی زمین وغیرہ بھی نہیں تھی۔ جب اجاڑے پڑے (ہمارے بزرگ اسے ہجرت نہیں بلکہ اجاڑے کہتے تھے) تو ہمیں بھی ڈر محسوس ہوا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے لوگ میرے سسر کے پاس آئے اور کہا کہ ہم

آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔آپ کو گاؤں چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے بڑوں نے کئی خدشات کا اظہار کیا۔۔۔جس پر نمبر دار نے کہا کہ دیکھو۔۔۔آپ کی یہاں بھی کوئی زمین اور جائداد نہیں ہے۔حتیٰ کہ یہ گھر بھی آپ کے نہیں ہیں۔آپ پاکستان جا کر کیا کریں گے؟ آپ صدیوں سے اس گاؤں میں رہ رہے۔ہم سب دکھ سکھ کے سانجھی ہیں،آپ ہمارے گاؤں کے چرواہے ہیں اور ساتھ ہی گاؤں کے چوکیدار بھی۔۔۔آپ کو پاکستان جا کر بھی اسی طرح کی کوئی محنت مزدوری کرنا ہوگی۔۔۔آپ نہ جائیں۔۔۔اس طرح ہم نے اسی گاؤں میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ہمارا فیصلہ درست تھا۔

میں نے ایک اور سوال پوچھا جو سکھوں کے رویے سے متعلق تھا۔جس پر انھوں نے کہا کہ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔حالانکہ اس گاؤں میں صرف ہم ہی مسلمان ہیں۔ہماری چھوٹی سی مسجد بھی ہے اور ہمارے بچے بھی سرکاری سکول میں پڑھتے ہیں۔ ہمارے پاس سرکاری نوکری بھی ہے۔۔۔یہ میرا گاؤں ہے، میں اس گاؤں کی ایک بڑی بوڑھی عورت ہوں،سب ہی مجھے اماں کہہ کر بلاتے ہیں۔ہماری جوان بیٹیاں ہیں لیکن پھر بھی ہمیں کوئی خوف نہیں ہے۔

میں نے ایک سوال پوچھا کہ کیا آپ کو کبھی یہ خیال آیا کہ کاش آپ بھی پاکستان چلے جاتے۔۔۔اس پر وہ خاموش ہوگئیں اور ساتھ کھڑی ہوئی اس کی بہو کے چہرے پر مجھے ایک یاس کا منظر دیکھنے کو ملا۔جسے میں اب تک بھلا نہ پایا۔۔۔وہ خوش تو ہیں،محفوظ بھی ہیں۔۔۔لیکن ان کا شمار اب بھی اقلیت میں ہوتا تھا۔۔۔اجاڑوں سے پہلے وہ گاؤں میں برابری کی حیثیت رکھتے تھے۔۔۔جو شاید اب نہیں ہے۔۔۔ان کی اداسی کا یہی سبب ہوسکتا ہے۔

ابھی ہم ان کے پاس ہی بیٹھے تھے کہ قریب ہی سکول سے بچوں کو چھٹی ہوئی۔میں نے دیکھا کہ بچوں کے سرکاری سکولوں کی وردی کی بجائے پرائیویٹ سکولوں جیسی وردی پہنی ہوئی تھی۔میں نے پوچھا کہ کیا کوئی پرائیویٹ سکول ہے؟ انھوں نے بتایا کہ نہیں یہ ایک سرکاری پرائمری سکول ہے۔میں نے پوچھا کہ وردی سرکاری سکولوں سے کیسے مختلف ہے؟ جواب دلچسپ اور فکر انگیز تھا۔

بھرائی خاندان کی بہو نے (جو ہم سے بات کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہی تھی جو اسے اس

کی ساس کی وجہ سے نہیں مل پا رہا تھا) کہا کہ ہمارے گاؤں میں ایک استاد آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے بچے احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پرائیویٹ سکولوں میں امیر لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ استاد صاحب نے بچوں کا یہ احساس دور کرنے کے لیے سرکار سے ان کی وردی پرائیویٹ سکولوں جیسی منظور کروالی ہے۔ اس سے کچھ فائدہ بھی ہوا؟ میرا سوال تھا۔۔۔ جواب ہاں میں تھا۔

اب دوپہر بھی ہورہی تھی۔۔ ہمیں دہلی بھی پہنچنا تھا۔ اگلے دن ہماری واپسی بھی تھی۔۔۔

ماں کے گاؤں کو جی بھر کے دیکھا۔۔۔ ان گلیوں کو دیکھا جہاں انھوں نے اور ان کے ماں باپ نے سکھ بن کر اور سکھوں جیسے نام رکھ کر ایک سکھ سردار کی پناہ میں کئی دن گزارے تھے۔

میں نے اپنی ماں سے کئی بار پوچھا کہ آپ کا نام کیا رکھا گیا تھا؟ انھوں نے نہیں بتایا۔

شاید وہ اپنا نام بتا کر اس دکھ کو تازہ نہیں کرنا چاہتی تھیں!

میرا ننھیال ایک سکھ سردار کی پناہ میں

جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ میری والدہ نے مجھے اپنا سکھوں والا نام بتانے سے انکار کیا تھا۔ میری والدہ کے چچا زاد بھائی رحم دین، اجاڑوں کے وقت جن کی عمر دس سال کے قریب تھی، میں نے ان سے ہجرت کے سفر کی داستان سنانے کی فرمائش کی۔ جو کچھ انھوں نے بتایا وہ کچھ یوں ہے۔

میرے ماموں دین محمد اپنے بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ وہ چار بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اور طاقتور تھے۔ اسی وجہ سے جنگ عظیم دوم کے لیے جب انگریزوں نے زبردستی لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا تو ان کی جوانی اور توانا جسم انگریزوں کو پسند آیا انھوں نے انھیں اپنی فوج میں بھرتی کرلیا۔ ان کی شادی بھی ہوچکی تھی اور وہ ایک بیٹی کے والد بھی تھے۔ جب ہنگامے عروج پر تھے، وہ ان دنوں چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔ ایک دن انھوں نے اپنے والد اور والدہ یعنی میرے نانا اور نانی سے کہا کہ وہ اپنی بہن سے ملنے جانا چاہ رہے ہیں، جو قریب ہی ایک گاؤں میں رہتی تھیں۔ میرے نانا اور نانی نے انھیں منع کیا کہ ہنگامے ہو

رہے ہیں، قتل و غارت بھی عام ہے، کوئی نقصان ہوسکتا ہے، آپ نہ جائیں۔ اس موقع پر انھوں نے ایک فقرہ کہا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا لیکن ماموں رحم دین کو یہ مکمل طور پر یاد تھا۔

دین محمد نے کہا کہ دس میل تک تو مجھے گھوڑی بھی نہیں پکڑ سکتی یہ سکھ مجھے کیا پکڑیں گے۔

ان دنوں لوگ سفر کرتے ہوئے ہاتھ میں ایک ڈانگ جس کے ایک سرے پر برچھی لگی ہوتی تھی رکھتے تھے۔۔ ایسا دشمن کے ساتھ ساتھ جانوروں سے بچاؤ کے لیے بھی ضروری ہوتا تھا۔ وہ گاؤں سے نکلے اور کچھ دور ہی گئے تھے کہ کچھ فسادیوں کو ان کا پتہ چل گیا اور انھوں نے انھیں جا پکڑا۔ میرے ماموں ان سے بچنے کے لیے گنے کے ایک کھیت میں چھپ گئے۔ مارنے والے تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ آخر کار انھوں نے پکڑ لیا اور انتہائی بے دردی کے ساتھ برچھیوں کے وار کر کے قتل کر دیا۔ ماموں رحم دین کے بقول ان کے جسم پر 18 برچھیوں کے زخم تھے۔ اس کے بعد ان کی لاش کو گاؤں لایا گیا۔ اب خاندان پر دہری مصیبت آ گئی ایک جوان شہید ہو گیا، بوڑھے ماں باپ چھوٹے بچے خواتین سب خوف میں مبتلا ہو گئے۔

ایسے میں گاؤں کا سکھ سردار نمبردار سامنے آیا اور اس نے اپنے خاندان اور گاؤں کے دیگر لوگوں کی مدد سے میرے ننھیال کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور کہا کہ کوئی ہماری لاشوں سے گزر کر ہی آپ تک پہنچے گا۔ البتہ انھوں نے اتنا ضرور کہا کہ کچھ دنوں کے لیے آپ سکھ بننے کا اعلان کر دیں۔ اپنے نام سکھوں والے رکھ لیں تاکہ اگر کوئی ہمیں پوچھے تو کہہ سکیں گے یہ لوگ سے سکھ دھرم میں آ گئے ہیں، اس طرح ہمیں آپ کی حفاظت کرنے میں سہولت ہو گی۔

ماموں رحم دین کے بقول یہ عرصہ ایک سال سے زائد کا تھا۔ ماموں رحم دین نے بتایا کہ میں نے بھی سر پر بالوں کو اکٹھا کر کے باندھ لیا تھا۔ باقی لوگ بھی ایسا ہی کچھ کر رہے تھے۔ اس دوران تین مرتبہ فسادی لوگوں نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ سردار اور اس کے خاندان نے ہماری حفاظت کی خاطر ان کے ساتھ لڑائی کی اور ہمیں کسی بھی طرح کے نقصان سے بچایا۔

ایک سال کے بعد کافی امن ہو گیا تھا۔ میرے نانا نے ان سے کہا کہ اب ہم جانا چاہ رہے ہیں۔ جس پر انھوں نے کہا کہ آپ نہ جائیں، آپ صدیوں سے اس گاؤں میں رہ رہے

ہیں، ہماری آپس میں رشتہ داری بھی ہے، آپ کی زمین بھی ہے، ہم آپ کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لیتے ہیں۔ اس پر میرے نانا کا کہنا تھا کہ ہمارے بہت سے رشتہ دار جا چکے ہیں اس لیے ہم بھی جانا چاہتے ہیں۔ پھر ایک دن سردار کئی بیل گاڑیوں میں خاندان کو بٹھا کر، گاؤں کے جوانوں پر مشتمل ایک جتھے کو ساتھ لے کر پچاس کلومیٹر دور انبالہ مہاجر کیمپ چھوڑنے چلا گیا۔

کیا منظر ہوگا جب صدیوں ساتھ رہنے والے سدا کے لیے بچھڑ رہے تھے۔ جانے والے کیوں جا رہے تھے۔ سوائے خوف کے کوئی اور وجہ نہ تھی، جو ہر طرف، مشرق اور مغرب دونوں طرف، پھیلا دیا گیا تھا، یہی خوف لوگوں کو ہجرت اور نقل مکانی پر مجبور کر گیا۔

میرے ننھیال کے گھر کے ساتھ دو سکھ بھائی رہتے تھے ایک کا نام جیمل تھا اور دوسرے کا نام بدھو تھا۔ دونوں کی اولاد نہیں تھی لیکن زمین کافی تھی، انھوں نے بھی میرے نانا سے کہا کہ آپ نہ جائیں، آپ ہمارے رشتہ دار ہیں، ہماری زمین بھی آپ کو مل جائے گی۔ لیکن میرے نانا نے یہ بات نہ مانی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ اپنے ایک بچے کو ہمارے پاس چھوڑ جائیں، وہ ہماری اس زمین کا وارث ہوگا۔ اس پر بھی یہ لوگ راضی نہ ہوئے۔

میرے ننھیال کا ایک سکھ ملازم بھی تھا، سب لوگوں نے سونا وغیرہ اس کے حوالے کیا اور کہا کہ اگر ہم واپس آ گئے آپ سے لے لیں گے نہ آئے تو یہ آپ کا۔

جہاں صدیوں کا رہن سہن، تمدن، مان، عزت و آبرو چلی جائے، وہاں سونے کی کیا وقعت ہوگی!

میرا ننھیال انبالا میں کی ایک عرصہ رہنے کے بعد ایک ریل گاڑی میں بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں پھر ایک حادثہ ہوا۔ میری والدہ کے چچا ریل گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی چیز سے ٹکرا کر ان کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ اس طرح خاندان کو دوبارہ وہاں پر رکنا پڑا۔ ہسپتال بھی موجود تھے علاج بھی ہوا، وہ لیکن فوت ہو گئے۔ میرے نانا کے لیے دوہری مصیبت ہوگئی، جوان بیٹا شہید ہوا، ایک بھائی فوت ہو گیا، خاندان، خواتین بچے سب کی ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ باہمت لوگ تھے، روتے پیٹتے لاہور آ گئے۔

جب لاہور آئے تو پتہ چلا کہ ان کی بہن بھیرہ کے قریب ایک دور دراز گاؤں میں ہے۔ وہ

اپنے بچوں کو لے کر ان کے پاس دھوپ سڑی گاؤں آ گئے۔ اس دوران انھیں پتہ چلا کہ ایک قریبی گاؤں (جس کا نام گرمنگھ سنگھ والا تھا) میں مہاجروں کو آباد کیا جا رہا ہے۔ اس طرح میرا ننھیال موجودہ گاؤں میں آ گیا۔ اسے بمبے والا بھی کہتے تھے کیونکہ یہاں پر ایک ٹیوب ویل لگا ہوا تھا۔ اب اس کا نام الہ آباد ہے اور یہ ملکوال سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس طرح انھوں نے خالی ہاتھ پاکستان آ کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا۔

زمین الاٹ ہونے میں کافی وقت لگا۔ اس دوران یہ لوگ جنگل سے درخت کاٹ کر پندرہ کلومیٹر دور ملکوال جا کر بیچتے تھے۔ اس طرح روٹی روزی کا بندوبست کیا گیا۔ میری نانی مقامی ذمہ داروں کے گھروں میں کام کرنے جاتی تھی اور شام کو بچوں کے لیے روٹی لے آتی تھی۔ یہ کہنے کو تو بہت آسان سی بات ہے کہ ایک خوشحال خاندان جو چند ماہ قبل تک ایک نہایت ہی آسودہ زندگی گزار رہا ہو، زمین داری بھی ہو، معاشرے میں عزت بھی ہو، معاشرتی مقام بھی ہو اور پھر چند ماہ بعد اپنے سر پر ایک من لکڑیاں اٹھا کر 15 کلومیٹر کا سفر کرے تب جا کر شام کو روٹی ملے۔ گھر کی سربراہ خاتون جس کے گھر ملازم تھے وہ خود ملازم بن جائے، ایسا ہی ہوا، جو سب ناقابلِ بیان ہے۔ جس گاؤں میں آ کر میرا ننھیال آباد ہوا، وہ ایک گرمنگھ سنگھ کی ملکیت تھا، وہ اٹھائیس مربع زمین کا اکیلا مالک تھا۔ ایک بڑا گھر تھا، بے شمار لوگ اس کے ملازم یا مزارع تھے، وہ بھی خالی ہاتھ اس گاؤں سے چلا گیا۔ اس کے گھر میں ماموں رحم دین، اپنی بیوہ ماں اور دو بہنوں کے ساتھ رہنے لگا۔ ماموں رحم دین نے مجھے بتایا کہ اس گھر میں ایک صندوق میں بہت ساری کتابیں تھیں، انھیں بھی کتابوں سے دلچسپی تھی اس لیے وہ اس صندوق سے کتابیں نکال کر پڑھتے رہتے تھے۔ وہ صندوق اب بھی ان کے پاس ہے۔

میں نے ماموں رحم دین نے پوچھا کہ آپ لوگ کب مسلمان ہوئے؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ بزرگ یہ بتاتے ہیں کہ کوئی سات پشت قبل ان کے خاندان کا ایک لڑکا راجستھان سے آئے لوگوں (جو کے مسلمان تھے) کے ساتھ چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ مسلمان تھا۔ اس طرح ہمارا خاندان مسلمان ہو گیا۔

مکان وہیں رہے مکین بدل گئے!

میری ننھیال کے گھروں میں مغربی پنجاب سے جانے والے سکھ اور ہندو آباد ہیں!
اور گرمنگھ سنگھ والا میں مشرقی پنجاب سے آنے والے مسلمان آباد ہیں!
جنھوں نے یہ گھر بنائے ان کو ان میں رہنا نصیب نہ ہوا!
اور وہ کسی دوسرے کے بنائے ہوئے گھر میں رہنے پر مجبور ہوئے!
ایسا کیوں ہوا؟
کیسے ہوا؟
کوئی تو اس کا جواب دے!

اجاڑوں کے پانچ سال بعد میری والدہ عمری بی بی کی شادی پٹیالہ ہی کے ایک جاٹ چودھری محمد یوسف مانگٹ سے ہوئی۔ جو نام کی طرح حسین، گبرو، دلیر، خیر خواہ، محنتی اور دیانت دار بھی تھا۔ شادی کے بعد ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ملخان رکھا گیا جو دو سال کی عمر میں ہی اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو گیا اور پھر 1958ء میں ان کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام محمد مشتاق احمد رکھا گیا۔ اس کے بعد ان کو اللہ نے ایک بیٹی اور تین بیٹے اور بھی عطا کیے۔ بیٹی پندرہ سال کی عمر میں فوت ہو گئی۔ والد صاحب 1998ء میں اور والدہ 2008ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔۔ والدین کے پہلے بیٹے کی یاد میں میرے بیٹے آصف نے اپنے پہلے بیٹے کا نام بھی ملخان یوسف مانگٹ رکھا۔۔۔

اس کے بعد اب تک دوبارہ جانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن خواہش ضرور موجود ہے۔۔۔
کب دونوں طرف کے اہل اقتدار۔۔۔
صلح کی طرف مائل ہوں گے۔۔۔ پھر ہی یہ ممکن ہو گا۔

اب پھر ہم اپنی بس کے سفر کی طرف آتے ہیں۔ بچے بھی تازہ دم ہو گئے تھے۔ ساتھ رہیے گا، وہ جو کہتے ہیں:

ہنوز دلی دور است!

❀❀❀

فرید کوٹ

بابا فرید کے نام کا ایک شہر

ہماری بس میں ہمارے علاوہ بھارت میں رہنے والے چند مسلمان بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ سفر کر رہے تھے جو اپنے عزیز و اقارب سے ملنے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ایک صاحب سے، جن کا نام نصیب احمد تھا، میں نے بات چیت شروع کی۔ ان سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ فرید کوٹ کے رہنے والے ہیں اور لاہور میں اپنے عزیز رشتے داروں سے ملنے گئے تھے۔ میں نے ان سے ان کے دورہ پاکستان اور فرید کوٹ کے بارے میں کچھ جاننا چاہا، جس پر وہ راضی ہو گئے۔ یاد رہے فرید کوٹ پنجاب میں واقع ہے۔

میرا پہلا سوال ان کے دورہ پاکستان کے بارے میں تھا۔

میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ہمارے کئی عزیز رہتے ہیں اور یوں ہمارا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان کا ویزا کافی مشکل سے ملتا ہے اور اس پر بھی ہمیں صرف تین سے زیادہ شہروں میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس سے بڑھ کر جو تکلیف دہ بات ہے وہ پولیس رپورٹنگ ہے۔ پولیس کو رپورٹ کرنے میں بہت سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ ایسا تو دونوں طرف ہی ہے۔ لہذا ہمارے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ البتہ بعض اوقات ایک دقت ضرور پیش آتی ہے کہ جب پاکستان کے مختلف ادارے ہمارے عزیز و اقارب سے پوچھ گچھ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر ایسا نہیں ہوتا

لیکن جب بھی ہوتا ہے تو وہ کافی مشکلات لے کر آتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ پاکستان کیسا لگتا ہے اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ پاکستان ایک خوب صورت اور پرامن ملک ہے۔ہم رات کے کسی بھی پہر نکل جاتے تھے تو بھی کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوتا تھا۔ میں یہاں خاص طور پر لاہور کا ذکر کرنا چاہوں گا جو باغوں کا شہر بھی ہے اور خوب صورت بھی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضرور کہوں گا کہ وہاں صفائی ستھرائی کا بھی اچھا انتظام ہے- لاہور اپنی معاشرتی اور سیاسی اہمیت کی وجہ سے بھی دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔لاہور کی تعریف سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔ لاہور ہے ہی ایسا دلکش شہر، جو بھی اسے دیکھتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ لاہور واقعی خوب صورت شہر ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ میں فریدکوٹ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔

نصیب احمد صاحب نے بتایا کہ فریدکورٹ لدھیانہ سے 120 کلومیٹر مغرب اور فیروز پور سے چالیس کلومیٹر جنوب مشرق میں موجود ہے۔اس طرح آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فریدکوٹ بھارتی پنجاب کے جنوبی حصے میں واقع ہے۔پاکستان کی سرحد سے اس کا فاصلہ تقریباً ساٹھ کلومیٹر ہے۔ اس کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ایک طویل مدت تک یہ ریاست فریدکوٹ کا صدر مقام رہا ہے۔موسم کے لحاظ سے یہ خشک اور گرم علاقہ ہے، بالکل ایسے ہی جیسے آپ کا لاہور یا قصور ہو۔

میں نے ان سے پوچھا کہ نصیب صاحب یہ تو بتائیں کہ اس ریاست کا نام فریدکوٹ کیوں رکھا گیا؟ نام سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی ریاست تھی۔کیا ایسی ہی بات ہے؟ اس وقت مجھے تک خود بھی اس ریاست کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ مجھے صرف یہ پتہ تھا کہ فرید کوٹ کے نام سے بھی ایک ریاست موجود تھی۔

نصیب صاحب میرا سوال سن کر مسکرائے اور بتانے لگے کہ ریاست کا پہلے نام موکلہار تھا۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس کا نام بابا فرید گنج شکر کے نام پر رکھ دیا گیا اور یہ سب کچھ ریاست کے ہندو حکمرانوں نے کیا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیسے اپنا پرانا موکلہار نام بدل کر ایک مسلمان صوفی کے نام پر ایک پوری ریاست کا نام رکھ دیا؟ ہمیں تو کچھ اس طرح بتایا گیا تھا کہ

ہندو مسلمانوں کے بہت سخت دشمن تھے اور پنجاب کے بٹوارے کے وقت انھوں نے بے شمار مسلمانوں کو قتل بھی کیا تھا۔ یاد رہے بابا فرید تیرھویں صدی میں یہاں آئے تھے اور اس وقت تک سکھ دھرم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

لیکن یہ کیا بات ہوئی؟ یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہے۔

اس پر نصیب صاحب نے بتایا کہ یہ ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ یہاں کے راجا نے اپنا محل تعمیر کرنا چاہا اور اس کے لیے ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو مزدوری پر لگایا گیا۔ اس دوران بابا فرید بھی اس جگہ سے گزر رہے تھے۔ انھیں بھی حکم ہوا کہ وہ بھی سر پر مٹی کی ٹوکری اٹھا کر کام کریں۔ انھوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ٹوکری ان کے سر سے اوپر ہوا میں چل رہی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ٹوکری لے کر جا رہے ہیں لیکن ٹوکری ان کے سر پر نہیں بلکہ ہوا میں رکھی گئی ہے۔ یہ سب دیکھ کر لوگ بے حد حیران ہوئے۔ راجا کو خبر دی گئی تو وہ بھی بہت پریشان ہوا اور انھوں نے بابا فرید کو اپنے دربار میں بلایا اور ان سے معافی مانگی اور ان سے عرض کی کہ وہ اس ریاست کی خیر خواہی کے لیے یہاں پر کچھ دن قیام کریں۔ اس پر بابا فرید راضی ہو گئے انھوں نے یہاں چالیس دن قیام کیا۔ اس پر ہندو راجا نے ان کی اجازت سے اپنی ریاست کا نام، جو اس سے قبل اس ریاست کے ایک بزرگ موکلاسی کے نام پر موکلہار تھا، بدل کر فرید کوٹ رکھ دیا۔

میرے لیے یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ میرا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے۔ ستر کی دہائی میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک تحریک چلائی گئی تھی کہ اس شہر کا نام ایک سکھ کے نام سے بدل کر دارالسلام رکھا جانا چاہیے۔ وہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ اسی طرح میرے ننھیالی گاؤں کا نام کوٹ گورمنگھ سنگھ تھا جسے لوگوں نے بدل کر الہ آباد رکھ دیا۔ پاکستان میں ایسے بے شمار قصبات موجود ہیں جن کے نام ہندوؤں، سکھوں یا انگریزوں کے نام پر تھے اور انھیں ہم نے بدل کر مسلمانوں کے نام دے دیے۔ جس کی ایک بہت بڑی مثال لائلپور کا نام بدل کر فیصل آباد رکھنا ہے۔ مسٹر لائل نے اس علاقے کو آباد کیا اور اسی کے نام پر ہی شہر بنا لیکن بعد میں ہم نے شاہ فیصل کے نام پر اس کا نام

فیصل آباد رکھ دیا۔

میری حیرانی کو دیکھ کر انھوں نے مزید کہا کہ جو لوگ فرید کوٹ سے پاکستان جانا چاہتے تھے ان کے لیے پر امن طریقے سے جانے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس علاقے میں قتل و غارت نہیں ہوئی لیکن ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ پنجاب کے دیگر علاقوں کی نسبت اس علاقے میں بہت کم قتل عام ہوا۔ پاکستانی سرحد کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں سے اکثر لوگوں نے ہجرت بھی کی۔ اب فرید کورٹ شہر میں صرف ایک فیصد کے قریب مسلمان رہتے ہیں۔

مجھے بابا فرید کے نام کی وجہ سے مزید دلچسپی پیدا ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا بابا فرید کے نام کی کوئی اور چیز بھی ہے۔ انھوں نے مجھے خوشی سے بتایا کہ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ چند سال پہلے فرید کوٹ میں بابا فرید ہیلتھ یونیورسٹی بھی بنائی گئی ہے جو اس شہر کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ میری حیرانی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا لیکن ایک اہم بات کا جاننا ابھی باقی تھا۔ نصیب صاحب نے بتایا کہ فرید کوٹ میں ایک گردوارہ بھی موجود ہے جس کا نام گردوارہ ٹلہ بابا فرید ہے۔ اس گردوارے میں وہ جگہ بھی محفوظ کی گئی ہے جہاں بابا جی نے بیٹھ کر عبادت کی تھی۔ اس طرح ایک ہی چھت کے نیچے گردوارے اور بابا فرید کے چلے کی جگہ موجود ہے۔

اس سے بڑھ کر مذہبی بھائی چارے کی اور کیا مثال ہوگی!

میں نے اپنے طور پر یہ جاننا چاہا کہ سکھ بابا جی کا اتنا احترام کس وجہ سے کرتے ہیں؟ تو پتہ چلا کہ سکھ دھرم کی کتابوں میں بابا جی کے بے شمار اشعار ہیں۔ یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ بابا فرید نے لنگر کی روایت کا آغاز کیا تھا جسے بعد میں سکھوں نے بھی اپنایا۔ اب ساہیوال میں بھی یونیورسٹی بنائی گئی ہے۔

یہ سب سن کر مجھے یاد آیا کہ میرے والد صاحب جو شعر اکثر گنگنایا کرتے تھے وہ بابا فرید صاحب کے ہی تھے۔ جو کچھ یوں تھے:

اٹھ فریدا سوتیا تو چاڑو دے مسیت
تو سوتا رب جاگدا تری ڈاڈے نال پریت

ٹریا ٹریا جا فریدا ٹریا ٹریا جا
روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی
ویکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیے جی
ٹریا ٹریا جا فریدا ٹریا ٹریا جا

یہ بات بھی حیران کن ہے کہ بابا فرید نے یروشلم میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔ان کے اس قیام کی یاد میں اب بھی وہاں پر ایک سرائے موجود ہے۔ابھی حال ہی میں بی بی سی نے اس کی ایک فلم بھی بنائی ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ بابا فرید تیرھویں صدی میں یہاں آئے تھے۔فرید کوٹ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گوردوارہ گودڑی صاحب بھی بنایا گیا ہے۔اس سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ پر بابا فرید نے فرید کوٹ میں داخل ہونے سے پہلے آرام کیا تھا اور یہاں اپنی گودڑی چھوڑ گئے تھے اور اسی کی یاد میں گودڑی کے نام کا گوردوارہ بنایا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ سکھ بابا فرید سے بے حد محبت کرتے تھے اور یہ چند باتیں اسی کا ثبوت ہیں۔

کچھ باتیں تو انھوں نے بتائیں اور کچھ میں نے بعد میں مختلف جگہ سے اکٹھی کیں۔جو کچھ مجھے پتہ چلا اس کا ایک خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

بھارت کی ایک مشہور ویب سائٹ https://www.royalark.net/India/faridkot.htm پر بھارت کی ریاستوں کا احوال لکھا ہوا ہے۔اس کے مطابق فرید کوٹ کے حکمرانوں کے بڑوں نے بارھویں صدی میں جیسلمیر میں ایک ریاست بنائی۔ان کے بڑے بیٹے نے جس کا نام کپور تھا اٹھارھویں صدی کے آغاز میں سکھ دھرم اختیار کر لیا اور کوٹ کپورا کے نام سے ایک چھوٹی سی ریاست بھی بنائی۔بعد ازاں خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے سردار جودھ سنگھ نے کوٹ کپورا پر قبضہ کر لیا اور اس کے چھوٹے بھائی سردار ہامر سنگھ برار نے 1763ء میں فرید کوٹ کی بنیاد رکھی۔جب پنجاب میں مہاراجا رنجیت سنگھ کا دور شروع ہوا تو اس نے ان دونوں ریاستوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنے جرنیل دیوان محکم چاند کو اس کا سربراہ بنا دیا۔اس موقع پر فرید کوٹ کے لوگوں نے انگریزوں سے رابطہ کیا۔انگریزوں نے ایک

معاہدے کے تحت فرید کوٹ کی ریاست اس کے اصل مالکان کو دلوادی جبکہ کوٹ کپورا ریاست رنجیت سنگھ کے پاس ہی رہی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ریاست 1763ء میں معرض وجود میں آئی۔ ایک دفعہ مغلوب ہونے کے بعد اسے دوبارہ 1809ء میں انگریزوں کی مدد سے آزادی ملی۔ اس کے بعد سے پنجاب کے بٹوارے تک یہی خاندان حکمران رہا۔ خاندانی لڑائی بھی ہوتی رہی لیکن یہی لوگ اس کے حکمران رہے۔

انگریزوں کی حمایت کے بدلے اس ریاست نے ہر مقام اور ہر موڑ پر مقامی لوگوں کی مخالفت کر کے، خاص طور پر سکھوں کی، انگریزوں کا ساتھ دیا۔ تاریخ کے مطابق راجا وزیر سنگھ نے انگریزوں اور سکھوں کی لڑائیوں میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس نے جنگ آزادی میں بھی انگریزوں کی بھرپور حمایت کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نے بھی انگریزوں کے ساتھ ہر طرح کا مالی اور فوجی تعاون کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ وہ مذہبی رسومات میں سب سے آگے تھے۔ خاص طور پر گولڈن ٹیمپل کی تعمیر میں انھوں نے خاطر خواہ حصہ ڈالا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس ریاست پر انگریزوں نے براہ راست بھی حکمرانی کی۔ ایک وقت آیا جب راجا کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ لہذا اس کی بیٹی نے حکومت کی۔

جنگ عظیم اول میں اس خاتون نے اپنی فوجیں بھی انگریزوں کی ساتھ بھیجیں۔ جس کے بدلے اس ریاست کے راجا کو مہاراجا کا خطاب ملا۔ اس خاندان کے کچھ لوگ باقاعدہ انگریزی فوج میں بڑے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ ان دنوں اس ریاست سے نو ہزار سپاہی انگریزوں کی فوج میں شامل تھے جو کل آبادی کا تقریبا پانچ فیصد تھے۔ پنجاب کے بٹوارے کے نتیجے میں پاکستان سے بہت بڑی تعداد میں ہندو اور سکھ نقل مکانی کر کے اس ریاست میں آ گئے اور اس کی وجہ اس ریاست کا پاکستان سے قریب ہونا تھا۔

میں نے پنجاب کی ریاستوں سے متعلق جتنا بھی پڑھا ہے اس میں ایک بات مشترک ہے۔ انھوں نے ہر چڑھتے سورج کو، خواہ وہ افغان ہوں، انگریز یا مراٹھے سلام کیا۔ بطور ریاست کسی نے بھی (سوائے ایک کے جس کا ذکر آگے آئے گا) انگریزوں یا افغانیوں کی مخالفت نہیں

کی۔انھوں نے ہم مذہب سکھوں کے مقابلے میں بھی انگریزوں کی مدد کی۔انھوں نے وہ سب کچھ ریاست کو بچانے کے لیے کیا، جو کچھ وقت تک بچی رہیں۔پھر ایک دن وہ سب بھارت میں ضم ہوگئیں۔ان لوگوں کی ایسی حرکتوں کی وجہ سے بعض لوگ انھیں غدار کا لقب بھی دیتے تھے۔

میں نے آخر میں نصیب صاحب سے پوچھا کہ فرید کوٹ میں مسلمان کس حال میں ہیں؟ان کا جواب تھا کہ ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ہماری مساجد بھی آباد ہیں اور ہم ہر لحاظ سے محفوظ بھی ہیں۔

میں جب یہ تحریر لکھ رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ فرید کوٹ سے کانگرس کے امیدوار محمد صدیق نے الیکشن بھی لڑا اور جیتا بھی۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرید کوٹ کے لوگ مسلمانوں کو معاشرے میں ایک اہم مقام دیتے ہیں۔ایک مسلمان کو ٹکٹ دینا اور وہ بھی اس شہر میں جہاں مسلمان دو فیصد سے بھی کم ہوں،نصیب صاحب کی بات کی تائید کرتا ہے۔اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ گیانی ذیل سنگھ سابق صدر بھارت،کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔

❁❁❁

ہریانہ

جو کبھی سانجھے پنجاب کا حصہ تھا

ہریانہ ایک ہندو ریاست جہاں کبھی مسلمان بھی آباد تھے

مجھے ایک شخص (جو ہریانہ کا رہنے والا تھا) سے ملاقات کا موقع ملا۔ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ان کی باتوں سے جو معلومات ملیں وہ سب پیشِ خدمت ہے۔

میں نے پوچھا کہ ہریانہ کے بارے میں سب سے اہم بات کیا ہے؟

ان کا جواب تھا کہ ہریانہ بھارت کی ان ریاستوں میں سے ایک ریاست ہے جہاں پر 97 فیصد ہندو رہتے ہیں۔ اس طرح آپ اسے ایک خالص ہندو ریاست کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی پنجاب ہے جہاں پر سکھ لوگ کثرت سے رہتے ہیں لیکن ہریانہ میں سکھوں کی تعداد ایک فیصد سے زائد نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہریانہ کی آبادی کا تیس فیصد جاٹوں پر مشتمل ہے۔ یہ جاٹ لوگ بہت ہی مغرور لوگ ہیں اور اپنے جاٹ ہونے پر بہت زیادہ فخر کرتے ہیں۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا، ان لوگوں کی گاڑیوں پر جاٹ لکھا ہوتا ہے۔ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے سر پر پگڑی اور ہاتھ میں حقہ ہوتا ہے اور جہاں بھی دو چار اکٹھے ہو جائیں، چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور دیر تک گپیں ہانکتے ہیں۔

انھوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ یہاں کے رہنے والے اکثر لوگوں کا تعلق جنگجو قبائل سے ہے جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ ایک بڑی تعداد میں بھارتی فوج میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ

علاقے صدیوں سے میدان جنگ بنے رہے۔ اس کی ایک مثال پانی پت اور مہا بھارت کی لڑائیاں بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگ کھیلوں میں بھی بڑھ چڑھ کا حصہ لیتے ہیں۔ ان کا پسندیدہ کھیل کبڈی اور کشتی ہے۔ اس کے باوجود کہ لوگ لڑائی جھگڑے کو پسند کرتے ہیں، ہریانہ میں جرائم کی شرح بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہ لوگ تعلیم میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں کیونکہ زمین تقسیم در تقسیم کے عمل سے کم ہوتی جا رہی ہے اور لوگوں کو یہ بات سمجھ آ رہی ہے کہ تعلیم کے بغیر وہ ایک خوشحال زندگی نہیں گزار پائیں گے۔ دہلی کے قریب ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں معاشی طور پر بھی کافی ترقی ہو رہی ہے۔

میں نے پوچھا کہ میرے علم کے مطابق ہریانہ ریاست، پنجاب کے کچھ علاقوں کو الگ کر کے بنائی گئی ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ زبان کی بنیاد پر ایک الگ ریاست بنی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس ریاست کو بنانے کا مقصد ایک ہندو ریاست کا قیام بھی ہے۔ انھوں نے کہا ہاں، بظاہر ایسا نہیں کہا گیا۔ عام طور پر یہ کہا گیا کہ ہم پنجابی زبان سے ہٹ کر ہندی بولنے والے لوگوں پر مشتمل ایک ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے اس کے پیچھے ایک مذہبی فکر بھی موجود تھی۔

انھوں نے مزید کہا کہ اب مذہبی تعصب کی باتیں بہت پرانی ہو گئی ہیں۔ ہمارے بزرگ ان باتوں کے شدت سے قائل تھے۔ ہم ذرا کم ہیں اور ہماری اولاد تو ان باتوں پر کوئی خاص توجہ ہی نہیں دیتی۔ میں نے وجہ پوچھی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ اس کی تین وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اب ہماری زندگی میں مذہب کا اتنا عمل دخل نہیں ہے، جتنا ہماری پہلی نسلوں میں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب یہ بات اہم ہے وہ کون سا کام کیا جائے جس سے معاشی فائدہ ہو۔ تیسری بات تعلیم، فلم، میڈیا اور ایک دوسرے سے ملاقاتوں کے نتیجے میں ہمارے اندر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اب ہم یہ کہتے ہیں کہ مذہب آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ آپ کسی بھی مذہب سے ہوں اس پر عمل کریں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ اپنے پیدا کرنے والے کو کس نام سے پکارتے ہیں اور کس مذہبی مقام پر جاتے ہیں، اس سے ہمیں کوئی سرو

کا نہیں ہے اور اس بات پر کوئی جھگڑا ابھی نہیں ہے۔ اب جس میدان میں مارا ماری ہو رہی ہے وہ دولت کمانے کا میدان ہے۔

میں نے ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہی، جس پر انھوں نے کہا کہ خوشی سے۔ میں نے کہا کہ اب تک میں نے جو پڑھا ہے اس کے مطابق ہریانہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں میں آٹھ سو پچاس کے قریب خواتین ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سو سال پہلے کے سروے بھی یہی بات بتاتے ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ دیہاتی اور شہری علاقوں میں صورت حال تقریباً ایک جیسی ہی ہے۔ دیہات میں بھی ایسی صورت ہے اور شہروں میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے اور آپ کے نزدیک اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ ایک بہت ہی مشکل صورت حال ہے اور یہ صدیوں سے روایت چلی آ رہی ہے۔ ایک تو آپ کے علم میں ہے کہ اس علاقے میں بے شمار جنگیں بھی ہوئیں، جن میں پانی پت کی جنگیں بہت مشہور ہیں۔ شاید اسی وجہ سے مردوں کی اہمیت زیادہ ہے۔ دوسری وجہ روایتی سوچ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ سب کچھ موجود ہے کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں کم اہمیت دی جاتی ہے۔ حکومت نے اس صورتِ حال کو بہتر کرنے کی کافی کوشش کی ہے لیکن صورتِ حال کوئی زیادہ بہتر نہیں ہے۔

انھوں نے مزید کہا کہ یہ بات شاید آپ کے لیے قابلِ قبول نہ ہو کہ آج بھی لڑکی کے قتل کا معاملہ موجود ہے۔ پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے بعد بھی۔ حکومت نے کئی طرح کے پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔ کئی نعرے بھی دیے ہیں۔ جیسے بیٹی پالو، آپ کی بیٹی ہم سب کی بیٹی، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تک بھی صورت حال بہتر نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ شادی نہیں کر پاتے۔ جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ جو اچھے قد کاٹھ کے مالک ہوتے ہیں وہ جنوبی بھارت سے لڑکیاں لاتے ہیں، جو بہرحال ایک مناسب بات نہیں ہے۔

میں نے پوچھا کہ پرانے وقتوں میں ہم سنتے آئے تھے کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے۔ کیا اب بھی ایسا ہی ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا اب یہ بات کافی حد تک ختم ہو گئی ہے لیکن

اب بھی کہیں کہیں ایسی باتیں موجود ہیں۔ میں نے چند سال پہلے ایک ڈاکومنٹری دیکھی تھی جو ہماچل پردیش کے کسی پہاڑی علاقے کی تھی جہاں کے ایک خاندان کے بارے میں دکھایا گیا تھا جس میں ایک عورت دو بھائیوں کی بیوی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اب بھی کہیں ایسا ہوسکتا ہے لیکن اب یہ بات عام نہیں ہے۔ شاید ہی کہیں ایسا ہوتا ہو۔ یہ بھی زیادہ تر ان لوگوں میں ہوسکتا ہے جو معاشی اور معاشرتی طور پر معاشرے کے نچلے طبقے کے لوگ ہیں، جہاں ان باتوں کا زیادہ خیال نہیں کیا جاتا۔

انھوں نے کہا عورتوں کی تعداد کا کم ہونا ایک تکلیف دہ بات ہے۔ اس میں بھی کوئی بہتری کے امکانات بھی نظر نہیں آرہے۔ شاید آنے والی نسلیں اس مسئلے کو کچھ بہتر انداز سے حل کرسکیں۔ میں نے ان سے یہ پوچھا کہ کسی وقت میں یہاں پر بہت بڑی تعداد میں مسلمان رہتے تھے، اب نہیں ہیں۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے بڑے اپنے مسلمان دوستوں کی باتیں ہمیں بتاتے تھے ہم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اس لیے ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ایک مناسب تعداد میں ہمارے علاقے میں رہتے تھے۔ آزادیِ ہند کے وقت وہ یہاں سے پاکستان چلے گئے اور بہت سے ہندو اور سکھ پاکستان سے آکر یہاں آباد ہوگئے۔ مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی بے شمار مساجد ویران ہیں۔ ان کے گھروں کو ہم نے آباد کرلیا ہے۔ ان میں وہ ہندو اور سکھ لوگ رہ رہے ہیں جو پاکستان سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ مکانات اور زمینیں ہندوؤں اور سکھوں کو الاٹ کی گئی ہیں لیکن مساجد تو کسی کو الاٹ نہیں کی جاسکتی تھیں وہ ابھی تک محفوظ تو ہیں لیکن ان کو آباد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

اللہ کا گھر تو ہے، اللہ والے چلے گئے۔ کبھی یہ گھر بھی آباد تو ہوں گے۔ مجھے قوی امید ہے!

میں دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ ہم نے اپنی بات چیت کا یہ نتیجہ نکالا کہ جو قتل و غارت گری ہوئی، اس کے ذمہ داروں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

❁❁❁

انبالہ سے پہلے راج پورہ نام کا ایک قصبہ بھی دیکھنے کو ملا۔ اس کے بارے میں صرف یہی جاننے کو ملا کہ شیر شاہ سوری نے اپنے سفر اور فوجی قافلوں کی آمد و رفت کی خاطر راج پورہ میں ایک

''سرائے'' تعمیر کروائی۔ یہ سرائے سوری خاندان کے دورِ حکومت میں 1540ء سے 1545ء کے درمیان تعمیر کی گئی۔ اسی علاقے میں ایک مندر بھگوان شیو کے نام سے منسوب ہے جو قریبی ایک گاؤں میں واقع ہے۔ یہ مندر پندرھویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہاں ایک بڑی تعداد میں سادھو رہتے ہیں، جہاں وہ عبادت اور تپسیا کرتے ہیں۔ مندر کے دروازے پر بھگوان شیو کا پینسٹھ فٹ بلند مجسمہ نصب ہے، جبکہ خود مندر کی اونچائی سو فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ ہر سال ''مہاشِو راتری'' کے موقع پر اس مندر کو نہایت خوب صورتی سے سجایا جاتا ہے اور دور دور سے عقیدت مند یہاں حاضری دیتے ہیں۔

راج پورہ پنجاب کا آخری قصبہ ہے، اس کے بعد ہریانہ اسٹیٹ (ریاست) کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں صوبے کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جبکہ بھارت میں اسٹیٹ کی اصطلاح رائج ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم آگے سفر شروع کریں، میں چاہوں گا کہ ہریانہ کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جائے۔

مجھے اپنی مادری زبان پنجابی کے بعد جو زبان بولنے کا شوق ہے، وہ ہریانوی زبان ہے۔ میں اسے کچھ کچھ بول بھی لیتا ہوں۔ اپنے سفر میں مجھے ہریانہ سے گزرنے کا بھی موقع ملا۔ مجھے جو روانی اس زبان میں نظر آتی ہے، کم ہی کسی اور زبان میں ملی۔

ہریانہ کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے ساتھ ساتھ

Know Your State Haryana (By Experts, Arihant)

Haryana, A Historical Perspective (By Satish Chandra Mittal)

سے بھی مدد لی ہے۔ یہاں میں ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہریانہ کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ اس سے مراد ایک بڑا علاقہ تھا جس میں آج کے ہریانہ صوبے کے اکثر شہر شامل ہیں۔ یہاں بولی جانے والی زبان، رہن سہن اور تہذیبی رویے پنجاب، راجستھان، شمالی علاقوں اور یو پی (دریائے جمنا کے پار) سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ یہ فرق ماضی میں بھی تھا اور آج بھی ہے۔

میرے علم کے مطابق ہریانہ نے ہندوستان کی علمی اور دفاعی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ میں لڑی جانے والی کئی اہم ترین لڑائیاں یہاں لڑی گئیں۔ اس کا مختصر تعارف اس خطے کے شہروں کو جاننے میں دلچسپی کو اور بڑھا دیتا ہے۔

ہریانہ بھارت کی ایک ریاست ہے۔ اس ریاست میں وادیِ سندھ کی تہذیب (Indus Valley Civilization) کے کئی اہم آثار پائے جاتے ہیں، جو انسانی تہذیب کے گہوارے کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اس کی مثال حصار ضلع کے گاؤں رکھی گڑھی اور فتح آباد ضلع کے گاؤں بھرانا میں وادیِ سندھ کی قدیم تہذیب کے کئی مراکز ملے ہیں جو موہنجودڑو سے بے حد مماثلت رکھتے ہیں۔ ایسے کئی آثارِ قدیمہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وادئ سندھ کی تہذیب نہ صرف شہری منصوبہ بندی بلکہ فنِ تعمیر اور صنعت وحرفت میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔

یہ بھی تاریخ سے جاننے کو ملتا ہے کہ یہ وہ خطہ تھا جو قدیم ترین دریاؤں، سرسوتی اور درشدوَتی کے کناروں پر آباد تھا۔ انھی دریاؤں کے کنارے صدیوں قبل سناتن ویدی یا آج کے ہندو تہذیبی و فکری تصورات نے جنم لیا اور مذہبی صحیفے تخلیق ہوئے۔

اس کے علاوہ ہریانہ کے مختلف علاقوں میں آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں کے دوران جین مت کے عروج کے دور سے متعلق قدیم کانسی اور پتھر کے بت دریافت ہوئے ہیں۔ اس سے یہ جاننے کو ملتا ہے کہ جین دھرم کے پیروکار اس خطے میں صدیوں قبل سے آباد تھے اور یہاں مذہبی، ثقافتی اور فکری سرگرمیوں کا مرکز قائم تھا۔ ہریانہ برصغیر میں جین مت کی اشاعت وترویج کا ایک اہم گہوارہ رہا ہے۔

تاریخ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ پشیا بھوتی خاندان نے ساتویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان کے کچھ حصوں پر حکومت کی اور اس کی راجدھانی تھانیسر (Thanesar) تھی۔ اس خاندان کے نمایاں حکمرانوں میں سب سے اہم نام ہرش وردھن کا ہے جو اپنی سیاسی بصیرت، فوجی فتوحات اور علمی سرپرستی کی وجہ سے تاریخ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

جب تیمور نے ہندوستان پر حملے کیے تو اس نے یہاں پر موجود کئی شہروں کو تباہ کیا جن میں سرسا، فتح آباد، سنام، کیتھل اور پانی پت شامل تھے۔ موجودہ ہریانہ کا علاقہ صدیوں تک ہندوستان کی بڑی بڑی سلطنتوں کے زیرِ اثر رہا ہے۔ پانی پت اس لحاظ سے شہرت رکھتا ہے کہ

یہاں برصغیر کی تاریخ کی تین بڑی جنگیں لڑی گئیں (جن کا ذکر اگلے صفحات میں کیا گیا ہے)۔

ہریانہ پر مختلف مقامی اور غیر مقامی سلطنتوں نے حکومت کی، جن میں موریہ سلطنت، گپتا سلطنت، پشیا بھوتی خاندان، پرتیہارا خاندان، تومر خاندان، چوہان حکمران (شکمبھری کے چہمنہ)، غوری سلطنت، دہلی سلطنت، مغل سلطنت، سکھ کنفیڈریسی، درانی سلطنت، مرہٹہ سلطنت، سکھ سلطنت، جارج تھامس، گوالیار ریاست، ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی راج شامل ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ خالصہ دور میں ہریانہ کے کچھ حصے ان کے قبضے میں نہیں رہے۔ برطانوی دور میں یہ خطہ صوبے پنجاب کا حصہ تھا۔ اس دور میں یہاں کئی ریاستیں بھی واقع تھیں جن میں جند، کلسیا، لوہارو، دوجانہ اور پٹودی شامل تھیں، جبکہ کچھ علاقے پٹیالہ ریاست کے زیر اثر بھی تھے۔

پنجاب کے بٹوارے کے وقت ہریانہ، پنجاب کے ان علاقوں کے ساتھ جو ہندو اور سکھ اکثریت پر مشتمل تھے، بھارت کے حصے میں آیا اور اسے مشرقی پنجاب کی ریاست کہا گیا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں بڑی تعداد میں مسلمان اس خطے سے ہجرت کر کے نو قائم شدہ ملک پاکستان چلے گئے اور مغربی پنجاب سے لاکھوں ہندو اور سکھ مہاجرین یہاں آ بسے۔

ہریانہ ایک الگ اسٹیٹ کیسے بنا؟ یہ بھی جاننا ضروری ہے۔

❁ ❁ ❁

پنجابی صوبہ تحریک

سکھوں کی سیاسی جدوجہد

پنجاب کے بٹوارے کے وقت قائداعظم محمد علی جناح نے سکھوں کو ایک الگ علاقہ دینے کی پیشکش کی تھی۔لیکن سکھ قیادت نے یہ پیشکش قبول نہ کی اور بھارت کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ یہاں میں ایک اہم بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر سکھ ایسا نہ کرتے تو طے شدہ معاہدے کے مطابق آج ہریانہ اور مشرقی پنجاب (یعنی اس دور کا سانجھا پنجاب) پاکستان کا حصہ ہوتا۔اس لیے ہندوستان کے ہندوؤں کو سکھوں کا احسان مند ہونا چاہیے کہ ان کی وجہ سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سرحد اٹاری بنی۔ورنہ یہ سرحد دریائے جمنا پر قائم ہوتی۔

پنجاب کے بٹوارے کے بعد سکھوں کو فوراً یہ احساس ہو گیا کہ بھارت میں وہ اپنی علیحدہ شناخت کھو بیٹھے ہیں۔اسی پس منظر میں سکھوں نے ''پنجابی صوبہ تحریک'' کا آغاز کیا۔یہ ایک طویل جدوجہد کی داستان ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنا مقصد حاصل کیا۔اس کی مکمل تفصیل اس کتاب کے احاطے سے باہر ہے۔اس تحریک کا مختصر ذکر پیش ہے۔

اکالی دل نے ''پنجابی صوبہ تحریک'' شروع کی اور بڑے پیمانے پر جلسے، جلوس اور احتجاج کیے۔اس دوران ہزاروں سکھ کارکن گرفتار ہوئے۔ان کا مؤقف تھا کہ جس طرح بھارت کی دیگر ریاستیں لسانی بنیادوں پر تشکیل دی گئی ہیں، اسی طرح پنجاب کو بھی پنجابی بولنے والوں کے لیے علیحدہ صوبہ بنایا جانا چاہیے۔دوسری طرف بھارتی حکومت، بالخصوص پنڈت جواہر لعل نہرو، اس

تحریک کی مخالفت کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ سکھوں کا یہ مطالبہ دراصل ''مذہبی صوبے'' کے قیام کی طرف بڑھ سکتا ہے، جس سے ملک میں علیحدگی پسندی کو فروغ ملے گا۔لیکن سکھوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ آخرکار 1966ء میں پنجاب ری آرگنائزیشن ایکٹ جاری کیا گیا جس کے مطابق پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا:

1- پنجاب (پنجابی بولنے والا علاقہ، جہاں سکھ اکثریت تھی)

2- ہریانہ (ہندی بولنے والا علاقہ)

3- ہماچل پردیش (پہاڑی علاقے)

چنڈی گڑھ کو ایک یونین ٹیریٹری بنا کر پنجاب اور ہریانہ دونوں کا مشترکہ دارالحکومت قرار دیا گیا۔ ہریانہ کے پہلے وزیر اعلیٰ بھگوت دیال شرما بنے، جبکہ ہریانہ کی علیحدہ ریاست کے قیام میں چودھری دیوی لال کا کردار نہایت اہم رہا۔ انھیں اس کمیشن کے قیام کے لیے کوشش کرنے اور ہریانہ کی آزادی کی تحریک کو مؤثر بنانے کا سہرا دیا جاتا ہے۔ یوں 1966ء میں ہریانہ پنجاب سے علیحدہ ہو کر بھارت کی ایک نئی ریاست کے طور پر ابھرا۔

یہاں ایک دکھ والی بات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔ ہریانہ سے پہلی بڑی نقل مکانی پنجاب کے بٹوارے کے وقت ہوئی۔ دوسری مرتبہ یہ نقل مکانی اُس وقت سامنے آئی جب خالصتان تحریک 1980ء کی دہائی میں پنجاب میں ابھری۔ اس تحریک نے سیاسی عدم استحکام اور پرتشدد بغاوت کو جنم دیا۔ سکھوں کے لیے علیحدہ ریاست (خالصتان) کے مطالبے نے علیحدگی پسند گروہوں اور ریاستی سلامتی کے اداروں کے درمیان شدید تصادم پیدا کیا، جس کے نتیجے میں عام شہریوں کی زندگی غیر محفوظ ہو گئی۔ اس بدامنی کے باعث ہزاروں پنجابی خاندان، جن میں ہندو اور سکھ دونوں شامل تھے، زیادہ امن، استحکام اور معاشی مواقع کی تلاش میں ہمسایہ ریاست ہریانہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ ایسے ہی ایک خاندان سے مجھے دہلی میں ملاقات کا موقع بھی ملا تھا۔

ہریانہ کے شہری مراکز میں بڑی تعداد میں پنجابی مہاجرین آباد ہوئے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس ہجرت نے ہریانہ کے سماجی، ثقافتی اور معاشی ڈھانچے کو نئی شکل دی۔ آج حالات

بدل چکے ہیں اور پنجابی ہریانہ کی ترقی، شناخت اور معاشرتی ہم آہنگی کا ایک لازمی حصہ بن چکے ہیں۔ ہریانہ میں جاٹ کل آبادی کا تقریباً تیس فیصد ہیں، جس کی وجہ سے کئی وزیراعلیٰ بھی اسی برادری سے تعلق رکھتے رہے ہیں۔ برطانوی دور اور اس سے پہلے ہریانہ میں سکھ ریاستیں بھی موجود تھیں جیسے جند، کیتھل، حصار، لدوا اور کلسیا۔ زیادہ تر سکھ حکمران پنجاب کی جاٹ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔

❀❀❀

انبالہ

ایک راجپوت کا بسایا ہوا شہر اور انگریزوں کی ایک بڑی چھاؤنی

اب شام ہو رہی تھی اور ہم انبالہ بھی پہنچنے ہی والے تھے۔ میری بس اتنی سی خواہش تھی کہ ہم سورج کی روشنی میں اس شہر کو دیکھ سکیں جس کا ادب، علم اور فلم کی دنیا میں ایک نام ہے اور جس کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تحریکِ آزادی ہند کی ابتدا بھی اسی شہر میں واقع چھاؤنی سے ہوئی تھی۔ یہ وہی مرکز تھا جہاں سے انگریزوں نے پنجاب اور سرحدی علاقوں کو فتح کر کے ان پر حکومت کی۔

انبالہ کا نام سنتے ہی چند اور نام بھی ذہن میں آتے ہیں۔ جن میں وقار انبالوی اور نذیر انبالوی سرِ فہرست ہیں۔ وقار انبالوی ایک مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ اردو کا یہ مشہور شعر جو بالعموم علامہ اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے، انھی کا کہا ہوا ہے:

اسلام کے دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے
ایک ضرب یداللٰہی، اک سجدہ شبیری

ان کے علاوہ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی بھی کئی اہم شخصیات کا تعلق اسی شہر سے ہے، جن میں جوہی چاولہ، اوم پوری اور پاکستانی اداکارہ زیبا اور محمد علی قابلِ ذکر ہیں۔ حال ہی میں وفات پانے والی بھارت کی وزیر خارجہ سشما سوراج کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔ ناصر کاظمی، جو ایک معروف شاعر تھے، ان کی پیدائش بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔ ساغر صدیقی بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے۔

اس قدیم اور اہم شہر بارے جاننے کے لیے میں نے انسائیکلو پیڈیا آف بر ٹانیکا کے ساتھ ساتھ مجھے کئی کتابوں اور مضامین کا مطالعہ کرنا پڑا۔ اس کے لیے تجندر سنگھ والیہ کی کتاب *Haryana The Torch Bearer of 1857* by Tejinder Singh Walia سے استفادہ کیا۔ اس کتاب میں ہریانہ کے تاریخی کردار کو اجاگر کیا گیا ہے، خاص طور پر 1857ء کی جنگِ آزادی میں اس خطے کی قربانیوں اور جدوجہد کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہریانہ صرف ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ تحریکِ آزادی ہند میں علمبردار اور رہنما کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ کتاب ہریانہ کی عوامی مزاحمت، انقلابی کردار اور ان قربانیوں کا ایک مستند حوالہ ہے جو آزادی کی پہلی جنگ میں پیش کی گئیں۔

حالیہ مصنفین نے 1857ء کی پہلی جنگِ آزادی سے متعلق کئی افسانوں اور غلط فہمیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ تجندر سنگھ والیا نے اپنی کتاب ہریانہ: 1857 کا علمبردار میں اس جدوجہدِ آزادی میں ہریانہ کے کردار کو نمایاں کر کے تاریخی ریکارڈ کو درست کرنے کی جراتمندانہ کوشش کی ہے۔ یہ کتاب نہایت بصیرت افروز اور سنجیدہ مطالعہ پیش کرتی ہے۔ مصنف کی یہ تڑپ کہ قومی آرکائیوز میں دبے ہوئے حقائق کو سامنے لایا جائے، یہ کتاب ایسے انکشافات اور اعداد وشمار کو اجاگر کرتی ہے جو مردوں، عورتوں اور بچوں کی جانب سے پیش کی گئی بے مثال قربانیوں کی گواہی دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر انبالہ میں برطانوی حکمرانوں کی عمارتوں میں بھڑک اٹھنے والی آگ وہ پہلا شعلہ تھی جس نے انگریز آقاؤں کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا۔ اس حقیقت کو کسی بھی منطق کے ذریعے کم اہم نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں اور بھی بے شمار مثالیں درج ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف سپاہی ہی نہیں بلکہ عام شہری بھی اس جدوجہد میں شریک تھے۔ انھوں نے غیر انسانی تشدد، ناحق مقدمات اور اچانک دی جانے والی سزائے موت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

اگرچہ آج ہم سب مسائل کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، خواہ وہ ماحولیاتی بحران ہوں، مہنگائی کے دباؤ یا بدعنوانی اور سماجی و معاشی ناانصافی کے مسائل، پھر بھی ہمارے دلوں میں یہ خواہش

زندہ ہے کہ ہم اپنے آزادی کے متوالوں کی قربانیوں کا قرض کسی نہ کسی صورت ادا کریں، چاہے وہ کتنا ہی ناکافی کیوں نہ ہو۔ یہی جذبہ مصنف کو اس جانب لے گیا کہ وہ اپنے ہم وطنوں میں ان قربانیوں کے بارے میں شعور اجاگر کریں۔ مثال کے طور پر ہانسی کی ''لال سڑک'' آج بھی اس ظلم کی دائمی یاددہانی ہے کہ کس طرح حکمرانوں نے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے دردی سے کچل دیا۔ جو شوقِ تحقیق ایک عام تجسس سے شروع ہوا تھا، وہ ایک طویل اور محققانہ جستجو میں بدل گیا۔

اس کے علاوہ شہر کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کا نام امبا نامی راجپوت کے نام پر رکھا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا قیاس ہے کہ اس کا نام دیوی بھونی امبا کے نام پر پکارا جانے لگا تھا۔ ایک اور بات بھی مشہور ہے کہ اس علاقے میں آموں کی پیداوار کی کثرت کی وجہ اس کا نام انبالہ پڑ گیا۔ درست کیا ہے، معلوم نہیں۔

پہلی صدی عیسوی میں یہاں پر بدھ مت کے ماننے والے ایک راجہ کی حکومت تھی اسے سورن بادشاہی بھی کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کا ایک نام ہند پارتھیان بھی تھا۔ اس خاندان کی حکومت تیسری صدی تک قائم رہی۔ اس خاندان کے بارے میں پڑھتے ہوئے ایک نہایت ہی عجیب وغریب بات کا پتہ چلا کہ یہ خاندان ہندوستان کے علاوہ مشرقی ایران کے کچھ حصوں، افغانستان کے مختلف علاقوں اور برصغیر پاک وہند کے شمال مغربی علاقوں، زیادہ تر موجودہ پاکستان اور شمال مغربی ہندوستان کے کچھ حصوں سمیت ایک بڑے علاقے پر حکمرانی کرتا رہا ہے۔ اس سے اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ اہل ہند نے ہندوستان سے باہر نکل کر کبھی کسی جگہ حکومت نہیں کی۔

بامیان افغانستان میں بھی بدھ مت کے آثار اسی دور کے ہیں۔ اس کے علاوہ پشاور میں تخت بائی کے علاقے میں موجود بدھ مت کی عمارات بھی اسی دور کی ہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں اسلام کا آغاز نہیں ہوا تھا اور عیسائیت بھی اتنی طاقتور نہیں تھی تو اس وقت دنیا میں تین مذاہب ہی طاقتور تھے؛ ہندو مت، بدھ مت اور جین مت۔ ان تینوں مذاہب کا تعلق ہندوستان سے ہی تھا۔ اس کے علاوہ یہودی مذہب بھی موجود تھا۔ لیکن شاید وہ بھی کوئی

زیادہ طاقتور نہیں تھا۔

اس علاقے میں آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے کچھ ایسی اشیا بھی ملی ہیں جن کی بنا پر ماہرین کا خیال ہے کہ کسی دور میں یہ علاقے کوشان سلطنت میں بھی شامل رہے تھے۔ چینی سیاح وین سانگ بھی یہاں ہی آیا تھا۔محمود غزنوی بھی اس علاقے پر حملہ آور ہوا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ 1192ء میں غوری نے دوسری جنگ میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعد مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک یہ علاقہ مسلمان حکمرانوں کے ماتحت رہا۔

یہ علاقہ تیمور کے حملے کی زد میں بھی آیا اور اس نے بھی اسے جی بھر کے لوٹا۔کسی دور میں بہلول لودھی بھی یہاں کا گورنر رہا ہے۔مغلوں نے انبالہ کے علاوہ سرہند میں بھی اپنے محلات بنوائے۔مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس علاقے پر سکھوں کی حکومت قائم ہوئی۔ پھر انگریزوں نے اس علاقے کی باگ ڈور سنبھال کر اسے برٹش انڈیا کا حصہ بنالیا۔انھوں نے سکھوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کس کو ساتھی بنایا اور کس کی ریاست پر زبردستی قبضہ کیا یہ ایک طویل داستان ہے جو دلچسپ بھی ہی اور افسوس ناک بھی۔پنجاب انگریزوں کی راہ میں آخری رکاوٹ تھا۔پنجاب پر قبضے کے بعد وہ مکمل طور ہندوستان کے مالک اور کروڑوں لوگ ان کے غلام بن گئے۔

انبالہ کے لوگوں نے 1857ء کی جنگِ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔اس وقت انبالہ ایک اہم فوجی مرکز تھا۔یہاں کے ہندوستانی فوجیوں نے مئی 1857ء کو علمِ بغاوت بلند کیا۔انھیں کامیابی تو نہ ملی لیکن وہ ایک کوشش ضرور تھی۔ہار کی صورت میں سخت ترین سزائیں، جن میں موت کی سزا بھی شامل تھی بھگتنی پڑی۔سزا صرف فوجیوں کو ہی نہیں دی گئی بلکہ عام لوگوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔

بغاوت کرنے والے بھی ہندوستانی تھے اور بغاوت کچلنے والی بھی ہندوستانی ہی تھے!

حکم صرف انگریز کا تھا!

کچھ اس کے تنخواہ دار اور کچھ اس کے سزاوار۔

ابھی حال ہی میں بھارتی حکومت نے اس چھاؤنی کے ایک مقام پر جنگِ آزادی کے شہیدوں کے لیے یادگار بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔جس کے نام، آزادی کی پہلی لڑائی کی یادگار سے

ظاہر ہوتا ہے کہ انبالہ کے لوگوں نے جنگِ آزادی ہند میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ ان کی یادگار بن رہی ہے جو اپنی جان پر کھیل گئے تھے تاکہ اہلِ ہند کو آزادی مل سکے۔

انبالہ میں لکھی شاہ اور تقوال شاہ نام کی دو مساجد ہیں۔ یہاں ان بزرگوں کے مزار بھی ہیں۔ وہ بزرگ کون تھے میں کوشش کے باوجود میں کچھ بھی نہ جان سکا۔ اس وقت انبالہ میں یہ ایک ایسی مشہور جگہ کی حیثیت رکھتی ہے جہاں ہر روز ہزاروں عقیدت مند آتے ہیں۔ لالہ مرلی دھر بھی اسی شہر کے باسی ہیں، جو بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں سے ایک اور کانگرس کے اہم عہدہ دار تھے۔

انبالہ چھاؤنی اور افریقہ کے قیدی

انبالہ چھاؤنی کا قیام 1843ء میں عمل میں آیا۔ اس سے قبل انگریزوں نے کرنال میں ایک فوجی مرکز بنایا تھا۔ کرنال میں ملیریا کی بیماری کی وجہ سے انبالہ میں نیا فوجی مرکز بنایا گیا۔ اس وقت یہ بھارتی فوج کا اہم مرکز ہے۔ میں نے جب انبالہ چھاؤنی سے متعلق مزید پڑھا تو ایک نہایت ہی افسوس ناک بات کا علم ہوا۔

انبالہ چھاؤنی میں گوروں کا ایک قبرستان ہے جہاں جنگ عظیم اول میں مارے جانے والے لوگوں کی قبریں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قبریں بھی ہیں۔ اس قبرستان میں دو لاکھ سے زائد قبریں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے انگریزوں کے نزدیک یہ ایک اہم قبرستان ہے۔ اس کی دیکھ بھال بھی مناسب طور پر کی جاتی ہے۔

میں نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا کہ انیسویں صدی کے آغاز میں جنوبی افریقہ میں انگریزوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ جنگ کی اور فتح حاصل کی تھی۔ اس جنگ کو بوئر کی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پچاس ہزار سے زائد افریقی لوگوں کو جنگی قیدی بنایا گیا۔ انگریزوں نے جنگی قیدیوں پر ہونے والے اخراجات اور حفاظتی نقطۂ نظر کے پیش نظر پچیس ہزار کے قریب جنگی قیدیوں کو اپنے دیگر مفتوحہ علاقوں میں بھجوا دیا۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد ہندوستان بھی لائی

گئی، جنھیں یہاں مختلف شہروں میں رکھا گیا کچھ کو انبالہ بھی لایا گیا۔ ان پچیس ہزار قیدیوں میں سے شاید ہی کسی کو واپس اپنے ملک جانا نصیب ہوا ہو۔

انبالہ کے گوراقبرستان میں جنوبی افریقہ کے جنگی قیدیوں کی قبریں بھی موجود ہیں۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انھوں نے غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف جنگ کی اور وہ یہ جنگ ہار گئے تھے۔ میں نے جب یہ سب پڑھا تو مجھے بے حد افسوس ہوا کہ کس طرح پچیس ہزار لوگوں کو ان کے دیس سے دور دیار غیر میں لا کر ان سے مشقت کروائی گئی اور ان پر اپنے گھر واپس جانے کے تمام راستے مسدود کر دیے۔۔۔اور وہ دیارِ غیر میں اپنوں سے دور، بے یار و مددگار موت کی وادی میں چلے گئے۔۔۔

یہ تھا ان کمزور لوگوں سے انگریزوں کا سلوک۔۔۔

انبالہ میں مسلمان آبادی کا صرف ایک فیصد ہیں۔ آزادیِ ہند سے قبل انبالہ میں مسلمان کافی تعداد میں بستے تھے، آزادیِ ہند کے موقع پر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے ہجرت کی۔ ان میں سے بہت سے لوگ سرگودھا میں آبسے۔ انھوں نے سرگودھا میں انبالہ مسلم کالج بھی بنایا۔ اس کے علاوہ کئی لوگوں نے اپنے کاروبار کے نام بھی اپنے شہر کے نام پر رکھے۔ انبالہ ان بدقسمت شہروں میں سے ایک ہے جہاں آزادیِ ہند کے وقت مسلمانوں کا لہو پانی کی طرح بہایا گیا۔

یہ خون کس نے کیا۔۔۔کون تھا اس کا ذمہ دار۔۔۔سب خاموش ہیں۔۔۔لیکن کب تک۔۔۔تاریخ ایک دن خود ہی بولے گی۔۔۔ان شاء اللہ

انھی سوچوں میں گم سفر جاری تھا اور شہر کو دکھ بھری نظروں سے دیکھتا رہا، جو کبھی مسلم تہذیب کا گڑھ تھا، اب وہاں ایک فیصد بھی مسلمان نہیں بستے، جہاں بے شمار مساجد ویران ہو گئیں، کوئی تو تھا جس کی وجہ سے اللہ کے گھر جو صدیوں سے آباد تھے، ویران ہوئے، کس نے کیا کیا، اب یہ سب تاریخ کا حصہ ہے جو آہستہ آہستہ سامنے آرہا ہے۔

شاہ آباد مارکنڈا

ایک شہر جس میں ایک مسجد کو گردوارے میں تبدیل کیا گیا: ہم ابھی کوروشیتر کی باتیں کر

رہے تھے کہ ہمیں ایک چھوٹے سے شہر سے گزرنا پڑا جس کا نام شاہ آباد کنڈا تھا (عام طور پر اسے شاہ آباد ہی کہا جاتا ہے)۔ شاہ آباد ریاست ہریانہ کے ضلع کوروشیتر میں واقع ہے۔ یہ دریائے مارکنڈا کے بائیں کنارے پر واقع ہے جو انبالہ چھاؤنی سے بیس کلومیٹر جنوب میں ہے جب کہ کوروشیترا سے بائیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔

اس شہر کی ویب سائٹ سے بہت کچھ جاننے کو ملا (https://shahbad.haryanaonline.in)۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کو شہاب الدین غوری نے آباد کیا اور اسی کے نام پر اس کا نام شاہ آباد رکھا گیا تھا کیونکہ اس سے قبل اس شہر کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس شہر کی کوئی قدیم تاریخ نہیں ہے لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ شہر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

غوری نے چوہان کے ساتھ دوسری جنگ اسی مقام پر کی تھی۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کی خوشی میں اس نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام بھی اپنے نام پر رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے ایک جرنیل قطب الدین ایبک کو اس علاقے میں ایک وسیع جاگیر بھی عطا کی۔ پھر ایک وقت آیا جب بابر نے لودھی کے ساتھ جنگ کی۔ اس جنگ میں شاہ آباد کے لوگوں نے ابراہیم لودھی کی حمایت کی اور بابر کے خلاف جنگ میں حصہ بھی لیا۔ بابر نے یہ جنگ جیتنے کے بعد اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ یہاں کے لوگوں کا جرم صرف یہ تھا کہ انھوں نے بابر کے مقابلے میں ابراہیم لودھی کی حمایت کی تھی۔ لودھی بھی ایک غیر ملکی مسلمان تھا جس نے یہاں پر آ کر اپنی حکومت قائم کی جبکہ دوسرا مسلمان وسط ایشیا سے آ کر خود ہندوستان کا حکمران بننا چاہتا تھا۔ دونوں ہی مسلمان تھے اور دونوں ہی ہندوستان کے باہر سے آئے تھے۔ اس جنگ میں مقامی لوگوں نے ابراہیم لودھی کی حمایت کی جس کی انھیں بہت سخت سزا ملی۔ اس شہر کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے مغل شہنشاہ بابر اور ہمایوں بھی کچھ عرصہ یہاں رہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس شہر میں مغلوں کے دور میں بھی مسلمانوں کی اکثریت

تھی۔ یہاں پر مغلوں کے دور کا ایک قلعہ بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعے پر بندہ سنگھ بہادر نے حملے کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس علاقے میں ایک تاریخی گوردوارے کے ساتھ ساتھ کئی اہم مندر بھی پائے جاتے ہیں۔ آزادیِ ہند کے بعد جب مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا تو جو بچ گئے وہ جان بچا کر پاکستان چلے گئے اور اس شہر میں پاکستان سے نقل مکانی کر کے آنے والے پنجابی، سکھوں اور ہندوؤں کو آباد کیا گیا۔ اب اس شہر میں مسلمان آبادی کا صرف دو فیصد ہیں۔

شاہجہاں کی شہرت تاج محل کی وجہ سے ہے، جس سے یوں لگتا ہے کہ شاہجہاں نے صرف تاج محل ہی بنایا تھا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس نے بے شمار دیگر عمارات بھی بنوائیں۔ اس نے آگرہ کا قلعہ بھی بنوایا اور لال قلعہ دلی کی بنیاد بھی رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ہندوستان کے طول وعرض میں بے شمار مساجد بھی بنوائیں۔ شاہ آباد، مغلیہ سلطنت کا ایک اہم شہر تھا۔ لاہور کے راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے ان کا یہاں آنا جانا بھی تھا۔ اسی وجہ سے سترہویں صدی میں شاہجہاں نے یہاں پر ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کروائی۔

جب 1757ء میں مغلوں کی سلطنت کمزور ہوئی تو اس علاقے پر مراٹھوں کا قبضہ ہو گیا لیکن ان کا بھی جلد ہی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد مقامی سکھوں نے سر اٹھایا اور ایک بہت بڑے علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ گو کہ مرکزی طور پر ان کی کوئی بہت بڑی ریاست نہیں تھی لہذا وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئے اور اس کے ساتھ ساتھ کئی آزاد گروہ اپنے طور پر لوٹ مار بھی کر رہے تھے۔ 1770ء اور 1780ء کے درمیانی عرصے میں شاہ آباد میں واقع ایک شاندار پرانی مسجد جسے 1630ء میں مغل بادشاہ شاہجہاں نے تعمیر کیا تھا کو ایک گوردوارے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کام کے لیے سکھوں نے مسجد کے میناروں کو مسمار کر دیا اور باقی سب کچھ ویسا ہی رہنے دیا۔ اس گوردوارے کا نام مست گڑھ رکھا گیا۔

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر اس گوردوارے کا نام مست گڑھ رکھا جاتا جو مسجد کی جگہ پر بنایا جاتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسا بہت سی مساجد کے ساتھ کیا گیا۔ گوردوارہ

مست گڑھ قصبے کے شمال مشرقی حصے میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ اس کے مرکزی گنبد کے نیچے واقع مین ہال کو سکھ اب اپنی عبادت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق پاکستان بھر میں کوئی ایسا گوردوارہ نہیں ہے جسے مسجد میں تبدیل کیا گیا ہو۔ میں کسی بھی ایسے واقعے سے بھی لاعلم ہوں جس میں کسی مسجد کو مندر یا چرچ میں تبدیل کیا گیا ہو۔ ایسا صرف سکھوں نے ہی کیا ہے۔ جو کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔ میں نے ابھی حال ہی میں اس کی کچھ تصاویر دیکھی ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مینار مسمار کر دینے کے باوجود شکل وصورت سے یہ عمارت اب بھی ایک مسجد کی مانند لگتی ہے۔

یہ مسجد پچھلے ڈھائی سو سال سے ایک گردوارہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد آزادیِ ہند سے قبل بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کیونکہ اگر مسلمان زیادہ تعداد میں ہوتے تو شاید وہ سکھوں کو ایسا کرنے سے روک سکتے تھے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی حالیہ تعداد دو فیصد سے بھی کم ہے۔ باقی جو لوگ بھی تھے یا تو وہ شہید کر دیے گئے یا پاکستان ہجرت پر مجبور ہو گئے۔

اس کے خلاف آج تک کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی۔ ابھی بھی کسی طرف سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ اسے دوبارہ مسجد میں تبدیل کیا جائے۔ یاد رہے کہ جس وقت شاہجہاں نے یہ مسجد بنوائی تھی اس وقت سکھوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاہجہاں نے کسی گوردوارے کو گرا کر مسجد بنائی۔ میں نے مزید تفصیلات جاننے کی کوشش کی تو علم ہوا کہ سکھوں نے اپنی ویب سائٹ پر بھی اس گردوارے کا ایسے ہی ذکر کیا ہوا ہے:

(https://www.sikhiwiki.org/index.php/Gurdwara_Mastgarh)

ایک اور تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ جہاں بھی انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی وہاں کسی مسجد کو بھی مندر، گرجا یا گردوارے میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ یہ سب صرف اسی وقت ہوا جب وہاں سکھوں کی حکومت تھی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب لاہور میں واقع شاہی مسجد پر بھی سکھوں کا قبضہ تھا لیکن انگریزوں کے آجانے کے بعد کسی مسجد پر کوئی بھی سکھ قابض نہ ہو سکے۔

شاہ آباد میں ایک خانیوال خالصہ سکول بھی قائم ہے۔اس کی کہانی بھی بے دل چسپ ہے۔ میرے لیے یہ بات حیران کر دینے والی تھی کہ خانیوال تو مغربی پنجاب میں واقع ہے۔ پھر یہاں اس نام سے سکول کا مطلب کیا؟ اس بارے پتا چلا کہ پنجاب کے بٹوارے سے پہلے سردار نرائن سنگھ گل نے خالصہ ہائی اسکول خانیوال میں قائم کیا تھا۔وہ اس کے پہلے پرنسپل بھی تھے۔ وہ تحصیل کبیر والا کے رہنے والے تھے۔ پنجاب کے بٹوارے کے بعد وہ شاہ آباد آ بسے اور یہاں انھوں نے اسی نام سے ایک سکول بنایا۔ یہ سکول آج بھی موجود ہے۔ میں نے اس کی تصویر بھی دیکھی ہے۔ یہ بھی میں نے پڑھا ہے کہ پنجاب کے بٹوارے سے پہلے یہاں کے مسلمانوں نے اسلامیہ ہائی سکول بنایا تھا۔ پنجاب کے بٹوارے کے بعد جب مسلمان یہاں سے چلے گئے تو خالی عمارت میں یہ سکول قائم کیا گیا۔ بعد میں اس میں قابلِ ذکر توسیع کی گئی۔

یہ تھی اپنے دیس کی محبت اور یہ ہوتی ہے تعلیم دوستی۔

میں یہ سب جان کر اداس بھی ہو گیا اور مجھے بے حد افسوس بھی ہوا۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے مسلمانوں سے بدلہ نہ لیا ہو۔ جب بھی کسی کو موقع ملا اس نے اپنا پرانا حساب ضرور چکتا کیا۔ ایسا ہی شاہ آباد میں بھی ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمان پھر کبھی بھی اپنی کھوئی ہی عزت بحال نہ کر سکے۔ اسی شہر میں سکھوں اور مغلوں کے درمیان کئی جنگیں بھی ہوئی ہیں۔ جن کی تفصیل جان کر میں ایک مدت تک اداس رہا۔ آزادیِ ہند کے نتیجے میں کئی علاقے مسلمانوں سے بالکل ہی خالی ہو گئے۔ جس کی وجہ سے وہاں پر مساجد بھی ویران ہو گئیں۔ انھی سوچوں میں گم ہم اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

ہمارے راستے میں ایک تاریخی شہر، کوروشیتر آ رہا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں مہا بھارت کی جنگ ہوئی اور یہاں سے ہی ہندو مذہب کا آغاز بھی ہوا۔ مجھے اس شہر کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ آیئے آپ بھی یہ جانیں کہ شمالی ہندوستان سے کس طرح ہندو دھرم کی ابتدا ہوتی ہے۔ میرے علم کے مطابق شمالی ہندوستان کا یہ علاقہ تاریخ ہند میں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

کروکشیتر

جہاں مہابھارت کی جنگ ہوئی اور یہیں سے ہندومت نے جنم لیا: تاریخ کی کتابوں کے مطابق کوروشیتر (Kurukshetra) وہ علاقہ ہے جہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان ایک بڑی جنگ ہوئی تھی۔اس شہر کا نام بھی کوروؤں کے بادشاہ کورو کے نام پر رکھا گیا۔اس بات کے ثبوت کے طور پر بے شمار دلائل بھی دیے جاتے ہیں اور اکثر تاریخ دان اس بات سے متفق بھی ہیں لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کسی شہر کا نام نہیں تھا بلکہ اس پورے علاقے کو کروکشیتر کہتے تھے۔ یہ علاقہ مشرق کی طرف سہارنپور اور جمنا ندی تک،مغرب کی طرف سرہند،جنوب کی سمت دہلی اور میوات جبکہ شمال کی طرف ہمالیہ کے پہاڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا آف بر ٹانیکا کے مطابق یہ علاقہ جہاں آج کروکشیتر واقع ہے، ہندوستان میں آریاؤں کی ابتدائی بستیوں میں سے ایک تھا(تقریباً1500 قبل مسیح)۔اس کی تاریخ مہابھارت کی داستانوں سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ بھگوت گیتا کے آغاز کا ذکر بھی ملتا ہے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق کروکشیتر کے علاقے میں ہندوؤں کے 350 سے زیادہ مذہبی مقامات ہیں جنھیں ہندو روایت میں نہایت تقدس حاصل ہے۔اس علاقے کا قصبہ تھانیسر (Thanesar) ایک زمانے میں مشہور حکمران راجہ ہرس وردھن (647–606ء) کا پایۂ تخت تھا۔ یہ شہر اپنی تاریخی،مذہبی اور علمی اہمیت کے باعث آج بھی ہندوستان کے اہم مقامات میں شمار ہوتا ہے۔

کروکشیتر، ہندوؤں کے نزدیک ایک انتہائی مقدس مقام مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کورو بادشاہ نے آٹھ بہترین انسانی خوبیوں کو پروان چڑھانے کے لیے دریائے سرسوتی کے کنارے ایک قطعہ زمین کا انتخاب کیا۔ ان آٹھ خوبیوں کے نام کچھ یوں ہیں؛سادگی (تپاس) سچائی (ستیہ) معافی (کشما)،مہربانی (دیا)، پاکیزگی (شودھ)، صدقہ (دان) عقیدت (یجنا) اور طرزِ عمل (برہماچاریہ)۔ ہندو مذہب کی بنیاد بھی انھی آٹھ خوبیوں پر رکھی گئی ہے۔اس پر کوئی عمل کتنا کرتا ہے وہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔

اس جگہ کے متعلق ہندوؤں کا یہ ماننا ہے کہ جو بھی اس سرزمین پر مرے گا وہ جنت میں

جائے گا (ہندوؤں میں بھی کامیابی کے انعام کے طور پر اگلی زندگی میں ملنے والے مقام کو جنت ہی کہتے ہیں)۔

انسائیکلو پیڈیا آف بر ٹانیکا میں درج ہے کہ شہر کا عظیم ذخیرہ آب (ریز روائر) راجہ کورو نے تعمیر کروایا تھا، جو ہندو رزمیہ مہا بھارت کے کوروؤں اور پانڈوؤں کے جد امجد مانے جاتے ہیں۔ اس خطے کی تاریخی اہمیت میں بہت سے مندر، ایک قدیم مسلم قلعہ اور شیخ چلی جلال کا مقبرہ شامل ہیں۔ شیخ چلی، (جن کا انتقال 1582ء میں ہوا) کا یہ مقبرہ آٹھ کونوں پر مشتمل اور ہلکے سفید سنگِ مرمر سے تعمیر شدہ ہے۔ جدید دور میں اس شہر کی علمی اہمیت بھی بڑھ گئی جب 1956ء میں یہاں کرکشیتر یونیورسٹی قائم کی گئی، جو آج اعلیٰ تعلیم کا ایک نمایاں مرکز ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک چینی سیاح سوآنزانگ نے بھی اس علاقے کا دورہ کیا تھا۔ یہ علاقہ چوتھی صدی قبل مسیح میں موریہ سلطنت کا حصہ بھی تھا۔ اس کے نتیجے میں یہاں بدھ مت کو عروج ملا۔ یہ ایک طویل تاریخ ہے کہ کس طرح موریہ خاندان، گپتا خاندان اور پشیوبھوتی خاندان کے علاوہ بھی کئی لوگوں نے اس علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے کتنی جنگیں کیں۔ تاریخ کے مطابق محمود غزنوی نے 1014ء میں اس علاقے پر حملہ کر کے یہاں موجود ہندو ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ غوری کے بعد ایبک کے دور میں یہ علاقہ دہلی سلطنت کا ایک اہم حصہ بن گیا۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب تیمور نے اس شہر پر حملہ کیا اور حسب معمول لوٹنے کے بعد اسے تہہ و بالا کر دیا۔ تیمور صاحب جہاں بھی گئے انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن اس کے جانے کے بعد اس کے تباہ کیے ہوئے علاقے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ ایسا ہی کروکشیتر کے ساتھ بھی ہوا۔ سلاطین دہلی کی کمزوری کے باعث ایک سید خاندان نے بھی اس علاقے پر حکومت کی۔ لودھی بھی اس علاقے کا حاکم رہا۔ 1526ء میں بابر کی فتح کے بعد کروکشیتر مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اکبر کے دور میں اسے بے حد عروج حاصل ہوا۔ اس وقت کوروشیتر صرف ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں سمیت سب کے لیے ایک روحانی مرکز بن گیا تھا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب یہ علاقہ مراٹھوں کی سلطنت کا حصہ بنا۔ اس علاقے کے آخری حکمران

انگریز تھے۔آزادیِ ہند کے بعد اس علاقے نے بھی آزادی حاصل کی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقامی ہندو راجہ کی ریاست کے خاتمے کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک یہاں پر مسلمان، مراٹھے، اور انگریز حاکم رہے۔ یہ شہر ہندوؤں کے نزدیک نہایت ہی مقدس مقام مانا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال حال ہی میں حکومت کا یہ اعلان ہے کہ اس شہر کی میونسپل کارپوریشن کی حدود میں گوشت کی خرید وفروخت پر مکمل پابندی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں درج ہے کہ کروکشیتر میں ہندوؤں کے کئی مقدس مقامات ہیں۔جن میں سب سے اہم برہما سرور (تالاب) ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایشیا کا سب سے بڑا تالاب ہے۔ ہر سال لاکھوں ہندو اس تالاب میں مقدس غسل لینے آتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس تالاب میں نہانے سے ان کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک اور تالاب بھی موجود ہے۔ یہاں پر جیوتی سر کا ایک مشہور مقام بھی موجود ہے جس کے بارے میں ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس جگہ پر بھگوت گیتا کو ارجن کے سپرد کیا گیا تھا۔اس شہر کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں 85 فیصد سے زائد ہندو بستے ہیں۔حالانکہ یہ علاقہ پنجاب سے منسلک ہے جہاں سکھوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔اس شہر میں مسلمان آبادی کا صرف دو فیصد ہیں، جو کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

2019ء میں کروکشیتر کے نام سے ایک فلم بھی بنائی گئی۔اس فلم کو جے کے بھاروی نے لکھا اور رنا گنا نے اس کی ہدایت کاری کی۔ یہ فلم مہا کاوی پر مبنی ہے۔اس فلم میں مہابھارت میں بیان کی جانے والی جنگ کی کہانی بیان کی گئی ہے۔اسے کئی زبانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ مذہبی کہانی ہونے کی وجہ سے اس فلم کو کافی شہرت ملی۔

❀❀❀

تھانیسر

ایک تاریخی قصبہ

ہم کروکشیتر سے گزر رہے تھے تو نقشے سے معلوم ہوا کہ ہمارے بائیں طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھانیسر نامی ایک تاریخی قصبہ موجود ہے۔تھانیسر کا نام سن کر مجھے ایک عظیم عالم کی یاد آئی جنھیں جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی،ان کا نام مولانا محمد جعفر تھانیسری تھا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ میں اس قصبے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ مجھے اس کی تاریخ کو مزید جاننے کا شوق پیدا ہوا میں نے جو کچھ اس قصبے اور مولانا محمد جعفر تھانیسری کے بارے میں جانا،اس کا ایک مختصر احوال پیش خدمت ہے۔

تھانیسر، ہریانہ میں دریائے سرسوتی کے کنارے واقع ہندوؤں کا ایک مقدس قصبہ ہے۔ یہ شہر دہلی سے 160 کلومیٹر شمال مغرب میں واقع کروکشیتر ضلع میں واقع ہے۔اب ایک طرح سے کروکشیتر شہر ہی کا حصہ بن گیا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک ہندو راجہ پربھاکروردھن ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں تھانیسر کا حکمران تھا۔شیخ چلی کا مقبرہ بھی اسی علاقے میں ہے۔تھانیسر کا موجودہ قصبہ ایک قدیم ٹیلے پر واقع ہے۔اس ٹیلے کے پاس ساتویں صدی عیسوی میں بنائی گئی کچھ عمارتوں کے کھنڈرات بھی ملتے ہیں۔ ٹیلے سے ملنے والے آثار قدیمہ کو دیکھ کر ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ علاقہ گپتا دور میں بھی آباد تھا۔مسلمانوں کی آمد تک اس علاقے پر کئی ہندو راجاؤں نے حکومت کی اور محمود غزنوی نے 1011ء میں اس ہندو ریاست

کا خاتمہ کر دیا۔اس علاقے کی ایک اہم جنگ 1567ء میں مغل بادشاہ اکبر اور راجپوتوں کے درمیان دریائے سرسوتی کے کنارے تھانیسر کے قریب لڑی گئی۔ یہ اس وقت کی ایک بڑی جنگ مانی جاتی ہے۔مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد تھانیسر مراٹھوں کے قبضے میں آ گیا۔

مراٹھوں کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور اسے برٹش انڈیا کا حصہ بنالیا۔ آزادیِ ہند سے قبل تھانیسر ایک معمولی سا گاؤں تھا۔ آزادیِ ہند کے بعد یہاں ایک بہت بڑا مہاجر کیمپ لگایا گیا جہاں پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو رکھا گیا۔ اس طرح یہ گاؤں ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ اس شہر میں مغل دور کی عمارتوں کے نشانات بھی پائے جاتے ہیں۔

اس شہر سے متعلق دو اہم تاریخی واقعات بھی بے حد مشہور ہیں۔ایک تو یہ کہ اس علاقے میں سکھوں کے چار گورو دورہ کر چکے ہیں جن کی یاد میں یہاں چار گوردوارے بھی بنائے گئے ہیں۔ دوسرا اس علاقے کے لوگوں کا تحریکِ آزادی ہند میں حصہ لینا ہے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد بغاوت کے جرم میں انگریزوں نے یہاں کے کئی سو افراد کو سرِ عام پھانسی دی۔اس کے علاوہ بہت سوں کو ملک بدر بھی کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ علاقے کے چودھریوں کی جائیدادیں بھی ضبط کی گئیں۔جن لوگوں کو کالے پانی کی سزا دی گئی ان میں مولانا محمد جعفر تھانیسری بھی شامل تھے۔اس شہر میں ہندوؤں کی آبادی نوے فیصد سے بھی زیادہ ہے جبکہ سکھ آبادی کا چھ فیصد اور مسلمان صرف ایک فیصد ہیں۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری

ایک عظیم عالم، جنگِ آزادی کا مجاہد، کالے پانی کا قیدی: 1838ء میں مولانا محمد جعفر، تھانیسر میں پیدا ہوئے۔بچپن ہی میں آپ کے والد محترم وفات پا گئے۔ چند سالوں کی تعلیم کے بعد آپ نے عرائض نویسی شروع کر دی اور اس میں بے حد مہارت حاصل کی۔ آپ نے تحریک آزادی ہند میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔انبالہ سازش کیس میں آپ پر مقدمہ چلا۔

1864ء میں جب آپ کی عمر صرف 26 سال تھی تو انگریز جج نے آپ کو سزائے موت

سنائی۔ آپ نے جج سے کہا کہ موت اور زندگی کا فیصلہ تو اللہ کے اختیار میں ہے کون جانتا ہے کہ موت کسے پہلے آئے گی؟ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جج کی موت واقع ہوگئی۔ ایک اور عدالت نے مولانا کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی اور آپ کو کالا پانی بھیج دیا گیا جہاں آپ نے زندگی کے اٹھارہ سال قید کی حالت میں گزارے۔ آپ نے قید کے دوران گزارے دن رات پر مبنی اپنی آپ بیتی بھی لکھی۔ جو اردو زبان میں پہلی اہم آپ بیتی ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کی خاطر کن لوگوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔ آپ نے کئی کتابیں بھی تحریر کیں جن میں سب سے مشہور آپ کی آپ بیتی کالا پانی تواریخ عجیب ہے۔

یہ تھے وہ لوگ جو اس قصبے سے تعلق رکھتے تھے جہاں سے ہم آج گزر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

مولانا نے جس کالے پانی میں قید کاٹی اس کا مختصر تعارف یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

جزائر انڈمان عرف کالا پانی: تاریخی کتب میں یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ انگریزوں کے دور میں جب بھی کسی مجاہد آزادی یا کسی اور جرم میں ملوث شخص کو عمر قید کی سزا دی جاتی تو اسے کالا پانی بھیج دیا جاتا۔ ان جزائر کا نام نکوبار اور انڈمان تھا لیکن عرف عام میں اسے کالا پانی کے نام سے ہی جانا جاتا تھا۔ یہ جزائر خلیج بنگال میں چنائی سے 1350 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ برما سے بھی ان کا فاصلہ کافی زیادہ ہے۔ یہاں پر ایک جیل بنائی گئی تھی اور اس جیل میں ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک سے بھی عمر قید پانے والے لوگوں کو لا کر رکھا جاتا تھا۔

جب میں مولانا جعفر تھانیسری کے بارے میں پڑھ رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ انھیں بھی اسی کالا پانی میں لا کر ایک جیل میں رکھا گیا تھا۔ انگریزوں نے 1782ء میں اس جزیرے پر قبضہ کر کے یہاں پر کچھ تعمیرات بھی کیں۔ اس کے بعد 1857ء میں اسے انتظامی طور پر بھی استعمال کیا گیا اور بہت سارے دفاتر بھی بنائے گئے۔ اب اس جزیرے کا نام جنگ آزادی کے ایک مشہور نیتا جی سبھاش چندر بوس کے نام پر رکھا گیا یہاں پر ایک پھانسی گھاٹ بھی موجود ہے۔

ایک مرتبہ وائسرائے ہند لارڈ میو ان جزیروں پر آیا۔ جب وہ جانے لگا تو ایک قیدی

(جس کا نام شیر علی آفریدی تھا) نے موقع پا کر خنجر کے وار کر کے اسے قتل کر دیا۔ شیر علی، جو انگریزوں کی پولیس میں ملازمت کرتا تھا کا تعلق خیبر ایجنسی کے علاقے تیرہ سے تھا اور وہ پشاور کے انگریز کمشنر کے ساتھ بھی کام کرتا رہا تھا۔ شیر علی کی بہادری اور جانثاری کی وجہ سے اسے بہت سے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ اس نے خاندانی دشمنی کی بناء اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کر دیا تھا جس پر اسے موت کی سزا سنائی گئی جو بعد میں عمر قید میں بدل دی گئی اور اسے کالا پانی بھیج دیا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس جزیرے پر صرف سیاسی قیدی ہی نہیں بلکہ عام مجرم بھی رکھے جاتے تھے۔

میں نے حال ہی میں کچھ ویڈیوز دیکھی ہیں جن میں اس جگہ کا تفصیلی تعارف کروایا گیا ہے اور وہاں موجود ایک عجائب گھر بھی دکھایا گیا ہے جس میں ان تمام لوگوں کی تصاویر لگی ہوئی ہیں جنھیں جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں سزا کے طور پر اس جگہ پر بھیجا گیا تھا۔ ان لوگوں میں جعفر تھانسیری صاحب کے علاوہ بھی کئی دیگر نامی گرامی علما بھی شامل ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنگِ آزادی میں علما ہند نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

شیخ صوفی عبدالرزاق عرف شیخ چلی

بچپن سے ہی ہم شیخ چلی کے بارے میں سنتے آئے ہیں۔ خاص طور پر بچوں کے لیے شیخ چلی کی کہانیاں بہت ہی مشہور ہیں۔ وہ ہوائی قلعے بنانے، خیالی پلاؤ پکانے اور اپنی بے وقوفانہ حرکتوں کی وجہ سے بچوں میں بہت مشہور تھا۔ میں بھی بچپن میں اس کی کہانیاں سنا کرتا تھا۔ شاید ہی کوئی بچہ ایسا ہو جس نے اس کی کہانی نہ سن رکھی ہو۔ بچے اس کی باتوں سے بے حد محظوظ ہوتے تھے۔

ابھی ہم کوروشیتر میں ہی تھے کہ مجھے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ تھانیسر میں (جو کوروشیتر کے قریب ہی واقع ایک قصبہ ہے) شیخ چلی کا مقبرہ بھی ہے۔ وہ اپنے وقت کے ایک بڑے عالم تھے۔ یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ ہم جسے شیخ چلی سمجھتے تھے اس کا تعلق تو کہیں وسط ایشیا سے محسوس ہوتا تھا کیونکہ اس کا لباس اور باتیں ہی کچھ ایسی تھیں اور مجھے یہ بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ کوئی بزرگ

تھے لیکن جب میں نے مزید تفصیل جانی تو پتہ چلا کہ شیخ چلی تو ایک بہت بڑے بزرگ تھے اور وہ شہنشاہ، شاہ جہاں کے بڑے بیٹے مغل شہزادے دارا شکوہ کے استاد بھی مانے جانے تھے۔ کہتے ہیں کہ دارا شکوہ کے روحانی استاد تو میاں میر صاحب (جن کا مزار لاہور میں ہے) تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ شیخ چلی کے بھی چاہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے اسلامی فنِ تعمیر کے بارے معلومات فراہم کرنے والی ایک ویب سائٹ سے مدد لی ہے:

(https://www.theislamicheritage.com/detail/Sheikh-Chilli-s-Tomb)

شیخ چلی کا اصل نام صوفی عبدالرحیم عبدالکریم عبدالرزاق تھا لیکن وہ شیخ چلی کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کا تعلق قادریہ سلسلے سے تھا۔ ان کی پہچان ان کا علم اور فراخ دلی تھی اس سب معلومات کے بعد میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان کے نام پر ایک مزاحیہ کردار کیسے بنا؟ باوجود کوشش کے مجھے یہ علم نہ ہو سکا۔

اس موقع پر مجھے یاد آیا کہ ہمارے سکول میں میرے اردو کے استاد محترم غلام رسول صاحب نے بتایا تھا کہ کچھ لوگوں نے اردو میں استعمال ہونے والی کئی اصطلاحوں کو بہت غلط طریقے سے بھی پیش کیا ہے۔ اس سے متعلق مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے، جو ایک ہندوستانی مسلمان عالم اور مذہبی شخص تھے، ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ میں وہ کتاب مکمل پڑھ تو نہ سکا لیکن اس کتاب کی ایک دو باتیں مجھے اب بھی یاد ہیں۔ میرے استاد محترم جناب غلام رسول صاحب نے بتایا تھا کہ اردو میں وغیرہ وغیرہ لکھنے کے لیے زید و بکر کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح، لکھے موسیٰ پڑھے خدا کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک خدا کے پچھواڑے کی اصطلاح بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شیخ چلی ان کا لقب ہوگا لیکن اسے ایک مزاحیہ کردار کا نام دینا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو سکتا ہے۔

صوفی عبدالرحیم عبدالکریم عبدالرزاق کا مقبرہ فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ یہ مزار ایک بڑے احاطے پر مشتمل ہے۔ احاطے میں ایک اور مقبرہ بھی ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شیخ چلی کی اہلیہ کا ہے۔ اس مزار کے ساتھ ہی ایک مدرسہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہاں

ایک ایسی مسجد بھی ہے جسے پتھروں والی مسجد کہا جاتا ہے جو سرخ رنگ کے پتھروں سے بنائی گئی ہے۔اس مزار کی ایک اور خاص بات یہاں پر مغل باغات کا ہونا ہے۔ میں نے حال ہی میں اس کی کئی وڈیوز بھی دیکھی ہیں جس سے اس کی خوب صورتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت یہ مزار حکومت ہند کے زیرِ نگرانی ہے اور اسے آثار قدیمہ کی فہرست میں رکھا گیا ہے۔

میں نے اس مزار بارے یہ بھی جانا کہ اسے ہریانہ کا تاج کہا جاتا ہے۔اس عمارت کی خوبیوں بارے ایک مضمون بھی پڑھنے کو ملا جسے Moby Sara Zachariah نے لکھا ہے (https://www.sahapedia.org/taj-haryana-tomb-sheikh-chilli)۔اس مضمون میں اس عمارت بارے بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔

کیتھل میں بارہ سو سال پرانا مندر اور جاٹ حکمرانوں کا بنایا ہوا قلعہ: یاد رہے کہ ہم اس وقت ہریانہ میں سفر کر رہے ہیں۔ اس علاقے میں قائم جاٹوں کی ریاست کا نام بھائی ریاست تھا۔ ان کے دور میں یہاں پر کافی عمارتیں بنائی گئی تھیں اور ان میں سے صرف ایک قلعہ ہی کسی حد تک اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ یہ قلعہ کم ایک بہت بڑا باغ ہے جس میں بڑی بڑی عمارتیں موجود ہیں۔

انھی کے دور کی کیتھل میں ایک تین منزلہ باؤلی (ایک گہرا کنواں جس کے چاروں طرف سیڑھیاں ہوتی ہیں) بھی بنائی گئی جسے بھائی کی باؤلی کہتے ہیں۔اس کی تعمیر یہاں کے جاٹ راجہ کے حکم پر اٹھارھویں صدی میں ہوئی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر کلیات کے نام سے ایک بہت بڑا مندر بھی موجود ہے۔ آٹھویں صدی میں یہاں پر ہندوؤں کا ایک مشہور مفکر کا پیلہ رہ کر گیا تھا اور اس کی یاد میں یہاں پر اسی کے نام پر کلیات مندر بنایا گیا۔

اس شہر کے قریب ہی ایک جگہ ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مہا بھارت کی لڑائی کے دوران یہاں پر موجود ایک گاؤں تھا جسے تباہ کر دیا گیا۔اس کے علاوہ یہاں سے بہت ہی پرانے سکے اور برتن بھی ملے ہیں۔جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ شہر زمانہ قدیم سے آباد ہے۔

اس شہر کی ایک منفرد بات یہ بھی ہے کہ پنجاب (جو ایک ایسا صوبہ ہے جہاں بڑی تعداد میں

سکھ رہتے ہیں) کے پاس ہونے کے باوجود یہاں پر سکھوں کی تعداد آٹھ فیصد بھی نہیں ہے اور مسلمان تو ایک فیصد سے بھی کم ہیں جبکہ اس کے ساتھ پنجاب کے ضلع پٹیالہ میں سکھوں کی تعداد ساٹھ فیصد سے بھی زائد ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ علاقہ سکھ اور ہندو ریاست کے درمیان حدِ فاصل ہے- پنجاب سے ہندو اکثریت کا علاقہ الگ کر کے ہریانہ صوبہ بنانے کی وجہ ہندوؤں اور سکھوں کو علیحدہ علیحدہ علاقے میں بسانے کی ایک زندہ مثال ہے۔

کیا اسے بھی ہندو اور سکھ مذہب کی بنیاد پر دوقومی نظریہ کہا جا سکتا ہے، جس کی آزادیِ ہند کے وقت ہندوؤں اور سکھوں نے سخت مخالفت کی تھی؟

اب شام کے چار بج رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اب ہم کروکیشتر ا کے پاس پیپلی کے مقام پر آرام کے لیے رکیں گے اور اس دوران ہمیں چائے بھی پلائی جائے گی۔ وہ اعلان ہم سب کے لیے انتہائی خوشی کا باعث تھا اور اس کی سب سے زیادہ خوشی مجھے اور عرفان صاحب کو تھی کیونکہ ہم دونوں ہی چائے کے شوقین تھے۔ بچوں کو چائے سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہاں پر ہمارا قیام بیس منٹ کا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ حسب معمول جیسے ہی ہماری بس رکی تو ہم نے دیکھا کہ پولیس کے کئی لوگ بس کے اردگرد آ گئے اور ہمیں ان کے پہرے میں ریستوران جانا پڑا۔ میری زندگی کا غالباً وہ پہلا موقع تھا جب مجھے اس طرح کا سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ ایسی صورت حال میرے لیے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتی۔ بہر حال وہ حفاظتی اقدامات جو پاک بھارت تعلقات میں پائی جانے والی کشیدگی کی وجہ سے تھے، ایسا دونوں طرف ہی کیا جاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

ریاست جنداورسنگرور

میں نے حسب معمول چائے کے دوران ریستوران کے عملے سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے نقشے میں دیکھا تھا کہ وہ علاقہ ہریانہ میں شامل ہے اوراس کے جنوب مغرب میں ریاست جند قائم تھی۔ میں نے ریاست جند کا مطالعہ کر رکھا تھا جس سے مجھے بہت ہی دلچسپ معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ اس ریاست کو ریاست جند اور سنگرور بھی کہا جاتا تھا لیکن اب تک مجھے اس ریاست سے تعلق رکھنے والے کسی صاحب سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سنگرور اپنے منفرد نام کی وجہ سے کافی جانا پہچانا جاتا ہے۔ اتفاق سے ریستوران کے مینجر (جن کا نام تو میں نہ جان سکا) کے بارے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق سنگرور سے ہے۔ میں ان سے اس مختصر وقت میں سنگروراور ریاست جند سے متعلق چند باتیں ہی پوچھ سکا۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ ریاست جند اور سنگرور، دو نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اس ریاست کے راجا، جند میں رہتے تھے جو کروکیشتر اشہر کے جنوب مغرب میں ستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اوراس کا پانی پت سے فاصلہ پچاس کلومیٹر ہے۔ اب یہ علاقہ ہریانہ میں شامل ہے۔ سنگرور پٹیالہ کے مغرب میں تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اب پنجاب کا حصہ ہے۔ اس طرح ریاست تقسیم کر کے دومختلف صوبوں کو دے دی گئی۔ میں نے پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس علاقے میں چودھری پھول سنگھ کی اولاد نے تین مختلف ریاستیں یعنی ریاست پٹیالہ، ریاست جند اور ریاست نابھہ قائم کی تھیں۔ پھول سنگھ کی وجہ سے انھیں پھولکی ریاستیں بھی کہا جاتا ہے۔

انھوں نے مجھے مزید بتایا کہ سنگرور پنجاب کا ایک اہم شہر ہے جس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ

ہے۔ یہاں پر سکھ اکثریت میں ہیں جن کی تعداد پچاس فیصد سے زائد ہے یہاں چالیس فیصد کے قریب ہندو رہتے ہیں اور تقریبا تین فیصد مسلمان آباد ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آزادیِ ہند سے قبل یہاں پر مسلمان کتنی تعداد میں رہتے تھے؟ انھوں نے بتایا کہ اس وقت بیس فیصد سے زائد مسلمان اس شہر میں رہتے تھے۔ پنجاب کے بٹوارے کے وقت ان کے ساتھ بہت ظلم و زیادتی ہوئی۔ اس علاقے میں بے حد قتل و غارت ہوئی اور بیشتر مسلمانوں کو یہاں سے نقل مکانی کرنا پڑی۔ میں نے اٹھنے سے پہلے ان سے سوال پوچھا کہ آپ کی عمر بھی تقریباً پچاس سال کے قریب ہے اور آزادیِ ہند کے واقعے کو گزرے ساٹھ سال ہونے کو ہیں، یقیناً آپ کو بھی اپنے بڑوں سے تقسیم پنجاب کے واقعات سننے کا موقع تو ملا ہوگا۔ انھوں نے کہا: ہاں میں نے اپنے بزرگوں سے بہت ساری باتیں سنی ہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ صدیوں سے ایک علاقے میں رہنے والے لوگ جو ذات برادری میں بھی ایک تھے، ہم دھرم تو بدل سکتے ہیں لیکن ذات تو نہیں بدل سکتے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ لوگوں نے ذات برادری، ایک جیسی زبان، ایک جیسا رہن سہن، صدیوں کے تعلقات، سب بھلا کر صرف مختلف مذہب کی بنیاد پر لوگوں کو اتنی شدت سے قتل کر کے اور انھیں در بدر کیا، اس کی مثال نہیں ملتی، اس کی کیا وجہ تھی؟ مقامی لوگ، ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خلاف کیوں ہوئے؟

انھوں نے بتایا کہ جو میں نے سنا یا سمجھا ہے اس کے مطابق ایک بات واضح ہے کہ اس علاقے کے سکھ حکمران مسلمانوں سے اس علاقے کو خالی کروانا چاہتے تھے تا کہ بعد میں انھیں حکمرانی کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس کے لیے انھوں نے بدمعاش لوگوں کی بھی مدد لی۔ تا کہ یہ الزام ان لوگوں کے سر آئے اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ راجا کی پولیس یا فوج نے یہ کام کیا ہے۔ فساد برپا کرنے والوں کو مکمل طور پر آزادی بھی تھی اور حکمرانوں کی طرف سے آشیرباد بھی حاصل تھی۔ اسی لیے آزادیِ ہند کے بعد جب امن ہوا تو ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی، جنھوں نے وہ سب کچھ کیا تھا۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ جن لوگوں نے قتل و غارت کی اور لوگوں

کا مال لوٹا تھا، انھیں عزت دار بنا دیا گیا۔ میں نے تو یہ بھی دیکھا کہ جنھوں نے قتل و غارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مال و دولت کو لوٹا، عورتوں کی بے حرمتی کی، وہ شہر کے عزت دار اور خوشحال لوگوں میں شامل ہو گئے۔ انھیں سیاسی اور معاشرتی طور پر ایک اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔

ہاں البتہ میں نے یہ بات بھی سنی ہے کہ بے شمار سکھوں اور ہندوؤں نے اس مشکل وقت میں اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کو پناہ بھی دی تھی لیکن ایسا کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایک اور اچھی بات یہ ہوئی کہ پنجاب کے بٹوارے کے بعد کئی سال تک ایک محکمہ موجود رہا جو اغوا شدہ مسلمان عورتوں اور بچوں کو ڈھونڈتا اور انھیں کیمپوں میں پہنچاتا اور پھر پاکستان بھیجنے کا بندوبست کرتا تھا۔

یہ بات کر کے میں نے ان سے اجازت لی اور ہم اپنی بس کی طرف روانہ ہو گئے۔

ریاست جنداور سنگرور، انگریزوں کی ایک وفادار ریاست تھی۔ اس نے یہ وفا کیسے نبھائی، یہ سب تو راجا کے لقب سے ہی ظاہر ہے۔ اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

ریاست جند

انگریزوں کی ایک وفادار ریاست: اس بات کا تذکرہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں کہ پنجاب میں واقع یہ تین ریاستیں، پٹیالہ، نابھہ اور جند، پھلکر یاں ریاستیں کہلاتی تھیں۔ ان ریاستوں کے ایک بڑے صاحب کو، جن کا نام بریام تھا، 1526ء میں بابر نے چودھری کا خطاب دیا تھا۔ یاد رہے یہ وہی سال ہے جب بابر نے لودھی کو شکست دی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بریام صاحب نے بابر کی حمایت کی تھی۔ یہ تمام تر معلومات درج ذیل مشہور اور قابل اعتماد ویب سائٹ سے لی گئی ہیں۔

https://www.royalark.net/India/jind.htm یہ ایک طرح سے بھارت کی سرکاری ویب سائٹ ہے۔

بریام ہی کی نسل سے ایک صاحب کے (جن کا نام چودھری پھول سنگھ تھا) بیٹوں نے یہ تین ریاستیں بنائی تھیں۔ ریاست جند کی بنیاد 1763ء میں گجپت سنگھ نے رکھی۔ وہ دہلی سرکار کا

وفادار تھا۔ جب اس کی ریاست قائم ہوئی، اس وقت دہلی میں شاہ عالم کی حکومت تھی۔ گجپت سنگھ دلی دربار کو مطلوبہ رقم فراہم نہ کرسکا جس کے نتیجے میں انھوں نے اسے قید کرلیا اور رقم ادا کرنے پر گجپت سنگھ کی رہائی ہوئی۔ انگریزوں اور مراٹھوں کے درمیان لڑائی میں اس ریاست نے مراٹھوں کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت کی۔ جس کے بدلے میں انگریزوں نے انھیں ایک بہت بڑے علاقے کی حکمرانی سے بھی نوازا اور کئی القابات بھی دیے۔ اس کے بعد اس خاندان میں گدی کے لیے بے شمار لڑائیاں ہوئیں جو کافی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ ان کی تاریخ میں کئی ایسی خواتین کا ذکر بھی آتا ہے جو اپنے کم سن بچوں کی وجہ سے نگران تھیں۔ وہاں ایک راجا سروپ سنگھ بھی تھے جنھوں نے ہر لحاظ سے انگریزوں کی مدد کی۔ اس راجا کو وائسرائے ہند تک رسائی حاصل تھی۔ اس کے بعد راجا رنبیر سنگھ اس ریاست کا بادشاہ بنا جس نے ساٹھ سال تک اس ریاست پر راج کیا۔ اس نے دونوں عظیم جنگوں میں انگریزوں کی حمایت کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاست کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کی وفات پنجاب کے بٹوارے سے صرف دو ماہ قبل ہوئی۔ اس ریاست کے آخری راجا، راجا رجبیر سنگھ صرف دو ماہ تک اس ریاست کے حاکم رہے۔ بعد ازاں یہ ریاست بھی بھارت میں ضم ہوگئی۔ اس ریاست کے حکمران بھی اپنے شاہی طرزِ زندگی کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔ انھوں نے بھی اپنی ریاست بچانے کے لیے دیگر ریاستوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہر لحاظ سے انگریزوں کی غلامی کی۔ ان کی غلامی ہندوستان کی غلامی ثابت ہوئی۔

کیتھل

جہاں ہندوستان کی پہلی مسلمان حکمران خاتون رضیہ سلطانہ کا مقبرہ بھی ہے: شام ڈھل رہی تھی اور ابھی خاصا سفر باقی تھا۔ گرمی اور حبس کی وجہ سے سفر کی تلخی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ انھی خیالات میں گم سفر جاری تھا۔ کیتھل شہر کے ذکر کے بغیر جہاں تیرھویں صدی میں ہونے والی ہندوستان کی پہلی مسلمان خاتون کا مقبرہ بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کئی تاریخی عمارتیں بھی موجود ہیں، آگے جانا آپ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

کیتھل کا ایک مختصر تعارف حاضرِ خدمت ہے۔

کیتھل شہر کروکیشتر ا کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مہابھارت کی نظم میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ ہندوؤں کے خیال میں یہ شہر بھگوان ہنومان کی جائے پیدائش بھی ہے۔ شہر میں ہنومان کا ایک بہت بڑا مجسمہ بھی لگا ہوا ہے۔ یہاں ان کی والدہ کے نام کا انجانی ٹیلہ بھی موجود ہے، یہ شہر جی ٹی روڈ سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ اس کی مغربی سرحد ضلع پٹیالہ سے ملتی ہے۔ پنجاب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کے راستے میں ہونے کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ ہی نشانے پر رہا ہے۔ ہر حملہ آور نے اس شہر کی بربادی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دہلی کے قریب اور دہلی جانے والے راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے غوری کے دور سے ہی مسلمان اس علاقے پر قابض ہیں۔ بعد ازاں میں مغلوں نے اس علاقے پر قبضہ جمایا۔ مراٹھے بھی یہاں حکمرانی کرتے رہے۔ کئی سکھ حکمران بھی یہاں رہے۔ آخری حاکم انگریز تھا۔ اس شہر کی چند مشہور عمارتوں اور ان سے جڑے واقعات پیش خدمت ہیں۔

میں نے بارہا تاریخ میں رضیہ سلطانہ کا نام پڑھا اور جب مجھے یہ پتہ چلا کہ ہم اس شہر کے قریب سے گزر رہے ہیں جہاں اس کا مقبرہ موجود ہے تو خوشی ہوئی کہ ہم ایک ایسی خاتون کے علاقے میں سفر کر رہے ہیں جو نہایت ہی قابل اور بہادر عورت تھی۔ وہ ہندوستان میں پہلی مسلمان حکمران تھیں۔ رضیہ سلطانہ، دہلی کے سلطان التمش کی بیٹی تھی جو قطب الدین ایبک کے بعد دلی کا حاکم بنا تھا جبکہ اس کی ماں قطب الدین ایبک کی بیٹی تھی۔ رضیہ سلطانہ کا مقبرہ شہر سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ کچھ لوگوں کے بقول یہ عمارت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے (میں نے اب اس کی کچھ تصاویر دیکھی ہیں جن سے یہ لگتا ہے کہ اب اس کی حالت کافی بہتر ہے)۔ رضیہ سلطانہ نے تقریباً چار سال دہلی پر حکمرانی کی۔ کہتے ہیں کہ وہ سلطانہ کہلانا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس لفظ سے یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی سلطان کی بیوی ہے۔ اس لیے اسے سلطان رضیہ کہا جائے لیکن تاریخ میں عام طور سے رضیہ سلطانہ ہی لکھا ہوا ہے۔ دہلی کی اس حکمران کو اس علاقے کے جاٹوں نے اس کے خاوند سمیت قتل کر دیا تھا۔

رضیہ سلطانہ نے 1236ء سے 1240ء تک دہلی پر حکمرانی کی۔ رضیہ کے والد مملوک سلطان شمس الدین التمش نے اپنے بڑے بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اس کی اچانک وفات کے بعد اس نے اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا، لیکن یہ سب کچھ رضیہ کے سوتیلے بھائی، رُکن الدین فیروز کو قبول نہ تھا اور وہ تخت کا وارث بن بیٹھا۔ اس پر ان دونوں کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں رضیہ جیت گئی اور تخت کی وارث بن گئی۔ اس نے چار سال تک حکومت کی لیکن دربار سے وابستہ دیگر افراد کو ان کی حکمرانی زیادہ دیر تک راس نہ آئی اور انھوں نے اس کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی اور اسے تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے اس نے باغیوں کے ایک سردار اختیار الدین التونیا سے شادی بھی کی اور تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ایک جنگ میں شکست کے بعد اسے اور اس کے خاوند کو کیتھل میں قتل کر دیا گیا۔ بعدازاں اسی شہر میں اس کے سوتیلے بھائی بہرام خان نے اس کا مقبرہ بنوایا۔

ابن بطوطہ نے بھی اس مقبرے کا ذکر کیا ہے۔ اب ان کی قبر ایک خانقاہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ان کی قبر پر ایک گنبد بنایا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس جگہ رضیہ کی قبر ہے وہاں ایک صوفی بزرگ شاہ ترکمان بیابانی کی خانقاہ تھی اور رضیہ ان کی مرید بھی تھی۔ رضیہ سلطانہ پر بھارت میں کئی فلمیں اور ٹی وی سیریل بھی بنے ہیں۔ ہندوستان میں خاموش فلموں کے دور میں بھی ان پر ایک فلم بنائی گئی اور یہ سب ان کی بہادری کے واقعات کو زندہ رکھنے کے لیے کیا گیا۔ ہمیں ان کا مزار دیکھنے کی سعادت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن یہ ضرور معلوم ہوا کہ اہل ہند پر اس دور میں باہر سے آ کر ایک خاندان غلاماں کی بہادر بیٹی نے بھی حکومت کی تھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا دور کئی لحاظ سے ایک بہترین دور گنا جاتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی تھیں۔

میں نے رضیہ سلطانہ بارے جاننے کے لیے درج ذیل مآخذ سے مدد لی ہے؛

https://historyofislam.com/razia-sultan/

https://historyunravelled.com/warriors/razia-sultan--the-first-muslim-fer

The Legend Makers: Some Eminent Muslim Women of India by Gouri Srivastava ·

India's Immortal Comic Books: Gods, Kings, and Other Heroes by Karline McLain · 2009

The Unforgettable Queens of Islam: Succession, Authority by Shahla Haeri

کیتھل میں شیخ طیب کا مقبرہ بھی بے حد مشہور ہے۔ شاہ سکندر نے ان کے مقبرے کی تعمیر کروائی تھی۔ شیخ طیب بابا شاہ جمال کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ ان کا اصل نام لالہ میدنی مل تھا۔ وہ اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ اسی دور میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی ہندو بیوی کی اولاد شہر میں واقع قانون گو محلے میں رہتی ہے۔ مدت سے ایک رسم چلی آ رہی ہے کہ جب بھی اس محلے میں کسی کی شادی ہوتی ہے تو شیخ طیب کے مزار پر کھیر تقسیم کی جاتی ہے۔

شاہ کمال قادری اور شاہ سکندر قادری کیتھلی کا مزار

شاہ کمال قادری اور شاہ سکندر قادری کے مزارات، جنھیں عرف عام میں پیر بابا بھی کہا جاتا ہے، کیتھل شہر کے وسط میں موجود ہیں یہ مزارات پچھلے ساڑھے چار سو سالوں سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ شاہ کمال قادری، مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں بغداد سے آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پیر عبدالقادر جیلانی کے حکم پر ہندوستان آئے تھے۔ ان کے بارے میں ایک عجیب وغریب واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ بہت سخت قحط پڑا۔ شاہ کمال قادری صاحب نے دلیے کے دو بڑے برتن تیار کرنے کو کہا۔ ایک کو ایک مسلمان باورچی نے تیار کیا جبکہ دوسرا ایک ہندو برہمن نے تیار کیا۔ اعلان کیا گیا کہ پورے شہر کے لوگ دن رات یہاں آ کر کھانا کھا سکتے ہیں اور اس دلیے کو اپنے گھروں میں بھی لے جا سکتے ہیں۔ اس کھانے کے بارے میں مشہور ہے کہ جب تک قحط کی کیفیت برقرار رہی، دلیا ختم نہ ہوا۔ جب قحط ختم ہوا تو یہ کھانا بھی بند کر دیا گیا۔

ان کے مزار پر مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد آتی ہے۔ان کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ بھی ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور ان سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔اب بھی دلیے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ہر سال ساون (برسات کے مہینے) کی چاروں جمعرات کو، ہر مذہب کے لوگ دلیا تیار کر کے اسے درگاہ بھیجتے ہیں، جو ضرورت مندوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے کنبے سے محبت کی اللہ تعالیٰ نے اس کے نام کو بڑا اور محفوظ بھی کیا۔یہ روایت اس بات کی ایک زندہ مثال ہے!

کیتھل میں بارہ سو سال پرانا مندر اور جاٹ حکمرانوں کا بنایا ہوا قلعہ: اس علاقے میں قائم جاٹوں کی ریاست کا نام بھائی ریاست تھا۔ان کے دور میں یہاں پر کافی عمارتیں بنائی گئی تھیں اور ان میں سے صرف ایک قلعہ ہی کسی حد تک اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔یہ قلعہ کم ایک بہت بڑا باغ ہے جس میں بڑی بڑی عمارتیں موجود ہیں۔

انھی کے دور کی کیتھل میں ایک تین منزلہ باؤلی (ایک گہرا کنواں جس کے چاروں طرف سیڑھیاں ہوتی ہیں) بھی بنائی گئی جسے بھائی کی باؤلی کہتے ہیں۔اس کی تعمیر یہاں کے جاٹ راجہ کے حکم پر اٹھارہویں صدی میں ہوئی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر کلیات کے نام سے ایک بہت بڑا مندر بھی موجود ہے۔آٹھویں صدی میں یہاں پر ہندوؤں کا ایک مشہور مفکر کا پیلہ رہ کر گیا تھا اور اس کی یاد میں یہاں پر اسی کے نام پر کلیات مندر بنایا گیا۔

اس شہر کے قریب ہی ایک جگہ ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مہا بھارت کی لڑائی کے دوران یہاں پر موجود ایک گاؤں تھا جسے تباہ کر دیا گیا۔اس کے علاوہ یہاں سے بہت ہی پرانے سکے اور برتن بھی ملے ہیں۔جن سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ شہر زمانہ قدیم سے آباد ہے۔

کیا اسے بھی ہندو اور سکھ مذہب کی بنیاد پر دو قومی نظریہ کہا جا سکتا ہے، جس کی آزادیِ ہند کے وقت ہندوؤں اور سکھوں نے سخت مخالفت کی تھی؟

کرنال

نادر شاہ اور مغلوں کی ایک اہم جنگ کا مقام: کرنال کس قدر قدیم شہر ہے، اس بات کا

اندازہ اس شہر کے نام سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہا بھارت کے ہیرو کرنا کی وجہ سے اس شہر کا نام کرنال رکھا گیا تھا۔ ابھی حال ہی میں کرنال میں کرنا کا ایک بہت بڑا مجسمہ بھی بنایا گیا ہے۔ اس شہر میں موجود ٹاؤن گیٹ کو بھی کرنا گیٹ ہی کہا جاتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اس علاقے پر تھانیسر کے حکمران وردھانوں کا قبضہ تھا۔ ساتویں صدی تک اس علاقے میں بدھ مذہب کے ماننے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ اس کے بعد ہندومت کا گنگا کے میدانی علاقوں میں اثر و رسوخ بڑھنا شروع ہو گیا اور تیرھویں صدی تک اس علاقے میں ہندوؤں کی بالا دستی رہی۔ انگریزوں کی آمد سے قبل یہ علاقے مسلمان حکمرانوں کے زیر تحت رہے۔ تحریک آزادی ہند کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے اسے بطور پناہ گاہ بھی استعمال کیا۔ 1731ء میں ایران سے تعلق رکھنے والے نادر شاہ اور مغل سلطنت کے مابین ایک اہم جنگ بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔

کرنال کی شہرت کی ایک وجہ یہاں پر اعلیٰ قسم کے باسمتی چاول کی پیداوار بھی ہے۔ اسی وجہ سے اسے رائس باؤل آف انڈیا یعنی ہندوستان کے چاول کا پیالہ بھی کہا جاتا ہے۔ حالیہ سروے کے مطابق کرنال، ہریانہ کا سب سے صاف ستھرا شہر ہے۔ کئی لوگ اسے ہریانہ کا پیرس بھی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بلدیاتی اداروں میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والی ریاستوں میں اسے دوسری پوزیشن بھی حاصل ہے۔ ان سب باتوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کرنال کیسا شہر ہے۔

کرنال بارے جاننے کے لیے درج ذیل کتابیں بے حد مفید ہیں۔ اس کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا پر بھی کافی کچھ لکھا ملتا ہے۔

War, Culture and Society in Early Modern South Asia, by Kaushik Roy

The Oxford Handbook of the Seven Years' War, by Trevor Burnard, Emma Hart, Marie Houllemare.

Haryana, a Historical Perspective by Satish Chandra Mittal

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ نویں صدی کے وسط میں ہریانہ سمیت ایک بڑے علاقے پر توماراخاندان کی حکومت تھی۔اسی خاندان کے ایک راجہ اننگپال تومر نے دلی شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔(یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے قبل یہ شہر ایک چھوٹی سی آبادی ہو اوراننگپال نے اسے ایک شہر کی صورت دی ہو)۔بعدازاں چوہانوں کے ہاتھوں اس ریاست کا خاتمہ ہوا۔توماراکے دور میں ستلج اور جمنا کا درمیانی علاقہ امن وامان اورخوشحالی کی وجہ سے بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ توماراخاندان نے لڑائی پر امن کو ترجیح دی۔محمود غزنوی کے حملوں کے وقت اس علاقے میں ایک اہم جنگ ہوئی۔اننگپال تومر کے دور میں ہی دہلی کے قریب لال کوٹ قلعہ تعمیر کیا گیا۔یہ اس علاقے میں ہندوؤں کی آخر ریاست تھی۔غوری کی آمد کے بعد یہ تمام علاقے صدیوں تک مسلمان حکمرانوں (جن میں سلاطین دلی اور مغل سب شامل ہیں) کے ماتحت رہے۔

ہم اس وقت کرنال سے گزر رہے تھے جہاں نادرشاہ اور مغلوں کے درمیان ایک اہم معرکہ ہوااورجس کے نتیجے میں دلی پر وہ ظلم برپا ہواجس کی مثال بھی ملنا مشکل ہے۔میں آپ کے سامنے اس جنگ کی ایک مختصر روداد رکھنا چاہتا ہوں۔

شہر تو سبھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں ہونے والے واقعات انھیں اہم بنا دیتے ہیں۔

نادرشاہ افشار، جسے نادرقلی بیگ بھی کہا جاتا ہے، 1736ء سے 1747ء تک ایران کا بادشاہ رہا وہ خاندان افشار کی حکومت کا بانی بھی تھا۔اپنی عسکری صلاحیتوں کے باعث مؤرخین اسے ایشیا کا نپولین اورسکندر ثانی بھی کہتے ہیں۔اس کی فتوحات کا دائرہ بھی بے حد وسیع ہے۔1738ء میں نادرشاہ نے قندھار پر فتح حاصل کی۔اس کے بعد اس نے شمالی ہندوستان کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا اور ابتداء میں کوہ ہندوکش (جو مغلیہ سلطنت کا حصہ تھا) کے پار چھاپے مارنا شروع کر دیے۔یاد رہے کہ اورنگزیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور تو ضرور ہوگئی تھی مگر ابھی بھی

ہندوستان کا ایک بڑا علاقہ اس کے ماتحت تھا۔ اس وقت صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مراٹھوں نے وسطی اور شمالی ہندوستان کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کئی مقامی گورنروں نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت کے مغل بادشاہ محمد شاہ اپنی سلطنت بچانے میں ناکام نظر آ رہے تھے۔ شمال مغربی سرحد پر پشتونوں نے بغاوت کر دی تھی، اس سب کے باوجود ہندوستان ایک انتہائی متمول ملک تھا۔ اسی خوشحالی کی وجہ سے نادر شاہ سمیت بہت سے لوگ ہندوستان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ جن میں ایرانیوں، افغانیوں کے ساتھ ساتھ یورپین بھی پیش پیش تھے۔ سب کو کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ کسی کو تجارت کا تو کسی کو اپنے باغیوں کی واپسی کا۔ نادر نے بھی ایسا ہی ایک بہانہ ڈھونڈا اور ہندوستان پر حملہ آور ہو گیا۔

واقعہ کچھ یوں ہوا کہ نادر نے جب قندھار پر قبضہ کیا تو کچھ لوگوں نے ڈر کے مارے بھاگ کر کابل میں پناہ لے لی۔ کابل اس وقت مغلیہ سلطنت کا حصہ تھا۔ نادر نے ان باغیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جو مغل حکمرانوں نے پورا نہ کیا۔ نادر نے اسے جنگ کا بہانہ بنا کر کابل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے جلال آباد کو فتح کیا اور لوٹ مار کے بعد ایک ہنستے بستے شہر کو تباہ کر ڈالا۔ اس کا اگلا ہدف پشاور تھا۔ مقامی قبائل نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے۔ پھر ایک دن وہ پشاور میں بطور فاتح داخل ہوا اور جو تباہی کر سکتا تھا وہ اس نے کی۔ اب اس کی نظریں لاہور پر تھیں۔ پھر ایک دن اس نے لاہور کو بھی فتح کر لیا۔ اس کی اگلی منزل دلی شہر تھا جہاں سے وہ ایک بڑا خزانہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مغل بادشاہ اس کے باغی واپس نہیں کر رہا اس لیے وہ ہندوستان پر حملہ کر رہا ہے، لیکن اصل مقصد لوٹ مار اور مغلوں کو سزا دینا تھا۔ (میرا خیال ہے کہ وہ مغلوں اور عثمانیوں کو ایک ہی سمجھتا تھا۔ اس لیے وہ مغلوں کو بھی سزا دینا چاہتا تھا۔)

24 فروری 1739ء کو کرنال کی لڑائی ہونا تھی کہ اس سے قبل ہی محمد شاہ نے ہتھیار ڈال دیے اور پھر فاتح اور مفتوح دونوں ہی ایک ساتھ دہلی میں داخل ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صرف تین گھنٹے ہی لڑائی ہوئی اور اتنے مختصر وقت میں جنگ کا فیصلہ ہونا جنگ نہ ہونے کے برابر ہی سمجھا

جاتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نادر کرنال سے ہی واپس چلا جاتا لیکن محمد شاہ کے ایک جرنیل نے اسے دلی پر حملے کے لیے آمادہ کیا اور اسے بتایا کہ دلی میں اسے بے شمار مال ومتاع مل سکتا ہے۔ اور پھر اس بنیاد پر اس نے دلی کا رخ کر لیا۔

ایسے لوگ ہی مغلیہ سلطنت کی تباہی کا سبب بنے۔

پھر ایک دن آیا کہ نادر ایک فاتح کی حیثیت سے دلی میں داخل ہوا۔ شہر کی چابیاں اس کے حوالے کر دی گئیں۔ اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ پھر اس نے مغل بادشاہوں کی طرح دلی میں ایک عظیم دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں مغلیہ سلطنت کا وارث محمد شاہ بھی موجود تھا۔ (یہ وہی محمد شاہ ہے جسے رنگیلا بادشاہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔)۔ نادر نے کرنال تک پہنچنے کے لیے اڑھائی ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور وقت سے پہلے پہنچ گیا جبکہ محمد شاہ نے صرف دلی سے کرنال تک 110 کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اسے تمام تر مقامی لوگوں کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن اس کے باوجود فتح نادر کی ہوئی۔

رنگیلے رنگ رلیاں تو منا سکتے ہیں جنگ ان کے بس کی بات نہیں ہوتی!

اس دوران دلی کے کچھ لوگوں نے نادر کے فوجیوں سے تنگ آ کر، انھیں قتل کر دیا۔ جس پر نادر نے طیش میں آ کر اپنی فوجوں کو قتل عام اور لوٹ مار کا حکم دے دیا (اجازت نہیں حکم)۔ پھر آسمان نے دیکھا کہ دلی میں بسنے والا مسلمان اور ہندو، کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔ لوگوں نے اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تاکہ وہ غلام نہ بنائی جا سکیں۔ حملہ آور بھی مسلمان تھا شکست خوردہ بادشاہ بھی مسلمان تھا اور عوام میں مسلمان اور ہندو سبھی شامل تھے۔

نادر نے تلوار لہرا کر حملے کا حکم دیا۔۔۔۔ وہ قتل وغارت دیکھتا رہا اور جب اس کا دل بھر گیا تو پھر اس نے تلوار لہرائی اور قتل عام رک گیا۔

صرف ایک دن میں ایرانی فوجیوں نے بیس ہزار سے زائد بے گناہ عام شہری قتل کر دیے اور دس ہزار کے قریب خواتین اور بچوں کو غلام بنا کر ساتھ لے گئے۔

محمد شاہ مسلسل رحم کی بھیک مانگتا رہا جو بالآخر اسے دے دی گئی۔

اس کے بدلے میں نادر شاہ نے خزانے کی چابیاں حاصل کیں اور جو کچھ موجود تھا (جس میں تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا) اسے لوٹ لیا۔ اس لوٹ مار کی کتنی مالیت تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس مال و دولت کو 700 ہاتھیوں، 4000 اونٹوں اور 12000 گھوڑوں پر لادا گیا تھا۔ جہاں عام ایرانی سپاہیوں نے بے شمار عورتوں کو اغوا کیا وہیں نادر شاہ مغل بادشاہ کی ایک بیٹی جہاں افروز بانو بیگم کو اپنے چھوٹے بیٹے کی دلہن بنا کر ہندوستان سے روانہ ہوا۔

میں اسے بھی خراج کی ایک قسم ہی سمجھتا ہوں۔ ایسا کرنے سے دلی پر برپا کی گئی قیامت کا خاتمہ ہوا!

میں سمجھتا ہوں کہ اس جنگ میں مغلوں کی شکست نے مغلیہ سلطنت کے مستقبل اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مستقبل کا بھی فیصلہ کر دیا۔ اس جنگ کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔ مقامی حکمران آزادی کا اعلان کرتے گئے۔ اس جنگ کے بعد بھی مغلیہ سلطنت تقریباً 120 سال تک کسی نہ کسی حالت میں قائم رہی۔ حتیٰ کہ 1857ء کو اس کے آخری حکمران کو ہندوستان سے باہر بھیج دیا گیا۔

یاد رہے کہ احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ کی فوج میں ایک جرنیل تھا۔ ابدالی نے 1747ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانوں کو متحد کیا اور افغانستان کی بنیاد رکھ کر اس کا بادشاہ بن گیا۔ اسی لیے اسے جدید افغانستان کا بانی بھی مانا جاتا ہے- نادر شاہ کو ہندوستان سے مال و دولت لوٹ کر لے جاتے دیکھ کر ابدالی نے بھی ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ ان حملوں کے نتیجے میں وہ بھی ہندوستان سے ایک کثیر مقدار میں مال و دولت لے جانے میں کامیاب ہوا۔

مغلیہ سلطنت کی کمزوری کے بعد ہندوستان بھر میں کوئی بھی مرکزی حکومت نہیں تھی جو ہندوستان پر غیر ملکی تسلط کی ایک اہم وجہ ہے۔

کرنال کو زراعت کا ایک اہم مرکز بھی مانا جاتا ہے جس کی وجہ یہاں پر زراعت کے دفاتر اور اداروں کی موجودگی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے دوائیوں کا شہر بھی کہتے ہیں کیونکہ یہاں پر

فارما سیوٹیکل انڈسٹریز کی بڑی تعداد میں موجود ہے۔

عام طور پر کرنال میں ہونے والی ایک مشہور جنگ (جو نادر شاہ اور مغلوں کے درمیان ہوئی) کا ہی ذکر کیا جاتا ہے لیکن اس علاقے میں اس کے علاوہ بھی تین بڑی جنگیں ہوئی ہیں۔ پہلی جنگ 1191ء میں غوری اور پرتھوی راج چوہان کے درمیان ہوئی اور اس جنگ میں غوری کو شکست ہوئی تھی۔ ایک سال بعد اسی میدان میں غوری اور چوہان کے درمیان 1192ء میں دوبارہ جنگ ہوئی جس میں غوری کی جیت ہوئی تھی۔ اس جنگ میں فتح کے بعد غوری نے ہندوستان میں اپنی ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ دونوں جنگیں کرنال سے شمال مغرب کی جانب پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر ترائین کے مقام پر ہوئیں۔ ترائین کو اب تراوڑی کہا جاتا ہے۔ چوتھی جنگ بھی اسی علاقے میں اس وقت لڑی گئی تھی جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس وقت دہلی کے حاکم ناصرالدین محمود نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ ناکام رہا۔ اس کے نتیجے میں تیمور نے دلی کو لوٹا اور مال و دولت کے ساتھ ساتھ بے شمار عورتوں کو بھی غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان بھر میں اس جنگ میں سب سے زیادہ قتل و غارت ہوئی تھی۔ کرنال کے قریب ایک قصبے میں ماما بھانجا سرائے بھی ہے جسے شاہجہاں کے جرنیل خان فیروز نے بنوایا تھا وہ اب تک قائم ہے اور کافی مشہور ہے۔

انگریز جند کور مہارانی اور مہاراجہ رنبیر سنگھ

کورلی ینگر آسٹریلیا کی رہنے والی ایک خاتون نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام

Wicked Women of The Taj

اس کتاب میں انھوں نے ایسی بیس خواتین کی کہانیاں لکھی ہیں جنھوں نے ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ تعلقات قائم کیے۔ ان میں سے ایک خاتون Olive Monolescue ہے جس نے جند کے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ساتھ شادی کی۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا گیا ہے جس کا مجھے اس سے پہلے کچھ علم نہیں تھا۔ اس کہانی کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

جند کا مہاراجہ رنبیر سنگھ ایک عیاش شخص تھا۔ اس نے کئی قسم کے شوق پال رکھے تھے۔ وہ کتوں سے دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے ہندوستان میں بہترین کتے پال رکھے تھے۔ Olive Monolescue کی شادی رومانیہ کے ایک باربر سے ہوئی تھی جس کی دکان ممبئی میں تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اولیو پسند آ گئی اور اس نے اسے حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ رنبیر سنگھ کی پہلے ہی دو سکھ بیویاں (دھیلما اور گور چرن کور تھیں)۔ مہاراجہ نے اولیو کی ماں کو پچاس ہزار روپے دیے اور اولیو سے سنگرور کے شاہی محل میں شادی کر لی۔ اولیو نے سکھ مذہب اختیار کر لیا اور اسے جسونت کور کا نام دیا گیا۔

اس وقت لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے تھا، اسے یہ شادی پسند نہیں تھی۔ اس نے حکم دیا کہ اولیو کو کبھی بھی جند کی مہارانی کا خطاب نہیں ملے گا، اور ایسا ہی ہوا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ انگریز اس شادی کو (جو پچاس ہزار روپے کے بدلے ہوئی تھی) اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ 1901ء میں راجا اور اولیو شملہ میں ایک پولو ٹورنامنٹ اور دیگر کھیلوں میں شرکت کے لیے جانا چاہتے تھے لیکن انھیں شملہ جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ رنبیر سنگھ کے لیے سخت پیغام تھا کہ انگریزوں کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد اولیو کو کبھی بھی کسی سرکاری تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ شملہ میں مقیم برطانوی خواتین بھی اس کے ساتھ ملنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

اولیو نے کچھ عرصے تک تو یہ سلوک برداشت کیا لیکن ایک وقت آیا جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے 1928ء میں رنبیر سنگھ سے طلاق لے لی اور لندن واپس چلی گئی۔ اس کتاب میں اور بھی کئی خواتین کی کہانیاں لکھی ہوئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی راج کے دوران ایسی خواتین کو ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جب یہ عورتیں واپس انگلینڈ جاتیں تو انھیں Returned Empty کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ تھی ایک سکھ مہاراجہ کی کہانی۔۔۔ جو ناکامی کی شکل میں آج بھی تاریخی اوراق میں محفوظ ہے۔

بابر کی 1528ء میں تعمیر کردہ بابری مسجد کرنال

کرنال اس علاقے میں واقع ہے جو مغرب سے ہندوستان آنے والے لوگوں کی گزرگاہ

تھا۔ بابر بھی اسی راستے سے آیا تھا۔ 1526ء میں اس نے کرنال میں لودھی کوشکست دینے کے بعد فتح کی خوشی میں ایک بڑی اور انتہائی خوب صورت مسجد تعمیر کروائی جس کا نام بابری مسجد ہے۔اس مسجد کی تعمیر 1527ء میں شروع ہوئی اور 1528ء میں یہ مکمل ہوئی۔ ہندوستان میں یہ مغلوں کی پہلی بڑی عمارت ہے۔ یہ مسجد ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا جو اب نظر نہیں آتا۔ مسجد کا ہال کافی کھلا ہے۔ میں نے اس کی کئی تصاویر دیکھیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک شاندار عمارت ہوگی۔اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد کا کم ہونا اس کی خستہ حالی کا سبب ہوسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ شروع میں یہاں ایک گہرا کنواں بھی تھا، جواب نہیں ہے۔ یہ مسجد کرنال شہر کے وسط میں واقع ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسجد بنی اور پھر بعد میں اس کے ارد گرد شہر بستا چلا گیا۔

اللہ کا گھر ہے اسے تو قائم ہی رہنا ہے۔ان شاء اللہ

❀ ❀ ❀

گوردوارہ منجی صاحب

جہاں گورونانک جی نے ایک رات گزاری

کرنال میں ایک تاریخی گوردوارہ بھی موجود ہے جس کا نام گوردوارہ منجی صاحب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرونانک دیو جی نے ایک سفر کے دوران کرنال میں کچھ دنوں کے لیے قیام بھی کیا تھا۔ یہ 1515ء کی بات ہے، اس وقت کرنال میں کئی مسلمان پیر پہلے سے ہی موجود تھے۔ لوگوں میں ایک کہانی مشہور ہے کہ پہلے سے موجود پیروں کو ان کا آنا اچھا نہ لگا اور ابوعلی شاہ قلندر ایک دیوار پر سوار ہو کر ان کے پاس آئے لیکن جیسے ہی دیوار ان کے قریب آئی تو وہ رک گئی۔ جس پر مسلمان پیر نے معافی مانگی۔ یہ واقعہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ان دونوں لوگوں کے درمیان تین سو سال کا فرق ہے۔ گورونانک جی نے ایک چارپائی پر آرام کیا تھا، جسے پنجابی میں ''منجی'' کہتے ہیں۔ جہاں انھوں نے قیام کیا وہیں پر ایک گوردوارہ بنایا گیا۔ اس لیے اس گوردوارے کا نام گوردوارہ منجی صاحب پڑ گیا۔ سکھوں کے چھٹے گرو، گرو رکشن جی نے بھی دہلی جاتے ہوئے اس جگہ کا دورہ کیا۔ 1709ء میں بابا بندہ سنگھ بہادر نے کرنال پر قبضہ کیا اور یہاں سکھ راج قائم کر کے گوردوارے کو توسیع دی۔ یہ گوردوارہ سکھوں کے نزدیک نہایت ہی مقدس سمجھا جاتا ہے۔

سید محمد الیاس میراں: ایک عظیم صوفی بزرگ

کرنال میں میراں صاحب کا مقبرہ بھی بہت مشہور ہے۔ مجھے ان کے بارے میں جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ ان کے کارنامے اور انسانیت کی خدمت کا پڑھ کر محسوس ہوا کہ ایسے ہی

لوگوں کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام عام ہوا۔انھوں نے ذات پات اور مذہبی بنیاد پر کیے جانے والے سلوک کی شدید مخالفت کی۔وہ غریب اور پسماندہ افراد کو اپنے قریب رکھتے اور ان کی بے حد خدمت کرتے تھے۔تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی ایک بادشاہ نے ایک مقامی برہمن لڑکی کو یرغمال بنالیا۔میراں صاحب نے اسے بازیاب کروانے کا فیصلہ کیا اور ایک بڑی رقم ادا کر کے لڑکی کو بازیاب کروایا۔جس کا چرچا آج تک کیا جاتا ہے۔وہ ایک جنگ میں مارے گئے۔ان کی لاش مظفر نگر میں سپرد خاک کی گئی، جبکہ ان کا سر کرنال لایا گیا۔ان کا سر اس مقبرے میں دفن ہے۔مقبرے کے پاس ایک شاندار مسجد بھی ہے۔ان کے مزار پر ہر مذہب کے لوگ آتے ہیں۔کرنال میں کئی تاریخی مندر اور انگریزوں کے دور کا چرچ بھی موجود ہے۔ہم کرنال سے گزر کے آگے جا رہے تھے۔کرنال کا ذکر لیاقت علی خان کے تذکرے کے بغیر ادھورا ہے۔

لیاقت علی خان: پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم اور کلپنا چاولہ: بھارت کی پہلی خلاباز خاتون

لیاقت علی خان 1895ء میں اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق ایک نہایت ہی معزز اور خدا ترس خاندان سے تھا۔ان کے خاندان کا نسب نوشیرواں عادل سے ملتا ہے۔ان کے دادا نواب احمد علی خان کرنال میں آباد ہو گئے اور انھوں نے فارسی کو چھوڑ کر اردو زبان کو اپنا لیا (میرے خیال میں ایسا عام تھا۔مغلوں کے گھروں میں بھی پہلے فارسی یا ترکی ہی بھولی جاتی اور بعد میں وہاں بھی اردو کا رواج ہو گیا) اس طرح لیاقت علی خان کے خاندان کی مادری زبان اردو ہو گئی۔

نواب احمد علی خان کے انگریزوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔انگریزوں نے انھیں رکن الدولہ، شمشیر جنگ اور نواب بہادر جیسے القابات دے رکھے تھے۔ان کے پاس ایک بڑی جاگیر بھی تھی۔لیاقت علی خان کا خاندان سر سید احمد خان سے بہت متاثر تھا۔اس وجہ سے ان کے والد کی خواہش تھی کہ لیاقت علی خان بھی انگریزی تعلیم حاصل کریں۔اس بنا پر لیاقت علی خان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھیج دیا گیا، جہاں انھوں نے قانون اور سیاسیات کی ڈگری حاصل کی۔

وہ اپنے والد کی وفات کے بعد، اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آکسفورڈ یونی ورسٹی چلے گئے اور وہاں سے لاء اینڈ جسٹس کی ڈگری لی۔ آکسفورڈ میں انھوں نے نہ صرف ہندوستانی مسلم طلبہ کی قیادت کی بلکہ ان کے حقوق کے لیے جدوجہد بھی کی۔ ہندوستان واپس آکر انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ آغاز میں وہ کانگرس کے حامی تھے لیکن بعد میں انھوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور پھر مرتے دم تک مسلم لیگ میں ہی رہے۔ تحریک پاکستان سے قیام پاکستان اور پھر استحکام پاکستان تک اان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ آج ہم اس شہر سے گزر رہے تھے جہاں لیاقت علی خان کی زندگی کا ایک اہم حصہ گزرا اور جہاں وہ ایک وسیع جائیداد چھوڑ کر پاکستان گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کا انھیں بہترین صلہ عطا فرمائے۔ امین۔

کلپنا چاولہ کا تعلق بھی کرنال سے ہے۔ کلپنا کی پیدائش 1962ء میں کرنال کے ارورخاندان سے تعلق رکھنے والے ایک جاٹ قبیلے (چاولہ) میں ہوئی۔ آپ نے خلابازی کی تربیت حاصل کی اور ناسا کے تحت ایک خلائی مشن پر روانہ ہوئیں۔ چاولہ ان سات لوگوں میں شامل تھیں جو 2003ء میں شٹل کی واپسی کے موقع پر ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت کے بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے خلا میں کلپنا سے پنجابی زبان میں بات کی تھی۔ پنجابی بولنے والے لوگوں نے اس بات کی بے حد تشہیر کی۔ اسے بھارت میں ایک ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔ جس وقت ہم اس علاقے میں سفر کر رہے تھے اس وقت تک یہ واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اب جب میں 2021ء میں یہ سفر نامہ لکھ رہا ہوں تو مجھے یاد آیا کہ میں بھی کبھی کلپنا کی جنم بھومی سے گزرا تھا۔

❀❀❀

پانی پت

جہاں ہندوستان کے تاج و تخت کے وارثان کا فیصلہ ہوتا تھا

کرنال کے بعد اب ہم پانی پت پہنچ چکے تھے۔ اس سفر میں یہ سب سے اہم جگہ تھی۔ پانی پت موجودہ دور میں بھی کئی دیگر وجوہات سے بہت مشہور ہے، لیکن میرا مقصد اس شہر اور ان میدانوں کو دیکھنا تھا جہاں ہندوستان کی تقدیر کے فیصلے ہوتے رہے ہیں۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ پانی پت کے میدانوں کو ہی تین بڑی لڑائیوں کے لیے کیوں چنا گیا؟

مختلف لوگوں کے جوابات سے یہ معلوم ہوا کہ پانی پت ایسا مقام تھا جو دہلی سے تقریباً سو کلومیٹر پہلے آتا تھا۔ جو لوگ دہلی کی حفاظت کرنا چاہتے تھے ان کے نزدیک بہتر یہی تھا کہ وہ مغرب سے آنے والے حملہ آور کو دہلی سے دور ہی روکیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ لودھی دہلی پر قابض تھے اور بابر ان پر حملہ آور ہوا تھا تو انھوں نے دہلی کو بچانے کے لیے دہلی سے ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسری جنگ میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور تیسری جنگ میں بھی صورت حال ایسی ہی تھی۔ دہلی پر مراٹھوں کا قبضہ تھا اور ابدالی ان پر حملہ آور تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ایک میدانی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہ بڑی جنگ کے لیے مناسب سمجھا جاتا تھا۔ میرے خیال میں یہی دو اہم وجوہات تھیں۔

پانی پت کی اس دھرتی پر کتنے لوگوں کا خون گرا۔۔۔ کسی کو کچھ علم نہیں۔۔۔ لیکن میں اپنی معلومات کی بنیاد پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان بھر میں کوئی ایک بھی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں اس قدر انسانوں کا خون بہایا گیا ہو۔

یہ مٹی خون کی کتنی پیاسی ہے، ابھی تک کوئی نہیں جانتا!

تاریخ سے یہ جاننے کو ملتا ہے کہ جنگیں اس علاقے کے مختلف مقامات پر ہوئی تھیں۔ کئی مقامات پر اب بھی ان جنگوں کی نشانیاں موجود ہیں۔ ہم نے ایک سفید رنگ کا چبوترہ (جو سڑک سے چند سوفٹ کے فاصلے پر تھا) بھی دیکھا، جس کے متعلق بتایا گیا کہ ایک جنگ اس جگہ پر بھی ہوئی تھی جس کی نشانی کے طور پر یہ چبوترہ بنایا گیا ہے۔ ہم اسے زیادہ قریب سے نہ دیکھ سکے۔

قتل گاہ کو دور سے ہی دیکھا۔۔۔

قریب سے میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا!

میں یہاں پر لڑی جانے والی تین بڑی لڑائیوں کا ذکر پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں لہذا وہ میدان ضرور دیکھنا چاہتا تھا جہاں یہ سب کچھ ہوا اور جہاں ہندوستان کے لوگوں کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا رہا ہے۔ آج میری یہ خواہش بھی پوری ہوگئی جو میرے لیے انتہائی خوشی کی بات تھی۔ پانی پت میں دس سے زائد مقامات ایسے ہیں جہاں پر بہت سی تاریخی عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ ایک مشہور صوفی بزرگ بوعلی قلندر کی درگاہ آج بھی موجود ہے۔ ان اہم مقامات میں سے چند ایک کا مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش ہے جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پانی پت کس قدر اہم شہر تھا اور اب بھی ہے۔

پانی پت بارے کئی مضمون پڑھنے کے ملے۔ ان میں سے کچھ کے نام درج ذیل ہیں۔

پانی پت اپنی ۳ جنگوں اور تاریخی عمارتوں کے لیے مشہور ہے جسے محمد حبیب نے لکھا، پانی پت کی تیسری لڑائی (https://www.inquilab.com)۔ 14 جنوری 1761ء جسے حمید انصاری، تیمر گرہ (https://www.humsub.com.pk) اور پانی پت کی جنگ جو ظہیر الدین بابر نے 'جدید ٹیکنالوجی' سے جیتی جسے راحل مرزا – نئی دہلی لکھا (https://www.urdunews.com/)۔ اس کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا سے بھی استفادہ کیا۔

پانی پت، ہریانہ میں واقع ہے یہ دہلی سے 95 کلومیٹر شمال جبکہ چندی گڑھ سے 169 کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ یہ شہر 1526ء، 1556ء اور 1761ء میں لڑی جانے والی تین بڑی

لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ شہر ''ویورز کا شہر'' اور ''ٹیکسٹائل سٹی'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہاں پر ''ٹیکسٹائل کی ری سائیکلنگ کا کام بھی بڑے پیمانے پہ ہوتا ہے۔اس شہر میں دوسو کے قریب ایسی ملیں بھی موجود ہیں جو دنیا بھر کے استعمال شدہ کپڑوں سے دوبارہ ریشہ اور دیگر اشیا حاصل کر کے انھیں دوبارہ استعمال کے قابل بناتی ہیں۔ (اس طرح کی صنعت مستقبل میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوگی)۔ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت کئی ہزار لوگ اس صنعت سے وابستہ ہیں۔

مزار شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی

شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی (جو بوعلی قلندر کے نام سے مشہور ہیں) کا مزار پانی پت کا ایک اہم مقام ہے۔آپ تیرھویں صدی کے آغاز میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔(کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ لاہور کے قریب کسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے)۔آپ کا تعلق سلسلہ چشتیہ سے تھا۔ آپ کے والد سید محمد ابوالحسن فخر الدین (جو فخر عالم کے نام سے بھی جانے جاتے تھے) اپنے دور کے ایک بہت بڑے عالم اور ولی تھے۔ ان کا مزار پاراچنار، پاکستان میں ہے۔ وہ شیعہ امام زین العابدین کے نسب سے ہیں۔ان کی اولاد پاکستان میں رہتی ہے اور حسینی کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے دیوان حضرت شرف الدین بو علی قلندر کے نام سے فارسی زبان میں شاعری کا ایک مجموعہ بھی لکھا ہے۔ان کا تعلق کئی مشہور قلندروں (جیسے لال شہباز قلندر اور شمس علی قلندر ہیں) کے ساتھ بھی جوڑا جاتا ہے۔ان سے بے شمار کرامات بھی منسوب ہیں۔

ان کا مزار پانی پت میں قلندر چوک کے مقام پر واقع ہے جسے لوگ درگاہ کے نام سے جانتے ہیں، یہاں پر ایک مسجد بھی ہے۔مسجد اور مزار پر مشتمل یہ کمپلیکس، جہانگیر کے ایک جرنیل، مہابت خان نے تعمیر کروایا تھا۔اس کمپلکس میں مہابت خان، حکیم مکرم خان اور اردو کے شاعر مولانا الطاف حسین حالی کے مقبرے بھی موجود ہیں۔ مولانا حالی کی پیدائش بھی پانی پت میں ہوئی۔مقبرے کی بائیں دیوار پر سنہری حروف میں ایک قصیدہ لکھا ہوا ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اسے زہری نیشاپوری نے لکھا تھا جو اکبر کے دور میں ہندوستان آیا تھا۔مزار شرف الدین بو

علی شاہ قلندر پانی پتی کی درگاہ پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، غرض ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد بڑی تعداد میں آتے ہیں۔

آزادیِ ہند سے قبل پانی پت کس قدر مردم خیز علاقہ تھا، اس کا ذکر پانی پت سے تعلق رکھنے والے اظہر حسن نے اپنی ایک کتاب تذکرہ شہرِ مرحوم میں کافی تفصیل سے کیا ہے جو انتہائی دلچسپ ہے۔ اظہر صاحب کے مطابق ان کے آباؤ اجداد تیرھویں صدی میں افغانستان سے ہندوستان ہجرت کر کے پانی پت میں آباد ہوئے تھے۔ اظہر حسن کے والد دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ ان کے مطابق پانی پت کی بنیاد مہابھارت کی جنگوں کے وقت ارجن نے رکھی تھی (کسی اور نے ایسا نہیں لکھا)۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ پانی پت میں مسلمان ایک کثیر تعداد میں آباد تھے۔ اس علاقے سے کئی اہم شخصیات کا تعلق بھی تھا، جن میں خواجہ شمس الدین ترک اور شیخ جلال الدین شامل ہیں (انھوں نے کبھی بھی دلی کے حکمرانوں کے سامنے سر نہیں جھکایا اور اپنے امن، اتحاد اور خیر سگالی کے پیغام کی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں میں بڑے مقبول رہے)۔ ان کے ساتھ ساتھ الطاف حسین حالی کی وجہ سے بھی پانی پت دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ فیصد کے قریب ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آزادیِ ہند کے وقت یا تو شہید کر دی گئی یا پھر ہجرت پر مجبور ہوگئی اور وہ لوگ اب پاکستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔

میں نے ایک مختلف بات کا مشاہدہ کیا کہ ہریانہ اور پنجاب کے دیہات اور قصبوں میں آپ کو کئی مساجد ویران نظر آئیں گی لیکن کسی مسلمان صوفی کی درگاہ یا مزار اجڑا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ان مسلمان صوفیوں کے مزارات پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد بھی حاضری دیتی تھی اور دیتی ہے، اسی لیے ایسے مقامات اجڑنے سے بچ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شاید ہی کسی مسلمان بادشاہ کی قبر کے ساتھ کوئی ہندو ایسی عقیدت رکھتا ہو!

کابلی باغ مسجد

جسے بابر نے اپنی فتح کی یاد میں بنوایا اور ابراہیم لودھی کا مقبرہ: کابلی مسجد پانی پت ایک لحاظ سے مغلوں کی ہندوستان میں پہلی بڑی عمارت ہوسکتی ہے۔شہنشاہ بابر نے اسے 1526ء میں سلطان ابراہیم لودھی کو پانی پت میں شکست دینے کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔ بعدازاں جب بابر کے بیٹے ہمایوں نے پانی پت کے قریب شیر شاہ سوری کی اولاد کو شکست دی۔ اپنے والد کی پیروی کرتے ہوئے فتح کی خوشی میں اس عمارت میں ایک پلیٹ فارم بنوایا۔اس کے علاوہ بھی یہاں کئی عمارتیں موجود ہیں۔اس جگہ کو بابر کی اہلیہ کابلی بیگم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔(اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہیں کہ بابر کی شادی کابل میں رہنے والے کسی خاندان میں ہوئی تھی۔)اس مسجد کا فن تعمیر کسی حد تک سمرقند کی شاہی مساجد سے ملتا جلتا ہے۔ میں نے اس کی کئی وڈیوز دیکھیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دیکھ بھال کے لیے مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

پانی پت میں ایک اوراہم تاریخی جگہ ابراہیم لودھی کا مقبرہ بھی ہے۔ابراہیم ایک پشتون تھا، اس نے اپنے والد سکندر کی وفات پر تخت سنبھالا تھا۔ایک اہم سوال ہمیشہ سے میرے ذہن میں رہا ہے کہ بابر ہندوستان کیوں آیا تھا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ ابراہیم لودھی کی وفات کے بعد اس کا بھائی تخت کا دعویدار تھا،لیکن وہ اس کے حصول میں ناکام رہا۔اس کے علاوہ جب ابراہیم نے پرانے اور سینئر کمانڈروں کی جگہ کم عمر افراد کو اہمیت دینا شروع کی تو ابراہیم کے چچا نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ پانی پت کی جنگ میں بابر نے ابراہیم کی بہت بڑی فوج کو شکست دی۔ ابراہیم جنگ میں مارا گیا۔اس کا مقبرہ پانی پت میں تحصیل آفس اور صوفی بزرگ بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ کے قریب واقع ہے۔ یہ اونچے پلیٹ فارم پر بنائی گئی ایک خوب صورت عمارت ہے جسے ایک چبوترہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ انگریزوں کے دور میں جی ٹی روڈ کی تعمیر کی وجہ سے مقبرے کی جگہ کو تبدیل کرنا پڑا۔

❁❁❁

سفیدون

جہاں پانچ صدیاں قبل سلاطین دلی نے نہر بنائی تھی

جب ہم پانی پت سے نکلے تو میں نے اردگرد دیکھا کہ دور دور تک میدانی علاقے ہیں۔ ان ہی خیالات میں گم ہم اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے کہ مجھے نقشے سے معلوم ہوا کہ ہمارے بائیں طرف پانی پت سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا قصبہ موجود ہے جس کا نام سفیدون ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یہاں پر ایک قلعہ بھی واقع ہے۔ اس علاقے کی تاریخ سے اندازہ ہوا کہ یہ سلاطین دہلی کے دور سے ہی مسلمانوں کے قبضے میں تھے یہ ایسی بات تھی جو میرے لیے نہایت ہی اہم تھی۔

اس سے پہلے کہ میں آگے آنے والے شہروں سے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ ہمارے بائیں طرف دس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود سفیدون قصبہ ہے، اس کے بارے میں چند معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔ یقیناً یہ سب آپ کے لیے انتہائی دلچسپ ہوں گی۔ میں ایک ایسی بات کی تفصیل بھی بتاؤں گا جس کا ذکر تاریخ میں کم ملتا ہے بلکہ بالکل نہیں ملتا۔

سفیدون کے قریب کئی مقامات کی کھدائی سے معلوم ہوا کہ قدیم زمانوں میں یہ علاقہ ہڑپہ تہذیب کا ایک نمایاں حصہ تھا۔ اس علاقے میں تغلق خاندان کے فیروز شاہ تغلق کی بنائی ہوئی کئی نہروں کی موجودگی بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ میں نے اپنی اس کتاب میں کئی جگہوں پر سلاطین دہلی کے بارے میں لکھا ہے۔ ان لوگوں کے مختلف واقعات مشہور ہیں۔ اب ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے یہ بھی دہلی کے قریب اور پشاور سے دہلی جانے والے صدیوں قدیم راستے پر موجود ہونے کی وجہ سے ان علاقوں میں شامل ہے جن پر سلاطین دہلی نے نہ صرف سب

سے پہلے قبضہ کیا بلکہ دیر تک حکومت بھی کی۔ اسی وجہ سے پانی پت کے آس پاس ان کی کئی نشانیاں بھی موجود ہیں، جن میں سے ایک بوعلی قلندر کا مزار بھی ہے۔ جو ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ فیروز شاہ تغلق نے چودھویں صدی کے وسط میں یہاں حکومت کی اور کچھ ایسے لازوال کام کیے جو اب تک یاد کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔

فیروز شاہ نے سفیدون کے علاقے میں کئی انتظامی تبدیلیاں بھی کیں اور موجودہ ضلع کے پورے علاقے کو اپنے ایک قابلِ اعتماد شخص کے ماتحت کر دیا۔ اس نے ایک دیرینہ روایت برقرار رکھتے ہوئے اس علاقے کا پرانا نام سفیدون ختم کر کے تغلق پور رکھ دیا۔ جسے بعد میں مقامی لوگوں کے نامنظور کرنے سے پرانا نام بحال کر دیا گیا۔ تیمور نے پنجاب سے ہریانہ میں داخل ہوتے ہوئے شمالی ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس نے ضلع جند میں موجود، سفیدون قلعہ جلا دیا۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سفیدون ایک اہم شہر تھا اور اس کی حفاظت کے لیے یہاں پر ایک قلعہ بھی موجود تھا۔

یاد رہے جب اٹھارھویں صدی میں سکھوں کی بارہ مثلوں (جتھوں) نے مغلیہ سلطنت کے خلاف جنگ شروع کی تھی تو اس وقت سفیدون ایک اہم مثل، پھولکیان کا صدر مقام بھی تھا۔ اس کے بانی پھول سنگھ کے ایک پوتے گجپت سنگھ نے 1763ء میں صوبہ سرہند پر سکھوں کے حملے میں حصہ لیا تھا اس حملے میں اس صوبے کا افغان گورنر زین خان مارا گیا تھا۔ سفیدون بنیادی طور پر جاٹ سکھوں کی سرزمین ہے۔

سفیدون میں واقع یہ تاریخی قلعہ ریاست جند کے حکمرانوں نے اٹھارھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ جند ریاست کی بنیاد 1763ء میں رکھی گئی جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ یہ قلعہ جند ریاست کے حکمرانوں کا تعمیر کیا ہوا پہلا قلعہ تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سفیدون کا تعلق مہا بھارت کی کہانی سے ہے۔ اس کہانی کے مطابق یہاں پر سانپ کی قربانی کی رسم ادا کی گئی تھی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کا سفیدون سے ایک گہرا تعلق رہا ہے جو تغلق خاندان کا ایک مسلمان حکمران تھا، اس نے 1351ء سے 1388ء تک سلطنت دلی پر حکومت کی۔ اس کے والد کا نام رجب تھا جبکہ ان کی والدہ نائلہ دیپالپور کی بھٹی راجپوت راجکماری تھیں جو رانا مل کی بیٹی تھی (اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکمرانوں سے قبل بھی مسلمان حکمران مقامی ہندوخواتین سے شادی کرتے تھے۔) اس کے باوجود کہ سلطان فیروز شاہ تغلق کی والدہ ایک ہندوعورت تھی، وہ نہ صرف مذہبی رجحان رکھتا تھا بلکہ اس نے اسلام کی ترویج کے لیے کئی اہم کام بھی کیے۔ فیروز شاہ تغلق نے بنگال، گجرات، پنجاب اور وسطی ہندوستان سمیت ایک وسیع علاقے پر حکومت کی۔ اس نے ہندوستان میں نہروں، سراؤں اور ہسپتالوں کی تعمیر، آبی ذخائر کا قیام اور لاتعداد کنویں بھی بنوائے۔ اس کے ساتھ ساتھ، دہلی کے آس پاس کے متعدد شہروں جن میں جون پور، فیروز پور، حصار، فیروز آباد اور فتح آباد کی آبادکاری کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔

اب تک اس کے بارے میں جو کچھ میں نے جانا ہے اس کے مطابق فیروز باقی حکمرانوں سے کئی لحاظ سے مختلف تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے اپنی ریاست کی توسیع نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور جو کچھ موجود تھا اسے ہی بہتر بنانے میں لگا رہا۔ اس کے دور میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کی حوصلہ افزائی کے لیے متعدد مدرسے کھولے گئے، غریبوں کے مفت علاج کے لیے ہسپتال قائم کیے گئے اور یونانی طب کی ترقی میں بے حد اہم کردار ادا کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس نے دیوانِ خیرات کے محکمے کے تحت غریب خاندانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی شادی کے لیے رقم فراہم کی۔ دلی میں بہت سی سرکاری عمارتوں کی تعمیر کا آغاز بھی اسی کے دور میں ہوا۔

سفیدون کے علاقے میں اس نے پانچ بڑی نہریں بنوائیں۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے وہاں پرتھوی راج چوہان نے بارھویں صدی میں ایک نہر بنوائی تھی جو ختم ہو گئی تھی۔ فیروز شاہ کے دور میں (چودھویں صدی میں) اسے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ بعد ازاں انگریزوں نے اسے توسیع بھی دی۔ اب یہ نہر ویسٹرن جمنا کینال کہلاتی ہے۔ اس علاقے کی خوشحالی میں اس نہر نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی ہمیں انگریزوں کی آمد سے قبل بنائی جانے والی نہروں کا ذکر ملتا ہے۔ جن میں سے پانچ تو صرف تغلق شاہ نے ہی بنوائی تھیں۔ جمنا نہر کا آغاز بھی پرتھوی راج چوہان کے دور میں ہوا۔ پرتھوی راج بارھویں صدی کے آخری دور میں اس علاقے کا

حکمران تھا اس کی وفات بارھویں صدی کے آخری عشرہ میں ہوئی۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان میں نہروں کی تعمیر کا آغاز انگریزوں نے نہیں کیا بلکہ دریاؤں سے نہر نکالنے کے کام کا آغاز ان کی آمد سے صدیوں قبل ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں نے اس کام کو پہلے سے زیادہ وسیع اور بہتر کیا۔

فیروز شاہ تغلق کو تاریخ میں بہت اچھے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

دی پرنٹ اخبار نے ان کے کارناموں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے۔

How Feroze Shah, father of irrigation system in India, created the largest 'baoli' in Delhi

فیروز شاہ تغلق نے کئی نئے شہر بھی بسائے، جن میں فیروز پور (پنجاب)، فیروز پور اتر پردیش، فیروزہ حصار، فیروز اباد دہلی، جونپور اتر پردیش۔ اس کے علاوہ اس کا نہروں کا بنانا ایک ایسا کام ہے جس نے اس زمانے کی معیشت پر بے حد اثر ڈالا، کسان خوشحال ہوا، بھوک کا خاتمہ ہوا۔ میرے ذاتی خیال میں سلاطین دہلی میں فیروز شاہ کا ایک اہم مقام ہے۔ ان کے بارے کم ہی منفی بات سننے کو ملتی ہے۔ جو شخص بھی لوگوں کی بھلائی کے کام کرے گا اس کا نام تو باقی رہے گا۔ یہ میرا ایمان ہے۔

یہ سب کچھ اس وقت یاد آیا جب ہم کرنال کے بعد اس قدیم نہر پر سے گزر رہے تھے جس کا آغاز بارھویں صدی میں پرتھوی راج نے کیا، اور فیروز شاہ نے اسے دوبارہ فعال کیا اور انگریزوں نے مزید سنوارا۔ یہ علاقے جہاں تیرھویں صدی سے آزادیِ ہند تک مسلمانوں کی کثیر تعداد آباد تھی اب دو فیصد سے بھی کم ہے۔ اس کے نتیجے میں دیہاتوں میں موجود بے شمار چھوٹی مساجد بے آباد ہو گئیں۔ البتہ بڑے قصبوں اور شہروں میں ایسا نہیں ہوا۔

ایسا گرجا گھروں کے ساتھ نہیں ہوا، کیونکہ عیسائیوں نے کوئی نقل مکانی نہیں کی!

❀ ❀ ❀

مظفر نگر

جسے بھارت کا کرائم کیپیٹل بھی کہا جاتا تھا

ہم پانی پت سے کافی آگے آ چکے تھے۔ میں نے نقشے میں دیکھا کہ ہمارے بائیں طرف ایک مشہور شہر مظفر نگر واقع ہے۔ یاد رہے کہ یہ شہر یو پی کا حصہ ہے۔ مگر اس کے بارے کئی دلچسپ باتیں معلوم ہوئی جن کا تعلق پنجاب سے بھی بنتا تھا، اس لیے میں اس شہر کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔

مظفر نگر نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر کسی مسلمان نے آباد کیا تھا۔ اس شہر سے متعلق دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ اس کی آبادی کا چالیس فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم جی ٹی روڈ پر سفر کر رہے تھے ہمارے دائیں طرف وہ علاقے تھے جہاں مسلمانوں کی تعداد ایک فیصد سے بھی کم تھی۔ ہمارے بائیں طرف اتر پردیش کا علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی چالیس فیصد سے بھی زائد ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی (پیدائش تو کرنال کی ہے) ایک رہائش گاہ مظفر نگر کے قریبی قصبے میں بھی تھی۔ پاکستان فلم انڈسٹری کے ایک معروف ادا کار سلطان راہی کی پیدائش بھی 1938ء میں مظفر نگر میں ہی ہوئی تھی۔ ان کا تعلق ایک ارائیں خاندان سے تھا۔ آزادیِ ہند کے بعد ان کا خاندان گوجرانوالہ میں رہائش پذیر ہوا۔ اس شہر کو کرائم کیپیٹل آف انڈیا بھی کہا جاتا ہے۔ ان سب باتوں نے مجھے مظفر نگر کے بارے میں مزید جاننے پر مجبور کیا اور جو چند اہم باتیں مجھے پتہ چلیں وہ آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ چودھویں صدی تک یہ علاقے خاصے غیر آباد تھے۔ اس علاقے کو سروت کہا جاتا تھا اور مقامی جاٹ اس کے حاکم تھے۔ تیمور کے حملے کے وقت مقامی لوگوں

نے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے جس کا نتیجہ ایک تباہی کی شکل میں سامنے آیا۔

یہ علاقہ شاہ جہاں کے ایک جرنیل خان خاناں کے والد سید مظفر خان کو شاہجہاں نے سپرد کیا تھا۔ان کی وفات کے بعد خان خاناں نے یہاں پر ایک شہر کی بنیاد رکھی ،جس کا نام اپنے والد کے نام پر مظفر نگر رکھا۔ اس بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں لکھی ہیں ، اس سے قبل اس علاقے میں مولاہری جاٹوں کی حکومت تھی۔ وہ سروت یا سرسوتی پورہ کے نام سے مشہور تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد یہ علاقہ برٹش انڈیا کا حصہ بن گیا۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شہر کی بنیاد ساڑھے تین سو سال قبل رکھی گئی تھی۔ یہ شہر بھی انھی علاقوں میں شامل ہے جہاں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس شہر میں ہندوؤں کی 55 فیصد جبکہ مسلمانوں کی تعداد 40 فیصد سے بھی زائد ہے۔ پنجاب کے قریب ہونے کے باوجود یہاں سکھ ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔اس علاقے میں بولی جانے والی زبان کو کھڑی بولی کہا جاتا ہے جو ہندی زبان کا ہی ایک لہجہ ہے۔

اس علاقے میں بھارت کی سب سے بڑی گڑ منڈی بھی موجود ہے جس کی وجہ سے اسے Sugar Bowl of India بھی کہا جاتا ہے۔ پانی پت سے اس کا فاصلہ اسی کلومیٹر ہے۔

ابھی حال ہی میں ''بھاوکال'' نام کی ایک ہندی فلم بنائی گئی ہے۔ یہ فلم ایک پولیس آفیسر نونیت سکیھرا سے جڑے واقعے سے متعلق ہے جس نے اس شہر میں جرائم کے خاتمے کے لیے بے حد اہم کارنامے سرانجام دیے۔ 2013ء میں یہاں ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے ،ان کی بھی ایک دردناک کہانی ہے۔اس علاقے میں کالی ندی کے قریب ایک گاؤں سے ہڑپہ دور کی اشیا بھی ملی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقے صدیوں سے آباد ہیں۔

❁❁❁

سونی پت

جہاں بابا بندہ سنگھ نے مغلوں کی شکست دی اور سکھ ریاست قائم کی

پانی پت کا نام تو بہت سننے میں آتا ہے لیکن سونی پت پہلی دفعہ سننے کو ملا۔ جب ہم یہاں سے گزر رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ علاقے ہمارے پنجاب سے کافی ملتے جلتے تھے۔ لوگوں کی رنگت اور قد کاٹھ بھی ہمارے جیسا ہی تھا۔ میں نے اپنے پاس موجود کتاب میں اس علاقے کے بارے میں پڑھا تو مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہ شہر بھی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

یہاں سے دو ایسی شخصیات کا تعلق ہے جو تاریخ میں ایک ہم مقام رکھتی ہیں۔ ایک بابا بندہ سنگھ، ایک سکھ جرنیل جس نے سب سے پہلے سکھوں کی طرف سے مغلیہ سلطنت کو للکارا۔ اس نے خوب مقابلہ کیا لیکن آخر کار گرفتار ہوا اور مغلوں نے اسے شدید تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔ دوسری شخصیت شیخ خضر ہیں جن کا مقبرہ بے حد خوب صورت اور قابل دید ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ سونی پت اور اس کے ارد گرد واقع چند اہم مقامات کا ایک مختصر تذکرہ آپ کی خدمت میں پیش ہے (سیالکوٹ میں سونی نام کے کئی خاندان آباد ہیں)۔

سونی پت ریاست ہریانہ میں واقع ایک شہر ہے جو دہلی سے تقریباً پینتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔ کسی وقت اس کا نام سوارنپرا ستھا بھی تھا جو بعد میں سورنپرستھا (سونے کا شہر) میں تبدیل ہو گیا۔ اب اسے سونی پت ہی کہتے ہیں۔ اس شہر کا ذکر مہابھارت میں بھی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک قدیم شہر ہے جس کی تاریخ مہابھارت سے بھی پرانی ہے۔ سونی پت کے بارے میں آئین اکبری میں درج ہے کہ یہ اکبر کے دور میں ایک امیر شہر تھا اور اسے ایک الگ

پرا گنا کا درجہ بھی حاصل تھا۔اس شہر سے اکبر کو کثیر تعداد میں مال و دولت اور فوجی ساز و سامان مہیا کیا جاتا تھا۔اس وقت یہاں پر ایک قلعہ بھی موجود تھا۔سونی پت کی مجموعی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس شہر میں مردوں کی شرح خواندگی نوے فیصد سے بھی زائد ہے۔

خواجہ خضر ایک مشہور صوفی بزرگ

خواجہ خضر سولھویں صدی کے ایک مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں،سونی پت میں ان کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ یہ مقبرہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔آپ دریا خان کے بیٹے تھے۔ان سے متعلق تاریخ میں ملتا ہے کہ ان کے مقبرے کی تعمیر ابیراہیم لودھی نے کروائی تھی۔ یہ مقبرہ سونی پت کے علاقے جٹ واڑہ میں شہری علاقے سے ہٹ کر ایک نیم شہری جگہ پر واقع ہے۔اس کے چاروں طرف سرسبز و شاداب باغ ہیں۔ یہ مقبرہ ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ یہاں کثیر تعداد میں لوگ منتیں ماننے آتے ہیں۔اس کی فن تعمیر دیکھنے کے لیے بھی یہاں سیاحوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ یہ مقبرہ دس ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔اس وقت اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھارتی حکومت پر ہے۔

میں نے اس مقبرے کی تاریخ جاننے کی کوشش کی تو صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ ایک صاحب، جن کا نام دریا خان سروانی تھا،سکندر لودھی (ابراہیم لودھی کے والد) کے دربار میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ان کے بیٹے کا نام خضر تھا۔ میں نے مناسب کوشش کی کہ یہ جان سکوں کہ کیا یہ ان کا اصل نام تھا یا مسلمانوں میں مشہور خواجہ خضر نامی ایک مشہور بزرگ کے نام پر یہ صوفی بزرگ گزرے ہیں۔(جن کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ ایک زندہ صوفی ہیں لیکن پوشیدہ ہیں اور مشکل وقت میں لوگوں کی مدد کے لیے آتے ہیں) خواجہ خضر ایک صوفی منش انسان تھے اور اپنے والد کی طرح کسی دربار سے منسلک نہیں تھے۔ان کی وفات پر سکندر لودھی نے ان کے مقبرے کی تعمیر شروع کی لیکن وہ اسے مکمل نہ کروا سکا۔بعدازاں ابراہیم لودھی نے اس کی تکمیل کی۔

یاد رہے سونی پت اور پانی پت ہی وہ علاقے ہیں جہاں بابر اور لودھی کے درمیان ایک جنگ ہوئی تھی۔اس جنگ کی ابتدا بھی لودھی خاندان میں ایک جھگڑے سے ہوئی تھی۔ کہتے ہیں

کہ ابراہیم لودھی کا چچا دولت خان پنجاب کے علاقے کا گورنر تھا۔ وہ اپنے بھائی سکندر لودھی کی وفات کے بعد حکمرانی کا دعویدار تھا لیکن اس کی بجائے سکندر کے بیٹے ابراہیم نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس بات سے ناراض ہوکر دولت خان نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا اور اسے ہر طرح کی مدد فراہم کرنے کی یقین دہانی بھی کروائی۔ اور پھر وہی ہوا۔

بابر آیا، گھر کا بھیدی اس کے ساتھ تھا، جس علاقے میں جنگ لڑی گئی وہاں دولت خان مدت سے رہ رہا تھا اور اس نے بابر کا دل وجان سے ساتھ بھی دیا۔ ابراہیم میدان جنگ میں مارا گیا۔ مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ لودھی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

دولت خان کو کیا ملا حقیقت تو معلوم نہیں لیکن میں اتنا ضرور اندازہ کرسکتا ہوں کہ غداروں کو ذلت کے سوا کچھ نہیں ملتا!

سونی پت کی جنگ جو سکھوں اور مغلوں کے مابین لڑی گئی

جب ہم سونی پت میں تھے تو مجھے یہاں پر ہونے والی ایک جنگ یاد آ گئی۔ اس جنگ میں سکھوں کی طرف سے بندہ سنگھ بہادر، جبکہ دوسری طرف مغل سلطنت تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میرے بزرگ بھی کبھی کبھی بندہ سنگھ بہادر کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ بندہ سکھ کا تعلق ان کے علاقے سے تھا اور اس نے مغلوں کو للکارا تھا۔ ہم اس جنگ والے علاقے سے گزر رہے تھے۔ اس جنگ کا مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

بندہ سنگھ بہادر

ایک سکھ سردار جس کا ذکر آج بھی سکھ عزت سے کرتے ہیں: بندہ سنگھ بہادر 1670ء میں دہلی کے ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوا۔ ان کا پیدائشی نام لچھمن داس یا لچھمن دیو تھا۔ یاد رہے کہ آغاز میں ہندو دھرم کے لوگ ہی سکھ دھرم اختیار کرتے تھے۔ میں نے سندھ میں کئی مندر دیکھے ہیں جہاں بابا گورو نانک کی تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ایک مسلمان عالم نے ان کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس میں انھیں ایک بت شکن کا خطاب دیا

گیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی بھی گردوارے میں کوئی بھی مورتی نہیں ہوتی۔ وہ پندرہ سال کی عمر میں گھر سے نکل گئے تھے۔ایک وقت آیا کہ وہ گرو گوبند سنگھ کے شاگرد بن گئے،جن کی زندگی کا بڑا حصہ سکھ افواج کو اکٹھا کرنے اور مغلیہ سلطنت کے خلاف جنگ میں گزرا۔سکھ دھرم میں داخل ہونے کے بعد انھیں بندہ سنگھ بہادر کا نیا نام دیا گیا۔ بندہ سنگھ بہادر کا کارنامہ اگر صرف جنگ جیتنے تک ہوتا تو بھی قابلِ ذکر ہوتا لیکن انھوں نے ایک ایسا کام کیا جو ہندوستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں نہیں ملتا۔مسلمان تاریخ دانوں نے ان کا ذکر مسلمانوں کے ایک قاتل کے طور پر کیا ہے جس نے پنجاب میں مسلمانوں کو سفاک طریقے سے قتل کیا اور ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

گورو گوبند سنگھ نے برکت کے طور پر اسے پانچ تیر دیے تھے۔گرو گوبند سنگھ سے ملاقات کے بعد انھوں نے کھنڈا کی طرف مارچ کیا اور سکھ فوج کی مدد سے سونی پت کی لڑائی میں مغلوں کا مقابلہ کیا۔ بندہ سنگھ بہادر سونی پت آیا جہاں اس نے ایک بڑی فوج کو جمع کیا۔اس کی پہلی بڑی لڑائی نومبر 1709ء میں مغلوں کے خلاف اسی علاقے میں ہوئی جس کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کے صوبائی دارالحکومت سمانا سے مغلوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔سمانا بھارتی ریاست پنجاب کے ضلع پٹیالہ کا صدیوں پرانا ایک اہم شہر ہے۔ (میرے آباؤاجداد کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا)۔ جنگ جیتنے کے بعد اس نے ایک ریاست کا اعلان کیا اور ایک ایسا کام کیا جس کی کسی کو بھی توقع نہ تھی۔ اس نے علاقے میں موجود زمینداری نظام ختم کر دیا اور ان سے حاصل کی ہوئی زمین کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا۔ بعدازاں بندہ سنگھ کو مغلوں نے پکڑ کر تشدد کر کے قتل کر دیا۔

سمانا میں مغلیہ سلطنت کے لیے سکے ڈھالے جاتے تھے، جہاں بندہ سنگھ بہادر کی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔اس طرح سکھ معاشی طور پر مستحکم ہو گئے۔اس کے بعد بندہ سنگھ بہادر کی فوجوں نے مصطفیٰ آباد (جس کا نام اب سرسوتی نگر ہے)، سدھوڑہ (جگادھری کے قریب)، مالیرکوٹلہ اور نہان سمیت ستلج کے قریب واقع پنجاب کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

اسی دوران 1710ء میں سکھوں نے سرہند کے گورنر وزیر خان اور دیوان سوچانند کو ہلاک

کر دیا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے گرو گوبند سنگھ کے دو چھوٹے بیٹوں کو دیوار میں چنوایا تھا۔ اس دور میں سکھوں نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ انھی وقتوں میں بندہ سنگھ نے حکم دیا کہ زمین کی ملکیت کسانوں کو دی جائے تاکہ وہ وقار اور عزت نفس کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ ایسا حکم تاریخ ہندوستان میں کہیں نہیں ملتا۔ بندہ سنگھ بہادر یہ سمجھتا تھا کہ بڑے زمیندار کسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔ اس نے کسانوں کو حق ملکیت دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سرکاری افسران کے خلاف بھی سخت اقدامات کیے۔ اس کی انھی کاوشوں کی وجہ سے اسے آج بھی اس علاقے میں ایک بھگوان کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک سکھ جرنیل کا کارنامہ تھا جو سکھوں کے نزدیک ایک محترم نام ہے جب کہ مسلمان اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے!

بندہ سنگھ بہادر نے مخلص گڑھ نامی قصبہ آباد کیا اور اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس کے بعد اس نے اس کا نام لوہ گڑھ (اسٹیل کا قلعہ) رکھ دیا جہاں اس نے سکوں کو ڈھالنے کا کام شروع کیا اور کہا کہ ''اپنی حکومت اپنا سکہ''۔ کہتے ہیں کہ اس سکے پر لکھا ہوتا تھا کہ لوہ گڑھ ایک ایسا شہر ہے جہاں شہری امن سے رہتے ہیں اور زندگی کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ زیب وزینت کی عکاسی کرتا ہے۔

پنجاب میں بندہ سنگھ بہادر کی حکومت صرف نصف سال تک ہی قائم رہی۔ اس کے دور میں توسیع کا عمل بھی جاری رہا۔ اس نے اتر پردیش میں بھی اپنی فوجیں بھیجیں اور سہارنپور، جلال آباد، مظفرنگر سمیت کئی مسلم اکثریتی علاقوں پر قبضہ بھی کیا- میرے خیال میں اس کی توسیع پسندانہ پالیسی ہی اس کے جلد زوال کا باعث بنی۔ کچھ عرصے بعد ہی مغلیہ سلطنت نے اس پر قابو پالیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟ اس کا مختصر ذکر پیش خدمت ہے۔

بندہ سنگھ بہادر کو شکست دینے اور اسے مارنے کے لیے ایک بڑی مغل فوج تیار کی گئی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ مغل فوج میں کوئی سکھ نہ ہو، تمام ہندوؤں کو داڑھی منڈوانے کا حکم

جاری کیا گیا۔(اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل فوج میں ہندوؤں کی کثیر تعداد موجود تھی)۔منعم خان، مغل فوج کا کمانڈر تھا۔ایک طویل اور خونریز جنگ کے نتیجے میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ بندہ سنگھ بہادر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی دور تھا جب مغل شہنشاہ، بہادر شاہ نے حکم دیا تھا کہ جہاں کہیں بھی کوئی سکھ ملے تو اسے قتل کر دیا جائے۔اور پھر ایسا ہی ہوا۔

کتنے سکھ قتل ہوئے، کسی کو بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے!

بندہ سنگھ بہادر نے ایک مرتبہ پھر سکھوں کو منظم کیا اور کئی جنگیں لڑیں اور دوبارہ ایک بڑے علاقے پر قابض ہو گیا۔ پھر لاہور کے گورنر عبد الصمد خان کی قیادت میں مغلوں کی فوج نے 1715ء میں بندہ سنگھ بہادر کی فوجوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑی- بندہ بہادر کی فوجیں گورداسپور میں واقع ایک گاؤں تک محصور ہو گئیں۔مغل فوج نے اس گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ آٹھ مہینوں تک جاری رہا۔ بلاآخر سکھ ہار مان گئے۔

بندہ سنگھ بہادر کو لوہے کے پنجرے میں ڈال دیا گیا اور باقی سکھوں کو زنجیروں میں جکڑ کر دہلی لایا گیا۔ دہلی میں انھیں انتہائی ظالمانہ طریقے سے قتل کیا گیا(اس کی تفصیل لکھنا میرے بس میں نہیں ہے)- یہ وہ دن تھے جنھیں کوئی بھی سکھ کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔

آج بھی آپ کو اس علاقے میں جگہ جگہ بندہ سنگھ بہادر کے مجسمے ملیں گے۔ابھی حال ہی میں مودی نے پنجاب کے پرکاش سنگھ بادل کے ہمراہ بندہ سنگھ بہادر کی تین سو سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک یادگار کی نقاب کشائی بھی کی ہے۔اس سے آپ بندہ سنگھ بہادر کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک سٹال پر بندہ سنگھ بہادر کی تصویر بھی دیکھی۔جس سے میں یہ اندازہ کر سکتا ہوں کہ بندہ سنگھ بہادر اب بھی لوگوں کی نظروں میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

میں نے بھارت بھر میں جا بجا ان لوگوں کے مجسمے اور یادگاریں دیکھی ہیں جنھوں نے ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کروانے کے لیے جدوجہد کی لیکن کسی غیر ملکی کی کوئی یادگار میری نظر

سے نہیں گزری۔ اگر ہے بھی تو ان لوگوں کی خود کی بنائی ہوئیں۔ آزادیِ ہند کے بعد بھارت میں کسی بھی غیر ملکی کی کوئی یادگار نہیں بنائی گئی (یہ ان غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف نفرت کا اظہار بھی ہو سکتا ہے)۔ اس کے برعکس پاکستان میں آپ کو مسلمان حملہ آوروں کی یادگاریں جگہ جگہ مل جائیں گی۔ حتیٰ کہ پاکستان میں بننے والے کئی میزائلوں کے نام بھی ان کا نام پر رکھے گئے ہیں، جیسے غوری وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں بھارت میں بننے والے میزائلوں کے نام انھوں نے اپنی مذہبی شخصیات کے نام پر رکھے ہیں، جیسے پرتھوی وغیرہ۔ دلچسپ یہ بات بھی ہے کہ آزادیِ ہند کے بعد بھارتی لوگوں نے کچھ ایسے مسلمانوں کی یادگاریں بھی بنائیں۔ جنھوں نے ہندوستان کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا، جیسے ٹیپو سلطان۔ یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بھارتیوں نے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی جو قدر کی وہ ہندوستان کی آزادی پر قبضہ کرنے والوں کی نہیں کی۔

چودھری چرن سنگھ

میں نے جب ہندوستان کی تاریخ بارے میں پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ایک صاحب جن کا نام چودھری چرن سنگھ تھا، ان کا تعلق ایک قریبی قصبے چپارولی سے تھا۔ یاد رہے کہ ہم دریائے جمنا کے مغرب میں سفر کر رہے تھے۔ جمنا کے مغرب میں ہریانہ اور مشرق میں اتر پردیش واقع ہے۔ چپارولی دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اتر پردیش کا حصہ ہے۔ (کسی چھوٹی جگہ سے کسی بڑی شخصیت کا تعلق بھی اسے بڑا بنا دیتا ہے۔) اسی قصبے سے چودھری چرن سنگھ نے اپنی سیاست کا آغاز کیا۔ میں ان کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ ان کا پنجاب سے گہرا تعلق تھا۔

چودھری چرن سنگھ کے بارے میں مزید پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک نظریاتی سیاست دان تھے، جنھوں نے جواہر لال نہرو کی روس نواز پالیسی کی مخالفت کی اور نہ صرف اتر پردیش کے پہلے غیر کانگریسی وزیر اعلیٰ بنے بلکہ کچھ ماہ کے لیے بھارت کے وزیر اعظم بھی رہے۔ انھوں نے چھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ یہ ساری کتابیں بہت نظریاتی اور علمی نوعیت کی ہیں۔ چودھری چرن سنگھ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بھارتی کسانوں کا ایک قابل اعتماد اور متفقہ نمائندہ

تھے۔(آج جب میں یہ سفرنامہ لکھ رہا ہوں بھارت میں کسانوں کا احتجاج جاری ہے۔)

کوآپریٹو فارمنگ، جس کا تصور آج مودی نے دیا ہے، کوئی نیا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ تصور پہلی مرتبہ جواہر لال نہرو نے ہی دیا تھا، جس کی چودھری چرن سنگھ نے سخت ترین مخالفت کی تھی۔ (اسی وجہ سے انھیں بھارت کے کسانوں کا صحیح خیر خواہ کہا جاتا ہے۔) آج میں ان کے آبائی قصبے کے قریب سے گزر رہا تھا میں نے ان کے بارے مزید جاننے کی کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ بھارت کی سیاست میں ان کا ایک اہم کردار رہا ہے اور وہ ان چند لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے سیاسی میدان میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ علمی دنیا میں بھی اپنا نام کمایا، اصولوں کی خاطر صرف چوبیس ہفتے وزیر اعظم رہنے کے بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

ان کی شخصیت کے بارے میں لکھنے کا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ آپ کے علم میں ہو کہ بھارت ایک ایسا ملک ہے جہاں آزادیِ ہند کے بعد روسی نظریات کا اہم کردار رہا ہے۔ بھارت میں بننے والی بہت سی معاشی پالیسیاں سوشلزم کو سامنے رکھ کر بنائی جاتی رہی ہیں۔ کئی ریاستیں تو کمیونسٹ بھی کہلواتی تھیں۔ مرکزی طور پر تو بہت سی (کمیونزم اور سوشلزم) کی پالیسیوں پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئیں۔ ان کی مخالفت میں چودھری چرن سنگھ سب سے آگے رہے۔

چودھری چرن سنگھ کی زندگی کا ایک مقصد نہرو کی کسان دشمن پالیسیز کی مخالفت بھی تھا۔ انھوں نے سب سے یہ کہا کہ کسان کبھی بھی اپنی زمین سے دستبردار نہیں ہوگا (اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ٹریکٹر لے کر دہلی کے لال قلعے کے مینار تک بھی پہنچ گیا۔) بھارت میں انھیں زرعی اِصلاحات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی علم دوستی کی وجہ سے اور شاید اس وجہ سے بھی کہ میں بھی ایک کسان کا بیٹا ہوں، میں نے ان کے متعلق تفصیل سے پڑھا۔ ان کی جدوجہد کا مختصراً احوال پیش خدمت ہے۔

چودھری چرن سنگھ 1902ء میں ضلع میرٹھ کے ایک گاؤں میں رہنے والے جاٹ خاندان میں پیدا ہوئے اور 1987ء میں وفات پائی۔ وہ 28 جولائی 1979ء سے لیکر 14 جنوری 1980

ء تک بھارت کے پانچویں وزیر اعظم بھی رہے۔ انھوں نے سیاسی زندگی کا آغاز گاندھی کے ساتھ مل کر کیا اور تحریک آزادی ہند کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ انھیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ وہ آزادی سے قبل، 1937ء میں منتخب ہونے والے متحدہ صوبوں کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ ایک وقت میں وہ کانگریس کے چوٹی کے تین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ بحیثیت وزیر برائے زرعی اصلاحات بھارت میں ہونے والی زرعی اصلاحات میں ایک اہم کردار ہے۔ ایک طرح سے وہ پہلے کانگرسی لیڈر ہیں جنھوں نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی سوشلسٹ اور اجتماعی زمین کی پالیسیوں کی عوامی سطح پر مخالفت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے شمالی ہندوستان میں ذات پات میں پسے طبقوں اور کسانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی اور یہ سب لوگ انھیں اپنا لیڈر تسلیم کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں کانگریس کی پالیسیوں کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ اپنے انھیں خیالات کی وجہ سے وہ کانگریس سے الگ ہو گئے اور اپوزیشن پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ایک وقت آیا کہ وہ یو پی کے پہلے نان کانگریسی وزیر اعلیٰ بن گئے۔ بعد میں 1979ء میں بھارت کے وزیر اعظم بن گئے اور صرف چوبیس ہفتوں کے بعد انھوں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ جس کی ایک بڑی وجہ اندرا گاندھی کے ہنگامی حالات سے متعلق عدالتی معاملات واپس لینے کے لیے دباؤ تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی موت تک حزب اختلاف میں شامل رہے۔

چودھری چرن سنگھ کا تعلق راجہ نہار سنگھ جو فرید آباد میں واقع بال بھگڑھ ریاست کے ایک بہت بڑے حکمران خاندان سے تھا (فرید آباد اب ہریانہ کا حصہ ہے)۔ اس کا تعلق جاٹ قبیلے کی ایک شاخ تیوتیہ گوترا سے تھا۔ یہ ایک جاٹ ریاست تھی جو اپنے وقت کی ایک چھوٹی مگر امیر ریاست مانی جاتی تھی۔ اس خاندان کے سورج مل کے ساتھ خاندانی تعلقات بھی تھے۔ راجہ نہار سنگھ کو بغاوت کے جرم میں دہلی کے چاندنی چوک میں سرعام پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا تھا۔

کیا اس کے باوجود بھی انگریزوں کو ہندوستان میں چند ترقیاتی کام کرنے کے بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے، قطعی طور پر نہیں!

اس طرح ان کی ریاست کا خاتمہ انگریزوں کے ہاتھوں ہوا۔ انگریزوں کے مظالم سے تنگ آ کر چودھری چرن سنگھ کے دادا اتر پردیش کے ضلع بلند شہر چلے گئے تھے۔ اس ریاست کا تعمیر کردہ ایک محل اب ہریانہ ٹورزم کے تحت ہے۔ فرید آباد میں نہار سنگھ اسٹیڈیم کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ بھارتی لوگوں نے انھیں ضرور یاد رکھا جنھوں نے آزادی کی خاطر پھانسی چڑھنا قبول کیا۔ ایک میٹرو سٹیشن کا نام بھی راجہ نہار سنگھ کے نام پر رکھا گیا ہے۔

چودھری چرن سنگھ کی درج ذیل کتب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

❋ *Joint Farming X-rayed* (1959)

❋ *India's Economic Policy* – The Gandhian Blueprint (1978)

❋ *Economic Nightmare of India:* Its Cause and Cure (1981)

❋ *Abolition of Zamindari*

❋ *Co-operative Farming X*

❋ *Prevention of Division of Holdings Below a Certain Minimum*

جو بھی تاریخ میں نے پڑھی ہے اس میں پانی پت کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ یہی وہ علاقے ہیں جہاں پر مہا بھارت کے دور کی جنگیں ہوئی اور بعد میں بابر اور لودھی کی جنگ بھی اسی علاقے میں ہوئی اور آخری بڑی جنگ مراٹھوں اور ابدالی کے درمیان بھی اسی علاقے میں لڑی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی جاننے کا ملا کہ جی ٹی روڈ کے مغرب میں ایک بہت پرانا قصبہ موجود ہے جو ہندوؤں کے نزدیک نہایت متبرک سمجھا جاتا تھا اس کا نام گوہانا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ پرتھوی راج چوہان نے بارھویں صدی میں یہاں ایک قلعہ بنوایا تھا۔ جب غوری نے چوہان کو شکست دی تو اس نے اس کے قلعے کو بھی تباہ کر دیا۔ ابھی بھی اس قلعے کی باقیات موجود ہیں۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ تمام تر علاقے کسی وقت چوہان ریاست میں شامل تھے۔ بعد میں ان علاقوں پر سلاطین دہلی اور مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں نے قبضہ کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پنجاب کے بٹوارے کے بعد یہاں سے بہت سے مسلمان جن پر

بے شمار مظالم ڈھائے گئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں آپ کو بے شمار ایسے لوگ ملیں گے جو ان علاقوں سے پاکستان میں آ کر آباد ہوئے۔ ان میں سے اکثریت ہریانوی زبان بولنے والوں کی جسے کچھ لوگ کھڑی بھاشا بھی کہتے ہیں۔(پنجابی کے بعد ہریانوی میری پسندیدہ زبان ہے۔جو میں کسی حد تک بول بھی لیتا ہوں)

آپ ہندوستان کے جس علاقے میں بھی جائیں تو آپ کو اس علاقے کے بارے میں اگر جاننے کا موقع ملے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ علاقے ہزاروں سال سے آباد ہیں اور اپنی دلچسپ تاریخ رکھتے ہیں۔اس تاریخ سے آگاہی ہم سب کے لیے بے حد ضروری ہے۔

جو قوم اپنی تاریخ نہیں جانتی وہ اپنا مستقبل بھی نہیں سنوار سکتی!

❁ ❁ ❁

نریلا

جہاں چھ سو سال پرانا تالاب اور مراٹھوں اور ابدالی کا میدان جنگ

اب شام ہو رہی تھی۔ دہلی قریب ہی تھا۔ ہم اب ہریانہ سے نکل کر بھارت کے وفاقی علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ دہلی بھارت کی باقی ریاستوں کی طرح ایک ریاست ہے۔ (جیسے پاکستان میں اسلام آباد ایک الگ علاقہ ہے) اس کے کئی اضلاع ہیں جن میں ایک شمالی ضلع بھی ہے۔ نریلا اسی ضلع کا ایک قصبہ ہے جو دہلی سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر دہلی اور ہریانہ کی سرحد پر واقع ہے۔ دہلی کی قربت کی وجہ سے اس شہر نے بھی کافی تیزی سے ترقی کی ہے۔

نریلا میں واقع ایک علاقے بھورگڑھ میں آثار قدیمہ کے ماہرین نے کھدائی کی اور ان کی رائے کے مطابق یہ علاقہ انڈس ویلی تہذیب کا ایک نمایاں حصہ تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر سات ہزار سال پہلے بھی آبادی تھی۔ اس علاقے میں واقع ایک سرائے کا ذکر جہانگیر نے بھی کیا ہے، وہ اس سرائے میں ٹھہرا بھی تھا۔ اس جگہ کی اہمیت اس طرح بھی ہے کہ یہاں دہلی سے باہر جانے والی فوجوں کا اکٹھ ہوتا تھا اور حملے کے لیے تیاری کی جاتی تھی۔ یہاں پر موجود تالاب بھی ایک قدیم روایت کا حامل ہے۔ یہ تالاب چھ سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تالاب ہمیشہ بھرا رہتا تھا لیکن اب خشک ہو گیا ہے۔ میں نے اس کی وڈیو بھی دیکھی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تالاب کافی وسیع تھا۔ اسے کس نے بنایا؟ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ بات مصدقہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی یہ تالاب موجود تھا۔

اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ آگرہ سے کابل تک کا علاقہ ہمیشہ سے ہی جنگ وجدل کا میدان رہا ہے لیکن چند بڑی جنگیں دہلی سے پانی پت کے درمیان ہی ہوئی ہیں۔ نریلا کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراٹھوں اور ابدالی کے درمیان پانی پت کی بڑی جنگ ہونے سے قبل ان کے دستوں کے درمیان پہلی جھڑپ نریلا میں ہوئی تھی جس میں مراٹھوں نے ابدالی کی فوج کو شکست دی تھی۔ اس جیت نے مراٹھوں کو جیت کے نشے میں مبتلا کر دیا اور وہ ابدالی کو ایک آسان دشمن سمجھ بیٹھے۔ اس کے برعکس اس شکست نے ابدالی کو چوکنا کر دیا۔ مراٹھوں کی وہ پہلی جیت ان کی آخری شکست کا باعث بنی۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

انھی سوچوں میں گم ہم دہلی کی طرف سفر کر رہے تھے۔

دہلی: اب دور نہ تھا

جب ہم دہلی میں داخل ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ مجھے یہ بہت ہی عجیب لگا کہ جب بھی ہماری بس کسی چوراہے سے گزرتی تو سگنلز بند کر کے ہمیں گزارا جاتا۔ ساٹھ کی دہائی کی ایک فلم بھی یاد آ گئی جس کا عنوان تھا، 'اب دلی دور نہیں'۔ بس سے اتر کر اور ٹیکسی والوں سے بھاؤ تاؤ کر کے ہم قرول باغ میں موجود اپنے ہوٹل چلے گئے۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور ایک نیا ملک جس کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کشیدگی بھی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لوگوں سے بات چیت میں اور شکل وصورت میں کوئی فرق بھی نہ ہو، یہ دو مختلف صورتیں عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ میں اور عرفان صاحب ایک ذمہ داری کا بوجھ بھی محسوس کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ بچے بھی تھے، سبھی جوان تھے، انھیں روکنا اور کسی ڈسپلن کا پابند بنانا بھی کافی مشکل ہو رہا تھا۔

بہر حال ایسا تو ہوتا ہے ایسے کاموں میں۔

بچے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، میں اور عرفان صاحب ایک ہی کمرے میں رہے۔ دہلی میں ہمارا قیام پانچ دن کا تھا جہاں ہمیں آئی آئی ٹی دہلی میں ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ نارتھ انڈین ٹیکسٹائل ریسرچ اسوسی ایشن (جسے عام طور پر نترا کہا جاتا ہے) کے مرکزی دفتر بھی جانا تھا۔ ہم ان ہی کی دعوت پر بھارت آئے تھے۔ انھوں نے ہمارے لیے کئی ٹیکسٹائل ملز کے دوروں

کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔ایک دن ہم نے دہلی کے اہم مقامات کی سیر کی۔ہم آگرہ بھی گئے۔ وہاں پر ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا۔اس وقت روٹری کلب سے میرا تعلق تھا۔روٹری کلب دہلی نے ہمارے لیے ایک پروگرام کا بندوبست کیا تھا، جو کافی دلچسپ تھا۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ مجھے چار مرتبہ بھارت جانے کا موقع ملا۔ ہر بار دہلی میں کئی دن ٹھیرنے کا موقع ملا۔ان چار اسفار میں دہلی کو جی بھر کے دیکھا اور اسے اپنی کتاب بھارت کے چار سفر میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یاد رہے کہ دہلی صدیوں سے پنجاب کا حصہ تھا۔آج بھی اس کے تین اطراف میں ہریانہ کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔پھر ایک دن ''صاحب بہادر'' نے ہندوستان پر مکمل کنٹرول کی خاطر اپنا تخت کلکتہ سے اٹھا کر دہلی میں لا رکھا۔اس سے دہلی کو دو حصوں میں ن تقسیم کیا اور نئی دہلی کے نام سے ایک نیا شہر بسایا۔ اس کی خاطر اس نے کئی دیہات کو ختم کیا اور اسے اپنی راجدھانی بنایا۔ دہلی تو صدیوں سے ہندوستان بھر کے بادشاہوں کی راجدھانی رہا ہے۔ یہ انگریزوں کا اس پر احسان نہیں تھا۔

ان اسفار میں جو کچھ دہلی بارے جان سکا، پیشِ خدمت ہے۔

یہاں میں ایک مشہور پنجابی گانے کا ایک شعر ضرور لکھنا چاہوں گا۔

ہو یا کی جے کڑیئے توں دلی شہر دی، میں وی جٹ لدھیانے دا۔ (پھر کیا ہوا جو تو دہلی کی ایک (خوب صورت) لڑکی ہے، میں بھی کم نہیں، میں لدھیانے کا جاٹ ہو (یعنی ایک بڑا آدمی ہوں)

یہ گیت عام طور پر ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر گایا جاتا ہے۔جب پہلی مرتبہ دہلی آیا تو یہ شعر ذہن میں تھا۔اس کے ساتھ ساتھ میر کے یہ اشعار بھی یاد تھے،

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

ایس ڈی تیواری کی ایک نظم؛

I love to spend my vacations
in the city of Delhi for tasty reasons.
Lot of beverages and variety of foods,
keep healthy, happy and good my mood.

غالب بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، وہ کہتے ہیں؛

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب! تو پھر
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد!
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھاویں گے کیا
دلی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت
بیچارہ چند روز کا یاں میہمان ہے
گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھا لیتا، اسدؔ
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے

خوشدیپ کور نے کیا خوب کہا ہے؛

Capital of my country,
City of companies,
City of Crowd,
Welcome to Delhi, City of Dreams.

مجھے سب سے زیادہ اس شعر کا آخری مصرعہ پسند آیا ہے، کیونکہ دہلی بلاشبہ خوابوں کا شہر ہے۔ اس شہر کا خواب یونانیوں نے دیکھا، وسطی یورپ کی اقوام نے دیکھا، وسطی ایشیا کے منگولوں نے دیکھا۔ ایرانیوں نے یہاں آنے کے لیے جنگیں لڑیں، عرب بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ افغان بھی آئے، بلوچوں نے بھی یہاں قدم رکھا۔ افریقی یہاں تک پہنچے، اور امریکیوں کے اثرات بھی دہلی میں پائے جاتے ہیں۔ چینی بھی اس شہر میں آئے اور گورکھے بھی یہاں آباد ہوئے۔ آخر کون تھا جس نے دہلی کی سرزمین پر قدم نہ رکھا ہو اور اپنے خواب کو عملی جامہ نہ پہنایا ہو؟

میرے بھی خواب تھے، اور انھی خوابوں میں اس شہر کو دیکھنے کی تمنا شامل تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جب یہ شہر پنجاب کی سانجھی دھرتی سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا، تو اس کے زخموں پر مرہم رکھوں اور اس کے آنسو پونچھ سکوں۔ میں دہلی اس لیے آیا تھا کہ دیکھ سکوں یہ شہر اب مجھ سے بچھڑنے کے بعد کیسا دکھائی دیتا ہے؟

میں نے دہلی کو چار بار دیکھا ہے۔ سب سے زیادہ تفصیل سے اپنے پہلے دورے میں دیکھا ہے۔ اس پہلے سفر کی روداد میں نے بھارت کے چار سفر (حصہ اول) میں بیان کی ہے۔ اس میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ دوبارہ یہاں لکھ رہا ہوں۔

بھارت کا پہلا سفر

خوف اور شوق کے ساتھ

دہلی: بذریعہ پی آئی اے

جب 1996ء میں، میں پہلی بار بھارت آیا تو اس وقت سمجھوتہ ایکسپریس نام سے ایک ریل گاڑی کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن میں نے بذریعہ ہوائی جہاز بھارت جانے کا فیصلہ کیا۔ بھارت جانے والے پی آئی اے کے جہاز پر سفر، ایک یادگار تجربہ تھا۔ جب میں اپنا بورڈنگ کارڈ لے چکا ، تو میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ سول کپڑوں میں موجود تھے، جو مسافر نہیں لگ رہے تھے۔ انھیں غور سے دیکھنے پر محسوس ہوا کہ یہ لوگ ہماری پاک فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس مسافر پر بھی ان کو شک ہوتا، وہ اسے بلاتے اور کئی سوالات کرتے تھے، تسلی ہونے کے بعد جانے کی اجازت دیتے۔ سامان اور جامہ تلاشی بھی بے حد سخت تھی۔ ہم بس پر بیٹھ کر جہاز کی طرف چل پڑے، سکیورٹی کے لوگ بھی بس میں ہمارے ساتھ تھے۔

میں نے اب تک جتنے بھی ہوائی سفر کیے ہیں، ان میں یہ پہلا اور آخری بار ایسا ہوا کہ مسافروں کی جہاز کے دروازے پر بھی تلاشی لی گئی ہو۔ عام طور پر ایک دفعہ ایئرپورٹ کے اندر جاتے وقت اور دوسری مرتبہ لاؤنج میں جاتے ہوئے تلاشی لی جاتی ہے۔ لیکن بھارت جاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر جہاز کے گیٹ پر بھی ہماری تلاشی ہوئی۔ جو نوجوان تلاشی لے رہا تھا میں نے ان سے ہنس کر کہا کہ سیکورٹی کے بہت سخت انتظامات ہیں، اس نے ہنس کر جواب میں صرف

اتنا کہا کہ یہ سب بھارت جانے والی فلائیٹ کی وجہ سے ہے۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔

میں جب جہاز کے اندر گیا تو میں نے دیکھا کہ جہاز میں سو کے قریب مسافر تھے، جن میں سکھ حضرات بھی کافی تعداد میں تھے۔ اس بات پر کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا کہ سکھ اتنی تعداد میں بھارت جا رہے ہیں لیکن حیرانی اس وقت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے پشتو میں بات کر رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ افغانستان سے آئے ہیں اور اب بھارت جا رہے ہیں۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ رنجیت سنگھ کے دور سے ایک بڑی تعداد میں سکھ، افغانستان میں آباد چلے آ رہے ہیں۔ افغانستان میں رہنے کی وجہ سے وہ پشتو بول رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سردار سے اردو میں بات چیت شروع کی، مگر ہم بہت جلد پنجابی میں بات کرنے لگے۔

اس نے مجھے بتایا کہ اس کے آباؤ اجداد کئی نسلوں سے کابل میں آباد ہیں۔ ہم لوگ پشتو، فارسی اور دری زبان آسانی سے بولتے ہیں، مگر پنجابی ہم کبھی بھول نہیں پائے اور نہ ہی بھول سکتے ہیں۔ اس نے مزید بتایا کہ ہمارے دھرم کے مطابق ہر سکھ پر لازم ہے کہ اسے پنجابی پڑھنی اور لکھنی آئے اور وہ اپنے گھر میں پنجابی ہی میں بات چیت کرے۔ میں نے اس کی وجہ جاننا چاہی تو اس نے یہ بتایا کیا ہماری مذہبی کتاب، گورو گرنتھ صاحب پنجابی زبان میں ہے۔ اگر ہم پنجابی بھول گئے تو اپنی مقدس کتاب کو بھول جائیں گے اور ہم ایسا نہیں چاہتے، اس لیے ہر سکھ جتنی بھی زبانیں جاننا چاہے اس پر پابندی نہیں ہے لیکن اس کے لیے پنجابی زبان کا پڑھنا اور لکھنا لازم ہے، ورنہ ہم اسے سکھ نہیں مانتے۔

لاہور سے دہلی کا سفر تقریباً چالیس منٹ کا تھا، جو بہت جلد ختم ہو گیا اور جہاز کے عملے نے اعلان کیا کہ ہم تھوڑی ہی دیر میں دہلی ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ جس سے ایک خوشی ہوئی کہ آج اپنے آباؤ اجداد کے دیس (میرے بڑے اپنے آبائی شہر سرہند کے لیے دیس کا لفظ ہی استعمال کرتے تھے) میں آنے کا موقع مل رہا ہے اور ایک خوف بھی طاری ہوا کہ پورے بھارت میں ایک دو لوگوں کے علاوہ کوئی میرا جاننے والا نہیں تھا۔

بھارت کی سرزمین پر پہلا قدم

میں نے جب بھارت کی زمین پر پہلی مرتبہ اپنا قدم رکھا تو اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔ دل میں جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں، میں نے ان سب کو دہرایا۔ مجھے ایک تو خوشی یہ تھی کہ میں بھارت آیا ہوں اور دوسرا خوف یہ تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ دشمنی نے لوگوں کا آنا جانا کافی حد تک غیر محفوظ بنا دیا ہے اور آپ کے ساتھ بھارت میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بات مجھے بہت سارے لوگوں نے بتائی تھی۔ اس لیے میرے دل میں ایک خوف تو موجود تھا لیکن یہ امید بھی تھی کہ اگر میں نے کوئی غیر قانونی کام نہ کیا تم مجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ انھی سوچوں میں گم میں امیگریشن آفیسر کے سامنے چلا گیا۔

امیگریشن آفیسر نے میرے پاسپورٹ کو بہت غور سے دیکھا۔ میری عمر اس وقت 38 سال کے قریب تھی۔ پاسپورٹ دیکھنے کے بعد اس نے مجھ سے کئی سوال کیے جن کا میں نے اسے تسلی بخش جواب دیا۔ کچھ وقت کے بعد اس آفیسر کی تسلی ہوئی اور اس نے مجھے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ یہاں پر بھی ایسے کئی لوگ موجود تھے جن کا تعلق فوجی اداروں سے لگتا تھا۔

میں ایئرپورٹ سے باہر نکلا، اب مسئلہ یہ تھا کہ جو صاحب مجھے لینے آئے ہیں، ان کو میں کیسے پہچانوں گا؟ عموماً ایسے موقعوں پر لوگ ایک بڑے کاغذ پر مہمان کا نام لکھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن جو صاحب مجھے لینے آئے تھے وہ ایک کمپنی میں سینئر مینیجر تھے، جو ایسا کرنے میں شاید اپنی ہتک سمجھتے ہوں گے، یہ میرا خیال ہے۔ انھوں نے اپنے ذہن میں میری ایک تصویر بنائی ہوئی تھی جو انھوں نے میرے پاسپورٹ پر دیکھی تھی اور کارڈ کا تکلف نہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب مجھے بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے بھی یہی لگا کہ شاید یہی صاحب مجھے لینے آئے ہیں۔ میں نے قریب جا کر ان سے کہا کیا آپ کا نام شرما ہے؟ انھوں نے جواباً کہا کیا آپ کا نام مشتاق جی ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ پھر اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا، خیریت دریافت کی اور چند ہی لمحوں میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ ان سے ملنے کے بعد

بہت حد تک میرا خوف دور ہو گیا۔

اس وقت دہلی ایئر پورٹ بہت زیادہ وسیع نہیں تھا، آپ یوں سمجھ لیں کہ جیسے لاہور کا پرانا ایئر پورٹ ہو۔ میں شرما صاحب کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ ان کی گاڑی پارکنگ میں ہوگی، لیکن انھوں نے بتایا کہ گاڑی پارکنگ میں نہیں بلکہ قریب ہی ایک جگہ کھڑی ہے۔ ہم اُس جگہ چلے گئے جہاں ان کی گاڑی کھڑی تھی، وہاں پر ایک گارڈ بھی کھڑا تھا اور نو پارکنگ کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ شرما صاحب نے یہاں گاڑی کیوں پارک کی ہے؟ لیکن جلد ہی میری حیرانی دور ہو گئی، جب شرما صاحب نے جیب سے چند روپے نکال کر گارڈ کو دیے اور گارڈ نے جواب میں شکریہ کہا۔ بعد میں شرما صاحب نے مجھے بتایا کہ پارکنگ خاصی دور ہے اس لیے ہم اکثر یہاں ہی گاڑی کھڑی کر لیتے ہیں اور گارڈ کو چند روپے دے دیتے ہیں جس سے ہمیں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہ سب دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ کہنے کو تو ہم دو الگ الگ ملک ہیں، ایک کا نام پاکستان اور دوسرے کا نام بھارت، لیکن ہمارے معاملات ایک جیسے ہی ہیں۔

ہوٹل اور ہوٹل میں خفیہ ایجنسی کے فرد کی آمد

ہم گاڑی میں بیٹھ کر نیو دہلی کی طرف چل پڑے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میرا ہوٹل کس طرف ہے؟ جس پر انھوں نے بتایا کہ نیو دہلی کے پاس قرول باغ (انگلش میں اسے KAROL BAGH لکھتے ہیں جبکہ اردو میں اسے قرول باغ لکھا جاتا ہے) کے علاقے میں آپ کے لیے ایک ہوٹل میں کمرہ بک کروایا گیا ہے۔ اتنی دیر میں ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ عام بول چال میں اس علاقے کو نیو دہلی ہی کہا جاتا، پرانے شہر کو دلی یا اندرون دلی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک عام سا صاف ستھرا ہوٹل تھا، لیکن اس کی خوبی یہ تھی کہ یہ نہایت ہی گنجان علاقے میں موجود تھا اور سڑک کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے اردگرد بہت سی چیزوں کو یہاں سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس ہوٹل کی ایک اور خوبی یہ بھی تھی اس کے سامنے ایک بڑا سا غیچہ تھا جس میں لگے بڑے بڑے درخت بہت ہی پیارے لگ رہے تھے۔ مجھے پہلی نظر میں ہوٹل ان درختوں کی وجہ سے ہی پسند آیا۔ شرما

صاحب نے مجھے ہوٹل اتارا اور کہا کہ میں کل صبح آپ کو ہوٹل سے لے لوں گا اور پرانی دلی میں واقع اپنے دفتر چلیں گے۔

میرے پاس شام کا وقت تھا جسے میں اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا تھا۔ میں عام طور پر احتیاط کے نقطۂ نظر سے مغرب کے بعد اکیلے ہوٹل سے نہیں نکلتا لیکن آج مجھے یہ لگ رہا تھا کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ مجھے لاہور اور قرول باغ میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے ہوٹل انتظامیہ کو اپنا پاسپورٹ دیا اور انھوں نے میرا اندراج کیا۔ ہوٹل مینیجر نے مجھے بتایا کیوں کہ آپ پاکستان سے ہیں اس لیے ہمیں فوری طور پر مقامی تھانے کو آپ کے آنے کی اطلاع دینا ہوگی۔ اس کے بعد پولیس کے لوگ کسی بھی وقت آ کر آپ سے مل سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ نے کہیں بھی جانا ہو تو ہمیں بتا کر جائیں تا کہ ہم پولیس کو بتا سکیں۔ اس کے ساتھ ہی مینجر نے یہ بھی کہا آپ کے لیے بہتر ہے کہ رات دیر تک ہوٹل سے باہر نہ رہیں۔ آپ سے کون ملنے آتا ہے، انھیں اس کا بھی ریکارڈ رکھنا ہوگا۔ یہ سب سن کر میری خوشی غارت ہوگئی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں یہاں پر ہر وقت پولیس کی نظروں میں رہوں گا، اس لیے مجھے ہر کام احتیاط سے کرنا ہوگا تا کہ کسی کو شکایت کا کوئی موقع نہ مل سکے۔

میرا یہ دورہ خالصتاً کاروباری تھا اس لیے میں ایک لحاظ سے بہت مطمئن بھی تھا لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں مزید سنبھل کر رہوں۔ عام طور پر پاکستان سے جانے والے لوگوں کو آمد کے فوری بعد مقامی تھانے میں اطلاع کرنا ہوتی ہے لیکن کچھ لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہوتی۔ اسے نان رپورٹنگ ویزا کہتے ہیں، میرا ویزا نان رپورٹنگ تھا اسی لیے مجھے تھانے جا کر اطلاع دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ پولیس کسی بھی وقت مجھے ہوٹل میں چیک کر سکتی تھی۔ اس وجہ سے میں نے شام کے وقت باہر جانے سے بھی گریز کیا۔ زیادہ وقت میں نے اپنے کمرے میں ہی گزارا۔

اگلی ہی صبح تقریباً چھ بجے مجھے ہوٹل کے استقبالیے سے فون پر کہا گیا کہ آپ استقبالیہ پر آئیں۔ مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی لیکن میرے پاس ان کے پاس جانے کے علاوہ کوئی چارہ

نہیں تھا۔ میں جب استقبالیہ کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک صاحب جن کی عمر پچاس سال ہوگی، شکل وصورت سے دیہاتی آدمی لگ رہے تھے، استقبالیے پر تشریف فرما تھے۔ مجھے ہوٹل کے مینجر نے کہا کہ یہ صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ان کا تعلق ایک خفیہ ادارے سے ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ مجھے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ میں آپ کا پاسپورٹ چیک کرنا چاہتا ہوں اور یہ دیکھنا چاہتا ہوں کیا آپ اسی ہوٹل میں رہ رہے ہیں؟ میرا تعلق ایک خفیہ ادارے سے ہے۔ میں نے ان سے اجازت لی اور اپنے کمرے سے پاسپورٹ لینے چلا گیا۔ میں نے انھیں اپنا پاسپورٹ دکھایا اور اس کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی وہ مجھے اب تک مکمل طور پر یاد ہے جو میرے لیے ایک تفریح کا باعث بھی ہے۔

ان صاحب نے جب میرا پاسپورٹ دیکھا تو پاسپورٹ پر ویزا جاری کرنے کی تاریخ تقریباً تین ہفتے پرانی تھی۔ ویزا پر یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ ویزا بھارت میں داخل ہونے کے بعد صرف پندرہ دن کے لیے کارآمد ہوگا۔ وہ صاحب کہہ رہے تھے کہ جس دن آپ کو ویزا جاری ہوا ہے، تب سے اب تک بیس دن ہوگئے ہیں، اس طرح سے آپ کا ویزا ختم ہوگیا ہے اور آپ یہاں غیر قانونی طور پر مقیم ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ جناب عالی، اس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ جس دن میں بھارت میں داخل ہوں گا اس دن کے بعد صرف پندرہ دن کے لیے مجھے بھارت میں رہنے کی اجازت ہوگی، میں کل آیا ہوں اس لیے ابھی میرے پاس چودہ دن کا ویزا باقی ہے۔

ان صاحب کا اصرار تھا کہ ویزا جاری ہونے کے بعد آپ صرف پندرہ دن کے لیے رہ سکتے۔ مجھے تھوڑی دیر میں یہ محسوس ہونے لگا کہ اگر ان صاحب کو میری بات سمجھ نہ آئی تو میرے لیے خاصی مشکل پیدا ہوجائے گی۔ اس لیے میں نے اپنے تمام تر جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اور ان کو بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایسی صورت حال میں ہوٹل مینجر سے درخواست کی کہ وہ اس مسئلے میں میری مدد فرمائیں۔ ہوٹل والے بھی ان لوگوں سے خوف کھاتے ہیں اور ان سے بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں لیکن میرے کہنے پر مینجر صاحب نے بات کی اور ان صاحب کو سمجھانے

کی کوشش کی۔ وہ کسی حد تک مطمئن ہوئے لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مکمل طور پر تو مطمئن نہیں ہوئے لیکن وہ معاملے کو ختم کر رہے ہیں اور انھوں نے مجھے کہا کہ میں آپ کو دوبارہ چیک کرنے کے لیے آؤں گا۔ میں نے کہا آپ جب بھی تشریف لائیں گے میں آپ کو خوش آمدید کہوں گا۔

اس طرح وہ صاحب چلے گئے اور پھر جتنے دن میں ٹھہرا، وہ روزانہ صبح چھ بجے تشریف لاتے۔ ان کے لیے بھی ایسا کرنا مشکل تھا اور میں بھی صبح ملاقات کے لیے تیار بیٹھا ہوتا تھا، جو میرے لیے بھی آسان نہ تھا۔ اس طرح ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں بعد میں ہم گپ شپ بھی لگاتے تھے اور بہت سی باتیں بھی کرتے۔ میں باتیں تو ان کے ساتھ کرتا تھا لیکن دل سے خوف کبھی بھی دور نہیں ہوا تھا۔ یہ بات مجھے اب تک یاد ہے، جو اکثر میری تفریح کا باعث بنتی ہے۔

دہلی: تہذیبوں کا سنگم اور بادشاہوں کا خواب

دہلی یا دلی

دہلی ان شہروں میں سے ہے جس کے دو نام ہیں، دہلی اور دلی۔ انگلش میں لکھتے وقت اسے دہلی لکھا جاتا رہا ہے جبکہ پنجابی ہندی اردو میں اسے دلی لکھا جاتا رہا ہے۔ اب بھی عام بول چال میں لوگ اسے دلی ہی کہتے ہیں۔ اردو شاعری میں یہ بات بہت واضح ہے کہ اس شہر کو دلی ہی کہا جاتا رہا ہے۔ اسے اکبر نامہ میں بھی ''دہلی'' ہی لکھا گیا ہے۔ تیرھویں صدی کے نصیرالدین چراغ دہلوی کا نام بھی یہی بات ظاہر کرتا ہے کہ اس دور میں اس شہر کا نام ''دہلی'' تھا۔ البتہ کئی اردو کے شعراء نے اسے ''دلی'' ہی لکھا ہے۔ جیسے میر تقی میر کہتے ہیں:

کیا بود و باش پوچھو ہو، پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اسی طرح شیخ ابراہیم ذوقؔ کا ایک شعر بھی ملتا ہے:

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

جب میں پہلی مرتبہ دہلی گیا تو میں نے دیکھا کہ عام طور پر قدیم شہر، جہاں لال قلعہ واقع ہے، کو ''دلی'' کہا جاتا ہے، باقی ہر جگہ اسے ''دہلی'' ہی کہا جاتا ہے۔ البتہ وہ علاقے جو انگریزوں نے بسائے، جہاں صدارتی عمارتیں موجود ہیں، انھیں ''نئی دہلی'' کہا جاتا ہے۔ عام طور پر لفظ ''دہلی'' ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ لاہور کے ساتھ ہے۔ ہم قدیم لاہور (جو ایک فصیل میں واقع ہے) کو اندرون لاہور کہتے ہیں، باقی سب جگہوں کے لیے لاہور کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔

اب بھارت کی حکومت نے اسے باقاعدہ دہلی کے نام سے لکھنا شروع کیا ہے۔ دنیا کے نقشے پر اس شہر کو دہلی کے نام سے ہی لکھا جاتا ہے۔ اس لیے میں بھی اسے دہلی ہی لکھوں گا۔ البتہ آزادیِ ہند سے پہلے اور تاریخی واقعات لکھتے ہوئے دلی لکھنا مناسب ہوگا۔ اب بھارت میں شائع ہونے والے اردو اخبارات اور رسائل میں اسے دہلی ہی لکھا جاتا ہے۔

اس شہر کا نام دلی کیوں پڑا؟ اس کے متعلق ہمیں تاریخ سے مختلف حوالے ملتے ہیں۔ ایک بات تو یہ پتہ چلتی ہے کہ دلوں یا ڈھلوں نام کا ایک بادشاہ تھا، جس نے 50 قبل مسیح میں اس شہر کو آباد کیا اور اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔ یاد رہے کہ جاٹ قوم کی ایک گوت، ڈھلوں مشرقی اور مغربی پنجاب میں اب بھی رہتی ہے۔ دوسری وجہ کچھ لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ دہلی اور پشاور کے درمیان موجود علاقے کو پنجاب کہتے تھے اور پنجاب کے بعد جمنا کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ دلی کو جمنا کے علاقے کا دروازہ کہتے تھے۔ دروازے کا ایک دوسرا نام دہلیز بھی تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس کی وجہ سے اس کا نام دلی پڑ گیا۔ کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ہے۔ بہر حال اب یہ دہلی ہے اور بھارت کا دارالحکومت ہے۔ کچھ لوگ اس شہر کے نئے بسائے جانے والے حصے کو نیو دہلی اور قدیم شہر کو اندرون دلی کہتے ہیں۔ اس بارے میں بخشی آر ایس کی کتاب *Delhi Through Ages* ایک مفید کتاب ہے۔

ایک اندازے کے مطابق دہلی شہر کی تاریخ تقریباً ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ ڈھائی ہزار سال کی تاریخ عجیب وغریب اور نہایت دلچسپ ہے۔ یہ سفرنامہ اس طویل تاریخ کو بیان کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے میں چند چیدہ چیدہ باتیں ہی آپ کے سامنے رکھوں گا۔ یہاں مہاراجہ اشوکا کے دور کی باقیات بھی ملتی ہیں جو 300 سال قبل مسیح میں ہو گزرا ہے۔ اس کے بعد اس پر کئی اور حکمرانوں نے بھی حکومت کی۔ محمود غزنوی نے 1001ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا اور پشاور میں ہندو راجہ کو شکست دی اور اس کے بعد اس نے دہلی کے آس پاس کے کئی علاقے فتح کیے۔ اس طرح سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گیارھویں صدی کے آغاز میں پہلی مرتبہ مسلمان دہلی آئے۔ اس بارے ایک تفصیل مضمون انسائکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں موجود ہے۔

بارھویں صدی میں پرتھوی راج چوہان نے اس شہر کو فتح کیا۔ بارھویں صدی کے آخر تک اس علاقے پر ہندوؤں کی حکومت تھی۔ محمد غوری نے پرتھوی راج چوہان کو شکست دی اور تیرھویں صدی کے آغاز میں دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی جو انگریزوں کے آنے تک کسی نہ کسی حال میں موجود رہی۔

مسلمان ایک طویل عرصے تک اس علاقے پر حکمران رہے جن میں غزنوی، ایبک، مغل، امیر تیمور، احمد شاہ درانی اور نادر شاہ نمایاں نام ہیں۔ یاد رہے کہ مسلمان کبھی بھی ہندوستان میں اکثریت میں نہیں رہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے مشرقی علاقوں یعنی موجودہ بنگلہ دیش اور مغربی علاقوں (موجودہ پاکستان) میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن مرکزی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد دیگر قوموں کے مقابلے میں واضح طور پر کم تھی۔ بھارت میں 2011ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں مسلمان آبادی کا پندرہ فیصد اور ہندوؤں کی تعداد اسی فیصد تھی جب کہ 1951ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق مسلمان آبادی کا دس فیصد اور ہندو آبادی کا 84 فیصد تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کی شرح میں اضافہ ہندوؤں سے زیادہ ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ 2021ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی شرح میں اضافے کی امید کی جاتی ہے۔ اسدالدین اویسی کے مطابق اس وقت بھارت میں مسلمانوں کی

تعداد پچیس کروڑ ہے جو کل آبادی یعنی ایک سو چالیس کروڑ کا اٹھارہ فیصد بنتے ہیں۔

دہلی اور انگریز

مغل حکومت کے آخری دور میں حکومتی معاملات میں انگریزوں کا عمل دخل خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ 1803ء میں مراٹھوں کے ساتھ انگریزوں کی دوسری جنگ ہوئی جس میں انگریزوں نے مراٹھوں کو شکست دی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے آہستہ آہستہ مغل حکمرانوں پر بھی مکمل کنٹرول حاصل کرلیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے دہلی کا محاصرہ کیا اور بہادر شاہ ظفر کو ملک بدر کرکے دہلی پر باقاعدہ قبضہ کرکے اسے پنجاب کا ایک ضلع بنا دیا۔

یاد رہے 1849ء میں انگریزوں نے سکھوں کے ساتھ چیلیانوالہ میں اپنی آخری لڑائی لڑی تھی جس میں انھوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر اپنا قبضہ مکمل کرلیا۔س وقت تک انگریز ہندوستان کے بیشتر حصے پر قبضہ کر چکے تھے۔ میرے خیال میں چیلیانوالہ کی لڑائی کے بعد انگریزوں کو کسی جگہ بھی کسی بڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ 1911ء تک انگریز سرکار کا مرکزی دفتر کلکتہ میں ہوتا تھا، بعد میں انگریزوں نے دلی کو اپنا دارالحکومت بنایا اور نئی دہلی کے نام سے ایک علاقہ آباد کیا۔فروری 1931ء میں اس کا افتتاح کیا گیا اور اسے یونین آف انڈیا کا کیپٹل بنا دیا گیا۔آزادیِ ہند کے بعد بھارتی حکومت نے بھی نیو دہلی کو ہی اپنا کیپٹل بنایا۔اب اس علاقے میں ایک نیو دہلی ہے اور ایک پرانی دلی ہے ان دونوں کے درمیان چند کلومیٹر ہی کا فاصلہ ہے لیکن ان کی معاشی اور معاشرتی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

دہلی کے اندر بے شمار تاریخی عمارات ہیں جن کے متعلق اگلے صفحات میں ذکر ہوگا۔اس شہر کی تاریخ بہت دلچسپ ہے، اگر آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہے تو آپ دلی اور دہلی کی تاریخ ضرور پڑھیں۔

ایک دن جب شرما صاحب مجھے ہوٹل چھوڑنے جا رہے تھے تو ہم نئی دہلی کے پاس سے گزرے اس وقت ہمارے ایک جانب بھارتی حکومت کے مرکزی دفاتر اور اسمبلی کی عمارت تھی۔

میں نے شرما صاحب سے پوچھا کہ جب آپ اندرون دلی کی تنگ گلیوں سے نکل کر اس وسیع و عریض علاقے میں آتے ہیں اور اتنی خوب صورت عمارات کو دیکھتے ہیں، جہاں بہت بڑے بڑے لان اور انتہائی صاف ستھرا علاقہ موجود ہے تو آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارے حکمران تو بدلے ہیں مگر انداز حکمرانی نہیں بدلا۔

آج بھی اس شہر کے مختلف علاقوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک طرف وہ رہتے ہیں جنھیں انسان کہلانے کا بھی حق نہیں ہے اور دوسری طرف وہ انسان رہتے ہیں جنھیں دنیا کی تمام تر آسائشیں میسر ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پرانی دلی میں ابھی بھی سائیکل رکشہ چلتا ہے۔ کیا ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اس سائیکل رکشہ کو ایک چھوٹا سا انجن لگوا دیں تا کہ اس آدمی کی مشقت میں کمی آ سکے۔

لیکن ایسا نہیں ہو رہا اور یہ کب ہوگا معلوم نہیں!

میں ایک دن جب شرما صاحب کے ساتھ کہیں جا رہا تھا تو میں نے ایک بڑی گراؤنڈ میں ایک فیملی کو بیٹھے دیکھا جو میاں بیوی اور دو تین بچوں پر مشتمل تھی۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ عام سے لوگ لگ رہے تھے، ان کے قریب ہی ان کی ایک پرانی موٹر بائیک بھی کھڑی تھی۔ میں نے انھیں دیکھ کر شرما صاحب سے کہا کہ آپ ہی بتائیے کہ جب یہ لوگ شام کو اپنی گلی میں جائیں گے جہاں صفائی ستھرائی نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی اور جہاں گلیوں میں گٹر کا پانی چل رہا ہوگا تو ان کے دل میں کیا خیال آئے گا؟ یقیناً اس سے ایک نفرت جنم لے گی۔

بدقسمتی سے حکمران بدلنے کا اختیار تو جمہوریت نے عوام کو دے دیا ہے مگر انداز حکمرانی بدلنے کا اختیار اب بھی عوام کے پاس نہیں ہے!

یہ منظر میں روز دیکھتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں لاہور میں ہوں جہاں پنجاب کے گورنر کے رہنے کے لیے ساٹھ ایکڑ سے زائد جگہ ہے اور اسی لاہور میں ایسی بستیاں بھی موجود ہیں، جہاں ایک ایکڑ میں پانچ سو سے زائد لوگ رہتے ہیں۔ میرے خیال میں بھارت اور پاکستان میں ایک مشترکہ بات یہ ہے کہ حکمران تو بدلتے رہتے ہیں اور وہ اپنی باری پر آتے اور جاتے ہیں۔ مگر یہ

طے ہے کہ کوئی بھی انداز حکمرانی بدلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

جب تک انداز حکمرانی نہ بدلے گا تب تک عوام کے حالات بدلنے کا کوئی امکان نہیں ہے!

پرانی دلی: میرا ایک رومانس

مجھے پرانے شہروں سے ایک فطری انس ہے۔ اسی لیے مجھے پرانی گلیوں اور محلوں میں گھوم پھر کر بے حد خوشی ہوتی ہے اور میں تصور میں خود کو صدیوں پیچھے لے جاتا ہوں۔ جب کبھی میں نے دہلی کے متعلق سوچا تو اسے دیکھنے کی خواہش حد سے زیادہ بڑھ گئی کیونکہ دہلی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ آج دہلی میں میرا دوسرا دن تھا۔ میں جس کمپنی کی دعوت پر بھارت آیا تھا اس کمپنی کے مالک کا نام درشن چودھری تھا۔ ان کا دفتر پرانی دلی میں تھا۔ آج ہمارا پروگرام ان کے دفتر جانے کا تھا۔ شرما صاحب مجھے لے کر ان کے پاس چلے گئے۔ تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں کیمیکلز کی ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی۔

جب آپ ایک دفعہ اندرون دلی چلے جائیں اور تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو یہ محسوس بھی نہیں ہوگا کہ آپ لاہور میں نہیں ہیں۔ آپ صرف یہ فرق محسوس کریں گے کہ اندرون دلی کے اکثر لوگ آپ کو اردو بولتے نظر آئیں گے، جبکہ اندرون لاہور میں آپ کو زیادہ تر لوگ پنجابی میں بات کرتے ہوئے نظر آئیں گے، آپ کو کوئی اور فرق محسوس بھی نہیں ہوگا۔ فرق ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ دونوں شہر صدیوں تک ایک جیسے حکمرانوں کے تحت ہی رہے ہیں۔ اس لیے دونوں شہروں کے طرزِ تعمیر اور بود و باش میں بے حد مماثلت ہے۔

کیمیکلز کی مارکیٹ بالکل لاہور کی اکبری منڈی کی طرح ہے، جہاں بے شمار دفاتر ہیں اور لوگ کیمیکلز کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ میں درشن چودھری کے دفتر چلا گیا وہ ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ لیکن اس میں کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ ان سے ہونے والی بات چیت انتہائی دلچسپ ہے۔ وہاں درشن چودھری کے برادرِ نسبتی، کنہیا لال بھی موجود تھے۔ ان سے ہونے والی گفتگو کی چند اہم باتیں میں آپ کے سامنے ضرور رکھنا چاہوں گا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب 1984ء میں اندرا گاندھی کو قتل کیا گیا تو اس کے بعد دہلی میں کئی ہزار بے گناہ سکھوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی اندوہناک واقعہ ہے جسے بھلانا خاص طور پر سکھوں کے لیے تو ممکن نہیں ہے۔ اُدھر پنجاب میں رہنے والے ہندو بھی اچھی خاصی مشکل کا شکار ہو گئے۔ کنہیا لال نے بتایا کہ ان کا خاندان پنجابی ہے اور چندی گڑھ کے پاس ان کی رہائش تھی۔ جب سکھوں کو دہلی میں قتل کیا گیا تو انھیں بھی پنجاب میں سکھوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا اور بہت سارے ہندوؤں کو سکھوں نے قتل کر دیا۔ ایسی صورت حال میں جو ہندو اس قابل تھے کہ وہ نقل مکانی کر سکیں تو انھوں نے پنجاب چھوڑ دیا۔ ہمارا کاروبار پہلے سے ہی دہلی میں تھا اور ہمارے کچھ رشتہ دار بھی یہاں دہلی میں رہتے تھے۔ اسی لیے ہم پنجاب چھوڑ کر دہلی میں آ گئے مگر ہمارا دل ابھی بھی پنجاب میں ہی ہے جہاں ہم صدیوں سے رہ رہے تھے۔ ہم اب بھی اپنے گھروں میں پنجابی زبان ہی بولتے ہیں۔

انھوں نے مجھے بے شمار واقعات سنائے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب بھی میں ہجرت کا کوئی واقعہ سنتا ہوں تو مجھے اپنے بزرگوں کی ہجرت کا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کئی بے گناہ مارے جاتے ہیں۔ اسی طرح بے گناہ لوگ پنجاب میں بھی مارے گئے۔

نہ سکھوں کا کوئی لیڈر مرا، نہ ہی کوئی ہندوؤں کا لیڈر۔۔۔ مرے تو بیچارے عام بے گناہ لوگ۔۔۔

کنہیا لال ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے جو بات 1996ء میں کہی اب 2020ء میں سچ ثابت ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں مسلمانوں، (جن کو وہ محمڈن کہتے تھے) کی آبادی میں بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ ان میں اکثریت غریب لوگوں کی ہے جو زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں۔ جب کہ ہندو لوگوں کی اکثریت امیر ہے اور وہ کم بچے پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ آنے والے وقتوں میں محمڈن کی تعداد بڑھ جائے گی اور ہندو آہستہ آہستہ اقلیت میں چلے جائیں گے۔ اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ محمڈن معاشی ترقی کریں تا کہ وہ کم بچے پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں۔ آج بھارت کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہندو جس خوف کا اظہار کر رہے ہیں یہ کوئی

نئی بات نہیں ہے۔ میں نے یہ بات ایک پڑھے لکھے ہندو سے پچیس سال پہلے سنی تھی۔

پرانی دلی دراصل وہ علاقہ ہے جسے شاہ جہاں نے 1639ء میں آباد کیا اور آگرہ سے اپنا تخت اس علاقے میں منتقل کیا۔ یہ بالکل اندرون لاہور ہی کی طرح کا ایک علاقہ ہے۔ اس علاقے کے ساتھ ایک مسجد اور قلعہ بھی ہے، بالکل اسی طرح لاہور میں بھی اندرون لاہور کے ساتھ ایک مسجد اور قلعہ ہے۔ یاد رہے کہ مغلوں نے مختلف ادوار میں، دلی، لاہور اور آگرہ، تینوں شہروں کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ شاہ جہاں نے دلی شہر کے چاروں طرف ایک بلند دیوار بنائی تھی جس میں کئی دروازے تھے۔ میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ مغلوں نے جہاں بھی شہر تعمیر کیے وہ اکثر دریاؤں کے کناروں پر ہیں، مثلاً لاہور راوی کے کنارے پر، آگرہ اور دہلی جمنا کے کنارے، وغیرہ وغیرہ۔ یاد رہے مغلوں سے پہلے سلاطین دہلی، تغلق اور سوری بھی اس علاقے میں رہے ہیں لیکن انھوں نے باقاعدہ شہر کو آباد نہیں کیا۔ دلی شہر کو آباد کرنے کا سہرا شاہجہاں کے سر ہی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دلی کو آباد کرنے میں سب نے اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے مگر شاہجہاں نے اسے باقاعدہ ترقی دی۔

دہلی میں موجود مشہور عمارتوں کا ذکر میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔ فی الحال اتنا ہی بتانا مقصود ہے کہ مغلوں نے آخری وقت تک دہلی کو ہی اپنا دارالحکومت بنایا اور بعد ازاں جب انگریزوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو انھوں نے بھی 1911ء میں پرانی دلی کے ساتھ نیا شہر آباد کر کے اپنے تمام دفاتر اس نئے علاقے میں منتقل کر لیے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو دہلی کے متعلق بتاؤں میں چاہوں گا کہ کچھ باتیں قرول باغ سے متعلق بھی آپ کے سامنے پیش کی جائیں۔

قرول باغ

جہاں کبھی مسلمان اکثریت میں رہتے تھے: قرول باغ نئی دہلی سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزوں نے دلی کو پایہ تخت بنانے کا فیصلہ کیا تو اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس علاقے کے اندر ایک بڑی مارکیٹ کو (جس کا نام کناٹ پیلس ہے) بھی

بنانے کا منصوبہ بنایا۔اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔کناٹ پیلس کے علاقے میں موجود آبادیوں کو ختم کر کے لوگوں کو قرول باغ کے علاقے میں بسایا گیا۔اس طرح یہ علاقہ باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ بنایا گیا تھا۔اس بات کی تصدیق یہاں کی ترتیب سے بنی ہوئی گلیاں اور بازاروں سے بھی ہوتی ہے۔آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرح سے یہ ایک نئی آبادی ہے۔یاد رہے کہ لاہور میں بھی قرول گھاٹی اور قرول بازار شالامار اور شاہدرہ کے علاقے میں موجود ہے۔قرول کا معنی کیا ہے، کیوں یہ دہلی اور لاہور میں ایک ساتھ پایا جاتا ہے، باوجود کوشش کے معلوم نہ کر سکا، یقیناً یہ نام کوئی تاریخی حیثیت ہی رکھتا ہوگا۔

اس علاقے کی اہمیت کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ یہاں پر ایک طبیہ کالج ،خالصہ کالج اور دہلی یونیورسٹی موجود ہیں۔طبیہ کالج کا افتتاح مہاتما گاندھی نے 1921ء میں کیا تھا۔اس کالج کا آغاز حکیم عبدالمجید نے کیا جسے بعد میں حکیم اجمل خاں نے طب کی بلندیوں تک پہنچایا۔اس کی تعمیر کا آغاز انگریز وائسرائے نے کیا جبکہ افتتاح مہاتما گاندھی نے کیا تھا۔ پہلے پہل اس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن آزادیِ ہند کے بعد مسلمانوں کی اکثریت پاکستان چلی گئی اور پاکستان سے آنے والے ہندو اور سکھ اس علاقے میں آباد ہوئے اور اب اس علاقے میں مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں۔اس کی تفصیل سدھرتھا رائے نے ہندوستان ٹائمز میں A tale of two cities کے نام سے لکھی ہے۔اس علاقے میں مدراس اور بنگال سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ایک کثیر تعداد میں بستے ہیں۔

قرول باغ میں ایک بہت مشہور مارکیٹ ہے جس کا نام غفار مارکیٹ ہے۔ یہ نام خان عبدالغفار خان کے نام پر رکھا گیا جو پاکستان کے ایک مشہور سیاسی رہنما تھے۔ان کی آزادی ہند میں قربانی کی کوئی مثال پیش کرنا ممکن نہیں۔اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھارت کے لوگ خان عبدالغفار خان کی کس قدر عزت کرتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ خان تقسیمِ ہند کے خلاف تھے اور ان کی ہندوؤں سے بڑی اچھی دوستی بھی تھی۔ یہ بات بھی آپ کو یاد ہو کہ ان کے جنازے پر راجیو گاندھی بھی پاکستان آیا تھا۔اندرا گاندھی کے قتل کے بعد دہلی میں سکھوں کو بے دریغ قتل کیا

گیا۔ اس وقت سب سے زیادہ نقصان قرول باغ میں بسنے والے سکھوں کا ہی ہوا تھا۔ اس کی تفصیل وینا داس نے *Life and Words: Violence and the Descent into the Ordinary* کے نام سے ایک کتاب میں لکھی ہے۔

میں نے ایک اور بات محسوس کی کہ قرول باغ میں رہنے والے اکثر لوگ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ہیں۔ اسی لیے ان کی بود و باش مغربی پنجاب والوں جیسی ہی ہے۔ بہت سے لوگ سیالکوٹی اور جہلم کے لہجے میں پنجابی بولتے تھے۔ میں نے کچھ لوگوں سے راہ و رسم بڑھائی اور باتیں شروع کر دیں۔ ان میں سے اکثر نے اپنی نقل مکانی کے واقعات بتائے کہ وہ کس طرح فسادات میں اپنی جان بچا کر بھارت پہنچے تھے۔ اکثر لوگوں نے آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ان مظالم کا احوال سنایا جو ان پر مغربی پنجاب کے مسلمانوں نے ڈھائے تھے۔

مجھے اب تک اُس آدمی کی باتیں یاد ہے جس نے مجھے بتایا کہ ہمارے آباؤاجداد کو سیالکوٹ میں لوگوں نے گھیر لیا اور ان کو زبردستی مسلمان بننے کے لیے کہا اور گائے کا گوشت کھانے کے لیے مجبور کیا اس دوران پولیس آ گئی اور یوں ان کی جان اور دھرم بچ گیا۔

اس موقع پر مجھے یاد آیا کہ ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں میں رہنے والے میری والدہ کے خاندان کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ پورا خاندان ایک سال سے زائد عرصے تک ایک سکھ سردار کی پناہ میں سکھ بن کر رہا اور پھر ایک دن سکھ سردار نے اپنی بیل گاڑی میں میری والدہ کے خاندان کے تمام افردا کو بٹھایا اور چالیس کلومیٹر دور انبالہ مہاجر کیمپ میں پہنچایا۔ اس قافلے کی حفاظت کے لیے سکھ سردار نے گاؤں کے نوجوانوں پر مشتمل ایک جتھہ بھی ساتھ بھیجا۔ میری والدہ کے خاندان کا دھرم اور جان تو بچ گئی تھی لیکن وہ ایک نوجوان خاتون جسے سکھوں نے اغوا کر لیا تھا اور ایک دوسرے گاؤں میں رہتی تھی اس کو اپنے ساتھ نہ لا سکے۔ اس واقعے کی تفصیل حصہ دوم میں دی گئی ہے۔ جس کا دکھ نہ ختم ہونے والا ہے، اب ستر سال بعد بھی اس خاتون کی یاد میں آنسو بہائے جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ ناحق قیمت جو آزادیِ ہند کی وجہ سے عام لوگوں کو دینی پڑی، آزادیِ ہند کا فیصلہ تو

لا گو ہونا ہی تھا، لیکن نقل مکانی کا ذکر کہیں نہیں تھا!

نقل مکانی کے دوران میں کتنے لوگ قتل ہوئے اور کتنا مالی نقصان ہوا، اس کا اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آزادیِ ہند کے نتیجے میں پندرہ سے بیس لاکھ لوگ قتل ہوئے اور ڈیڑھ سے دو کروڑ لوگوں نے نقل مکانی کی۔ مالی نقصان کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان بیس لاکھ لوگوں میں نہ کوئی مسلمان لیڈر، نہ کوئی ہندو لیڈر اور نہ ہی کوئی سکھ لیڈر شامل تھا۔ اس قتل و غارت میں عام لوگوں کا ہی جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس بارے میں مختلف اعداد و شمار سامنے آتے ہیں۔ بی بی سی کی رپورٹ جو Steven Brocklehurst نے لکھی ہے اس کے مطابق پندرہ لاکھ قتل ہوئے اور ڈیڑھ کروڑ لوگوں نے نقل مکانی کی۔

مشرقی پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں نے قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع کیا تو ردِ عمل کے طور پر مغربی پنجاب میں رہنے والے مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کا بدلہ مقامی سکھوں اور ہندوؤں کو قتل کر کے لیا۔ کچھ کا یہ کہنا ہے کہ قتل و غارت کا آغاز راولپنڈی کے قریب ایک گاؤں میں سکھوں کے قتل سے ہوا، جس کے نتیجے میں مشرقی پنجاب میں اس کا بدلہ بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر کے لیا گیا۔ کس نے اس قتل و غارت گری کا آغاز کیا؟ اس بارے میں متضاد دعوے موجود ہیں۔ نقصان دونوں طرف ہوا کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ اس کا درد صرف وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کے خاندان اُس مشکل وقت سے گزرے ہیں۔

قرول باغ میں پختون آبادی

قرول باغ میں، میں ایک دن رکشے میں بیٹھا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ رکشے کا ڈرائیور اپنی شکل وصورت اور لب و لہجے کی وجہ سے پختون لگ رہا ہے۔ میں نے اپنے شک کو رفع کرنے کے لیے ان سے پوچھا کیا آپ پٹھان ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں میں پٹھان ہوں اور میرا تعلق افغانستان سے ہے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ ایک افغان بھارت میں کیوں اور کب آیا؟ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کب سے یہاں رہ رہے ہیں؟

جواب میں اُس نے مجھے بتایا کہ جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو بہت سے لوگ مہاجر

بن کر پاکستان چلے گئے۔اس دوران بھارت کی حکومت نے ایک ہزار کے قریب افغانی لوگوں کو بھارت میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں پچھلے پندرہ سال سے بھارت میں رہ رہا ہوں۔ افغانستان سے آنے والے سب لوگوں کو قرول باغ میں رہنے کی جگہ دی گئی ہے۔ ہمارے پاس بھارتی شہریت تو نہیں ہے لیکن یہاں پر رہنے اور کام کرنے کی اجازت ہے۔ اس طرح سے افغانیوں کی ایک بڑی تعداد قرول باغ میں رہ رہی ہے۔ میرے لیے یہ باعث حیرت تھا لیکن مزید غور کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ جہاں غفار مارکیٹ ہوگی، وہاں پر افغان لوگوں کا ہونا کوئی حیرانی کی بات نہیں ہونی چاہیے۔اس سے پہلے کہ میں آپ کو دہلی میں اپنے گزرے وقت کی باتیں بتاؤں، میں چاہوں گا کہ آپ کو دہلی کے بارے میں کچھ آگاہ کروں۔

شرما صاحب کے پاس میں دوپہر تک رہا بعد میں میں نے ان سے کہا کہ میں اندرون دلی کی کچھ جگہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ شام چھ بجے سے پہلے پہلے واپس آجائیں تاکہ ہم آپ کو ہوٹل چھوڑ دیں۔ اس دوران میں نے جو کچھ دیکھا اس کا احوال پیش خدمت ہے۔

جامع مسجد دہلی

جب میں نے پہلی مرتبہ جامع مسجد کو دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں لاہور کی بادشاہی مسجد کو دیکھ رہا ہوں۔ دونوں مساجد میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ مماثلت اس وجہ سے بھی ہے کہ دونوں ہی کے بنانے والے مغل بادشاہ تھے، یعنی شاہجہاں اور عالمگیر۔ ظہر کی نماز کے وقت مسجد کے شمال مشرقی کونے میں بے شمار کبوتر موجود تھے۔ لوگ انھیں دانا ڈال رہے تھے۔ ایک اور بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں کراچی کی کسی بڑی مسجد میں ہوں جہاں اکثریت کا لباس سفید قمیص اور پاجامہ تھا اور زبان بھی ان جیسی ہی تھی۔

یہ مسجد جس کا اصل نام مسجد جہاں نما ہے لیکن اب اسے جامع مسجد دہلی کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کو شاہ جہاں نے 1656ء میں تعمیر کروایا تھا۔ اس مسجد کو بنانے کے لیے پانچ ہزار لوگوں نے پانچ سال تک کام کیا۔ شاہ جہاں نے بخارا سے سید عبدالغفور شاہ بخاری صاحب کو بلا کر اس مسجد کا افتتاح کروایا تھا۔ اس مسجد کے دو بڑے مینار ہیں جن کی بلندی تقریباً ایک سو تیس فٹ ہے۔ اس کے علاوہ

اس مسجد کے تین گنبد بھی ہیں۔ مسجد میں پچیس ہزار لوگ بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اٹھارہ سوستاون کی جنگ آزادی کے بعد جہاں مسلمانوں پر بُرا وقت آیا وہاں اس مسجد کے حالات بھی خراب ہوئے۔ انگریزوں نے اس کے متعلق بہت عجیب وغریب فیصلہ کیا۔ وہ اسے گرانا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ بغاوت کرنے والے لوگوں کا مرکز اس مسجد میں واقع تھا لیکن بعد میں انھوں نے اپنا فیصلہ بدل لیا اور یوں مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

یہ اللہ کا گھر تھا اسے کون نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہ میرا ایمان ہے!

اگر آپ کو دلی جانے کا موقع ملے تو آپ اس مسجد میں نماز کے لیے ضرور جائیں، مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کو بہت لطف آئے گا۔ ایک اونچی جگہ مسجد اور اس کے چاروں طرف بارونق بازار، ایک ناقابلِ فراموش منظر آپ کو مدتوں یاد رہے گا۔ نماز کے وقت بہت ہی خوب صورت اذان دی جاتی ہے اور لوگ جوق در جوق نماز کے لیے آتے ہیں۔ یہ منظر بہت ہی خوب صورت لگتا ہے۔ لاہور کی بادشاہی مسجد پرانے لاہور شہر سے ایک طرف ہونے کی وجہ سے عام نمازوں میں اتنا رش نہیں ہوتا جتنا جامع مسجد دہلی میں ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس مسجد کا شہر کے اندر ہونا ہے۔

اللہ رب العزت اس مسجد کے بنانے والوں کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے آمین!

دہلی کے آٹھ دروازے

پرانی دلی کے مشرق میں دریائے جمنا بہتا ہے۔ لال قلعہ شہر اور دریا کے درمیان ہے اس لیے شہر کی طرف جانے والے آٹھوں دروازے شمال، مغرب اور جنوب کی طرف ہیں۔ میں شمال میں واقع کشمیری گیٹ سے شہر میں داخل ہوا تھا۔ ان دروازوں کی صورت حال بالکل لاہور کے دروازوں جیسی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ماضی میں سارا شہر چار دیواری کے اندر تھا جس کے چاروں طرف بڑے بڑے گیٹ تھے جو آمد ورفت کے لیے دن میں کھولے جاتے تھے۔ کچھ کی باقیات تو ابھی بھی ہیں لیکن وہ بہت اچھی حالت میں نہیں ہیں۔

ان کے نام بھی لاہور کے دروازوں کی طرح ہی ہیں، یعنی کشمیری گیٹ، موری گیٹ، لاہوری گیٹ، دہلی گیٹ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے سب دروازوں میں جانے کا موقع تو نہیں ملا لیکن

کشمیری اور موری گیٹ دیکھنے کا مجھے اتفاق ضرور ہوا۔ لاہور کے موری گیٹ میں سائیکل رکشہ نہیں ہے جبکہ اس وقت دلی میں سائیکل رکشہ عام تھا اور اسے چلانے والے اکثر لوگ مسلمان تھے۔ مجھے سوائے اس کے کوئی اور فرق محسوس نہ ہوا۔

ایک نوجوان رکشہ ڈرائیور سے میں نے بات کرنے کی کوشش کی۔۔۔لیکن اس نے صرف اتنا کہا کہ صاحب ہمارا یہی مقدر ہے جو لکھنے والے نے لکھ دیا ہے۔۔۔میں نے اس سے کہا کہ آپ اسے بدل سکتے ہیں۔۔۔اگر آپ کوشش کریں۔۔۔اس نے جواب میں کہا:

''کہنا آسان ہے لیکن کرنا بہت مشکل ہے۔۔۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی سائیکل آگے بڑھا دی۔۔۔اور میں ایسے بادشاہوں کے بنائے ہوئے قلعے کی طرف چل پڑا جنھوں نے عمارات کو تعلیم و تربیت پر ترجیح دی۔۔۔آج پھر ان ہی کو سلام کرنے جا رہا ہوں۔۔۔

کہتے ہیں کہ اب دلی میں یہ سائیکل رکشہ ختم کر دیا گیا ہے۔ پاکستان میں بھی اکثر جگہوں پر سائیکل رکشہ ختم کر دیا گیا ہے۔ لیکن گزشتہ سال ڈیرہ اسماعیل خان میں مجھے سائیکل رکشہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اللہ کرے یہ بھی جلد ختم ہو جائے اور لوگوں کی مشقت میں کمی واقع ہو۔ آمین!

چاندنی چوک: جسے شاہجہاں کی بیٹی نے ڈیزائن کیا

کہتے ہیں کہ شاہجہاں کی تعمیر کردہ بیشتر عمارتوں کے پیچھے اس کی بیٹی جہاں آرا کا ہاتھ تھا۔ معلوم نہیں کہ یہ بات کہاں تک سچ ہے لیکن پرانی دلی کے چاندنی چوک کے متعلق سب کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اسے جہاں آرا نے ہی ڈیزائن کیا تھا۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ چوک بھی شاہجہاں کے دور ہی کی ایک یادگار ہے۔ قلعے اور جامع مسجد کے پاس یہ چوک نصف چاند کی مانند ہے اس میں سے تین بازار اردو بازار، جوہری بازار اور فتح پوری بازار نکلتے ہیں۔ اس چوک کے درمیان ایک گھنٹہ گھر بنا دیا گیا ہے جہاں پر کبھی ایک تالاب ہوا کرتا تھا۔ تالاب کے پانی پر جب چاند کی روشنی پڑتی تھی تو اس سے منظر بے حد سہانا ہو جاتا تھا۔ اسی روشنی کی وجہ سے اس چوک کا نام چاندنی چوک رکھا گیا۔ قلعے کے قریب ہونے کی وجہ سے، قلعہ کی خواتین کے لیے ایک دن مخصوص تھا جس

دن وہ اس بازار سے خریداری کرتی تھیں۔ جب میں جامع مسجد سے اس چوک میں پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں لاہور کے بھاٹی چوک میں ہوں، اسی طرح کارش اور اسی طرح کا طرزِ تعمیر، سب کچھ ویسا ہی لگ رہا تھا، مجھے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

اس وقت چاندنی چوک میں موجود مختلف مارکیٹیں لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ مجھے خریداری سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن میں پھر بھی مختلف مارکیٹوں میں گیا۔ مجھے جو بات مختلف لگی وہ دکانداروں کا رویہ تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ ان کی اردو تو بہت اچھی ہے لیکن لہجے میں سختی ہے، جو مجھے اچھی نہ لگی۔ میں نے کچھ لوگوں سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے میری بات کی تائید کی کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ اس کی وجہ اہلِ دلی کا تفاخر ہو سکتا ہے۔ دلی کے مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ ان کے آباؤ اجداد نے دلی میں بیٹھ کر پورے بھارت پر حکومت کی ہے۔ دوسری وجہ ان کا یہ بات سمجھنا بھی ہو سکتی ہے کہ وہ بھارت میں مسلمانوں کی تہذیب کے قدیمی وارث ہیں۔ یہ میرا خیال ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔

حویلی مرزا غالب: ناقدری کی انتہا

میں نے چاندنی چوک میں ایک مناسب وقت گزارا۔ یوں تو آپ بھارت کے کسی بھی شہر میں جائیں تو آپ کو مختلف قومیت کے لوگ مل جاتے ہیں۔ لباس اور وضع قطع میں فرق ہی سے آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص کس قوم اور کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ چاندنی چوک میں مجھے محسوس ہوا کہ اس علاقے کے لوگوں کی اکثریت ایک جیسے لباس یعنی قمیض پاجامہ وغیرہ پہنے ہوئے تھی اور وضع قطع سے وہ مسلمان لگ رہے تھے۔ میں نے وہاں بہت کم سکھوں کو دیکھا۔ مجھے تھوڑی حیرانی بھی ہوئی۔ بعد میں مجھے کسی نے بتایا کہ غیر مسلم لوگ جامع مسجد اور اس کے آس پاس جانے سے گھبراتے ہیں اور خاص طور پر رات کو تو بالکل نہیں جاتے۔ اس کی وجہ سوائے خوف کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

چاندنی چوک کے بعد قریب ہی محلہ بلی ماراں میں مرزا غالب کی رہائش گاہ موجود تھی۔ اب میری اگلی منزل مرزا غالب کا گھر تھا۔ میں نے کسی سے ان کے گھر کا پتا پوچھا، جو مجھے آسانی سے

مل گیا۔ مین بازار سے تھوڑا سا ہٹ کے ایک گلی نکلتی تھی جس کا نام گلی قاسم جان ہے۔ اس میں تقریباً پچاس گز کے بعد دائیں طرف ان کا گھر تھا۔ اس گھر میں مرزا غالب 1860ء سے 1869ء تک رہائش پذیر رہے۔

ایک بات کا مجھے اس قدر افسوس ہوا کہ جب میں نے دیکھا کہ مرزا غالب کے گھر کے اندر کئی دکانیں بنی ہوئی ہیں اور ایک عظیم شاعر کے گھر کی کوئی بھی نشانی وہاں موجود نہیں تھی۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ مجھ میں وہاں پر زیادہ دیر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی اسی لیے میں جلد ہی واپس بازار میں آ گیا۔ ایک عظیم شاعر کے ساتھ بھارت کی حکومت کا یہ سلوک مجھے پسند نہ آیا۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اہل دلی پر ہوا، ان کے اس سلوک کی وجہ سے جو انھوں نے مرزا غالب کے ساتھ کیا۔ اگر یہ کام حکومت نہیں کر سکتی تھی تو دلی والے اردو کی پہچان اور اردو کو بامِ عروج تک پہنچانے والے شاعر نثر نگار مرزا غالب کی قدردانی کا حق خود تو ادا کر سکتے تھے!

اب جب میں یہ سفر نامہ لکھ رہا ہوں، یعنی سفر کے پچیس سال بعد تو مجھے معلوم ہوا کہ حکومت ہند نے 1999ء میں اس جگہ پر ایک عجائب گھر بنایا ہے اور اس حویلی کو قومی ورثہ قرار دیا ہے۔ یہ سب جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اب یہ ایک شاندار بلڈنگ ہے۔ جسے ہر طریقے سے سجایا گیا ہے، یہاں پر غالب سے متعلق بے شمار اشیا رکھی گئی ہے۔ غالب کے علاوہ بھی بے شمار نامی گرامی شاعروں کی تصاویر بھی موجود ہیں۔

اپنے مشاہیر کو یاد رکھنا ہم سب کا فرض ہے اسی کو تاریخ کہتے ہیں، ہم بھی تاریخ ہی بناتے ہیں اور ہماری آنے والی نسلیں بھی اپنی تاریخ ہی جاننا چاہیں گی۔

دلی کا اردو بازار، چنیوٹ کا ہندو مگو خاندان، ہندو کتاب فروش، مسلمان کباب فروش:

مرزا غالب کے گھر کے بعد میری اگلی منزل اردو بازار تھا۔ بازار جانے سے پہلے میں جامع مسجد کے پاس ایک صاحب سے ملنے گیا جو تفہیم القرآن شائع کرتے تھے۔ یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے۔ ہمارے فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ایک پیارے دوست محمد یاسین ہیں جو 1990ء

میں، ہندوستان سے تفہیم القرآن (جو قرآن پاک کی تفسیر ہے، جسے سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ رحمتہ نے لکھا ہے) لا کر پاکستان میں فروخت کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا بھارت آنا جانا تھا۔ جب میں بھارت جا رہا تھا تو انھوں نے مجھے اپنے ان دوستوں کا پتہ بتایا جن سے وہ تفہیم القرآن خریدتے تھے اور میں ان سے ملنے کے لیے ان کی دکان پر چلا گیا۔

جامع مسجد کے پاس ہی ان کی دکان تھی، ان کا نام جنید احمد تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں آج تک جتنے بھی ایسے لوگوں سے ملا ہوں جن کی مادری زبان اردو ہو، ان سے اچھی اور صاف ستھری اردو بولتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ میں نے ان سے اس بات کا ذکر کیا جس پر انھوں نے بتایا کہ ہمارے گھر میں اردو کے صحیح تلفظ اور الفاظ کے درست استعمال پر خاصا دھیان دیا جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ ہمارے ملنے والوں میں بھی اکثر لوگ وہی ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ اسی وجہ سے ہماری زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات نہیں ہیں۔

جنید صاحب نہایت ہی صاف ستھرے شخص تھے۔ ان کی دکان میں ہر چیز نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی تھی اور خود بھی سمارٹ اور قاعدے قانون کے مطابق زندگی گزارنے والے شخص تھے۔ مجھے ان سے ملے پچیس سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک وہ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ انھوں نے مجھے چائے وغیرہ پلائی، میرا دل تو کر رہا تھا کہ میں ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھتا لیکن مجھے واپس بھی جانا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے اجازت چاہی۔ ان سے میں نے اردو بازار کے متعلق پوچھا، انھوں نے مجھے اس کے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔

انھوں نے بتایا کہ اس وقت بھارت میں کتابیں شائع کرنے کے حوالے سے یہ سب سے بڑی مارکیٹ ہے۔ خاص طور پر اردو میں شائع ہونے والی زیادہ تر کتابیں اسی مارکیٹ سے ملتی ہیں۔ میں اپنے میزبان سے اجازت لے کر اردو بازار کی طرف چلا گیا تا کہ ایک تاریخی بازار کو قریب سے دیکھ سکوں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ بازار کئی کلومیٹر طویل ہے۔ تمام عمارتیں تین سے چار منزلہ ہیں، جن میں نیچے سے لے کر اوپر تک کتابوں ہی کی دکانیں پائی جاتی ہیں۔ میرا مقصد کتابوں کی خریداری نہیں تھا میں تو کتابوں کا وہ بازار دیکھنا چاہ رہا تھا جس کا چرچا میں نے

بہت سارے لوگوں سے سن رکھا تھا۔

میں نے تاریخی کتب میں یہ پڑھا ہے کہ اردو بازار درحقیقت وہ جگہ ہے جہاں سے اردو کے لفظ کا آغاز ہوا اور اس کا استعمال عام ہوا۔ اس علاقے میں مغلوں اور دیگر بادشاہوں کے لشکروں کے کیمپ ہوا کرتے تھے۔ ان فوجی کیمپوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے یہ بازار قائم کیا گیا تھا۔ لشکروں کی موجودگی کی وجہ سے اس بازار کا نام، اردو بازار پڑ گیا۔ یاد رہے کہ اردو کا مطلب ہی لشکر ہے۔ بعد میں انگریزوں نے بھی اپنا فوجی کیمپ اسی علاقے میں قائم کیا۔

جنگ آزادی کے دوران مجاہدین نے انگریزوں کے اس کیمپ کو تو تباہ کر دیا لیکن اردو بازار باقی رہا۔ یاد رہے کہ اس وقت اکثریت کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ فوجی کیمپ تباہ ہو گیا لیکن اردو بازار کا نام باقی رہا۔ بعد میں یہاں پر کتابوں کی دکانیں بننا شروع ہو گی۔ اب یہ ایک بہت بڑی کتابوں کی مارکیٹ ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن اکثر لوگ اوپر بیان کی گئی بات سے متفق ہیں۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو بازار دلی، ہمارے اردو بازار لاہور سے سو گنا سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ میرا گمان ہے کہ اسی بازار کی نسبت سے پاکستان میں لاہور، کراچی اور راولپنڈی میں بھی اردو بازار بنائے گئے۔

میں کتابوں کو دور ہی سے دیکھتا ہوا گزر رہا تھا کہ مجھے اپنے بائیں طرف مگوں پبلشرز کے نام سے ایک بڑی دکان نظر آئی۔ آپ کو علم ہوگا کہ پنجاب کے ایک شہر چنیوٹ میں مگو نام کی بہت ہی معزز کاروباری برادری ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ لوگ بھی اسی برادری سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ میں اُسی حوالے سے ان کی دکان پر چلا گیا۔ میں نے دکان میں بیٹھے ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کے مالک کہاں بیٹھے ہیں؟ اُس نے بتایا کہ وہ نیچے تہہ خانے میں ہیں اور ان کا نام آنند ہے۔ میں تہہ خانے میں گیا تو ایک تیس پینتیس سالہ نوجوان آنند سے ملاقات ہوئی۔ وہ حسب معمول کاروباری افراد کی طرح اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا اور اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ میں لاہور سے آیا ہوں۔

جب میں نے لاہور کا نام لیا تو انھوں نے اپنے سامنے پڑے کاغذ ہٹا دیے اور میری طرف پھر سے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ ہمارے پنجاب کے شہر چنیوٹ میں ملگوں برادری کے لوگ رہتے ہیں۔ میرے چند دوستوں کا تعلق بھی اسی برادری سے ہے۔ میں آپ کی دکان پر ملگوں کا نام دیکھ کر آیا ہوں۔ ملگوں کا لفظ دیکھ کر مجھے یہ خیال گزرا کہ شاید آپ کا تعلق بھی اُسی ملگوں برادری سے ہوگا۔ میں کئی مرتبہ چنیوٹ بھی جا چکا ہوں۔ ان کا یہ سننا تھا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے گلے لگایا اور ساتھ ہی میز پر پڑے ٹشو پیپر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ایک خاموش کہانی (جو بغیر بولے سنی جاتی ہے اور سنائی بھی جاتی ہے) کا آغاز ہو چکا تھا، مجھے بھی ٹشو پیپر کی ضرورت محسوس ہوئی!

دونوں کی بھیگی آنکھیں ایک داستان کی ان کہی کہانی تھی، کچھ تو مشترک تھا!

جس کا مجھے کچھ دیر بعد اندازہ ہوا۔۔۔ ایک ملگوں لٹ لٹا کر چنیوٹ سے آکر دلی میں بس گیا اور ایک مانگٹ سرہند، مشرقی پنجاب سے لٹ لٹا کر ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچا اور آج پچاس سال بعد دونوں کی اولادیں مل رہی تھیں!

کچھ تو تھا جس کا دکھ مشترک تھا!

پھر میں نے ان سے پوچھا کیا میرا یہ خیال درست ہے کہ آپ بھی چنیوٹ سے تعلق رکھتے ہیں؟ یہ سب سن کر ان صاحب نے پہلے تو حیرانی کا اظہار کیا اور پھر خوش ہوئے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ نے درست سمجھا ہے۔

ہم آزادیِ ہند کے وقت چنیوٹ سے یہاں آئے تھے اور ہمارا کتابوں کا کام ہے۔ ہمارے دفاتر اور دکانیں کئی شہروں میں بھی موجود ہیں۔ میں نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے بھی زیادہ بے تکلف ہو گئے اور بہت جلد ہم چنیوٹی لہجے میں پنجابی میں باتیں کرنے لگے۔ یاد رہے کہ چنیوٹ کے لوگ لاہوری لہجے سے مختلف لہجے کی پنجابی بولتے ہیں۔ مجھے بھی یہ لہجہ آتا تھا اس لیے میں نے اسی لہجے کو اپنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ باتیں کرنے لگے۔

آنند مگوں کی پیدائش آزادیِ ہند کے بعد کی تھی لیکن وہ دن رات اپنے بزرگوں سے چنیوٹ کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اسے جب پتہ چلا کہ میں چنیوٹ بھی گیا ہوں، تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ مجھ سے چنیوٹ کی ایک ایک بات پوچھنے لگا۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا کہ کاش میرے پاپا آج زندہ ہوتے تو میں آپ کی ان سے ملاقات کرواتا، یقیناً وہ بہت خوش ہوتے۔

میں نے اس سے نقل مکانی کی بات پوچھی تو وہ خاموش ہو گیا اور دیر تک خاموش رہا۔ اس کے بعد وہ بولے کہ یہ ایک ایسی بات ہے جسے ہم جب بھی یاد کرتے ہیں رو پڑتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ پاکستان جانے والے مسلمانوں کے ساتھ یہاں کے مقامی لوگوں نے بہت برا سلوک کیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے ساتھ بھی وہاں پر اچھا سلوک نہیں ہوا۔ ہم نے بہت نقصان اٹھایا۔ ہمارے خاندان کے بہت سارے لوگ قتل ہوئے۔ ہم بہت سامال و دولت چھوڑ کر خالی ہاتھ بھارت آئے اور بڑی دیر تک پناہ گزینوں کی طرح رہے۔ ہم نہ ہی دلی میں رہنے والے لوگوں کی زبان بولتے تھے اور نہ ہمارا رہن سہن اِن جیسا تھا۔ اس لیے اِن لوگوں سے میل جول قائم کرنے میں ہمیں کافی وقت لگا۔ البتہ ہم مذہب ہونے کی وجہ سے زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اب ہم سب گھل مل گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک ہم اپنے گھروں میں وہی چنیوٹی کے لہجے کی پنجابی میں بات کرتے ہیں اور یہ بات کتنی نسلوں تک چلتی ہے اس کا اندازہ نہیں۔ پاپا نے ہمیں نصیحت کی تھی کہ کوشش کرنا کہ گھر میں پنجابی کے علاوہ کسی اور زبان میں بات نہ کریں تا کہ آپ کا تعلق آپ کے آبا وَاجداد سے اور اُس علاقے سے جڑا رہے جہاں سے ہم نقل مکانی کر کے یہاں آئے تھے۔

میں بڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا، اِسی دوران دوپہر کے کھانے کا وقت بھی ہو گیا۔ مجھے انھوں نے اپنے گھر سے آئے ہوئے کھانے میں بھی شریک کیا۔ جب میں اگلی دفعہ بھارت گیا تو دوبارہ ان سے ملنے کے لیے گیا جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔

میں آنند سے رخصت لے کر باہر آ گیا اور بازار میں چلنے پھرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان کی نسبت بھارت میں کتابوں کی اشاعت بہت زیادہ ہے۔ ابھی بھی بہت ساری کتابیں بھارت سے پاکستان جاتی ہیں۔ ٹیکسٹائل کے حوالے سے بھی ایک صاحب کی کتابیں پاکستان میں

پڑھی جاتی ہیں۔ میں انھی خیالات میں گم اردو بازار سے باہر آ گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اردو بازار میں اسلامی کتابوں کی دکانوں کے مالکان تو مسلمان تھے باقی اکثر دکانوں کے مالکان ہندو تھے۔

اردو بازار کے ساتھ ہی کھانوں کی ایک بڑی مارکیٹ بھی ہے۔ جو گوشت کے پکوانوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ لوگ بڑی تعداد میں یہاں کباب کھانے کے لیے آتے ہیں۔ اس وقت بھی وہاں پر کافی رش تھا۔ اکثر کھانے کی دکانیں مسلمانوں کی جب کہ کتابوں کی زیادہ تر دکانیں ہندوؤں کی ہیں۔

ہندو کتاب فروش، مسلمان کباب فروش: ایک قوم دماغ کی غذا کا اہتمام کرتی اور دوسری پیٹ کی غذا کا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بہترین گاڑی چلاتا ہے اور دوسرا ابھی تک سائیکل چلا کر اپنا پیٹ پالتا ہے۔

یہ اپنے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔
فطرت کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی۔
سب کام اپنے اصولوں کے مطابق کرتی ہے۔
جو محنت کرے گا وہی صلہ پائے گا۔
یہ فطرت کا ازلی اصول ہے!
اور اسی پر میرا پختہ یقین ہے اور عمل بھی!

لال قلعہ

مغلوں کے سر کا تاج، انگریزوں کی عدالت اور مجرم بہادر شاہ ظفر، جمنا کا کنارہ: اردو بازار کے بعد میری اگلی منزل لال قلعہ تھا۔ لال قلعہ دیکھنے سے پہلے میں اس کے قریب سے گزرا اور اس کی وسعت، بلند و بالا عمارت، بہترین ڈیزائن اور سرخ رنگ نے مجھے بے حد مرعوب کیا۔ لال قلعے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے، شاہی قلعہ لاہور کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بہت پرانا ہے۔

میں نے اپنے سفر کا آغاز اٹک کے پاس دریائے سندھ کے نظارے سے کیا تھا، اب

ساڑھے سات سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں دریائے جمنا کا نظارہ کر رہا تھا۔ دونوں دریاؤں کے کناروں پر دو قلعے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ایک کو اکبر نے تعمیر کروایا اور دوسرے کو اس کے پوتے شاہجہاں نے تعمیر کروایا۔ اس سے مغل حکمرانوں کی ترجیحات کا پتا چلتا ہے۔ قلعے کے پاس ہی سے میں نے جمنا کا نظارہ کیا۔ جمنا کنارے کئی گھاٹ بنے ہوئے ہیں۔

لال قلعہ (جس کا پہلا نام، قلعہ مبارک تھا) کی تعمیر 1638ء میں شاہجہاں نے اُس وقت شروع کی جب اُس نے آگرہ سے دلی اپنا پایہ تخت منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لیے اس نے اپنے ایک نہایت ہی آزمودہ ماہر تعمیرات، استاد احمد لاہوری کو منتخب کیا۔ استاد احمد لاہوری وہی ہیں جنھوں نے تاج محل بھی ڈیزائن کیا تھا۔ ان کے نام کی وجہ سے ہی قلعے کے مین گیٹ کا نام لاہوری گیٹ ہے۔ تمام لوگ اسی دروازے سے قلعے میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ وہی گیٹ ہے جہاں 15 اگست 1947ء کو ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے بھارت کی آزادی کا پرچم لہرایا تھا۔ میں اس قلعے میں دو دفعہ گیا ہوں، ایک مرتبہ دن میں اور دوسری بار مغرب کے بعد۔ دن میں مجھے کسی نے یہ بتایا کہ شام کو یہاں پر ایک بہت ہی دلچسپ پروگرام ہوتا ہے۔ آپ کو اس پروگرام میں ضرور آنا چاہیے۔ میں نے اس پروگرام کی ٹکٹ لی اور پھر اس پروگرام میں شرکت کی۔ جس کی داستان اگلے صفحات میں بیان کی جائے گی۔

لال قلعے کا کل رقبہ 255 ایکڑ جب کہ شاہی قلعہ لاہور کا رقبہ 150 ایکڑ ہے۔ اِس قلعہ کی چار دیواری کی لمبائی اڑھائی کلومیٹر کے قریب ہے جبکہ اس کی دیوار کی اونچائی ساٹھ فٹ سے لے کر ایک سو فٹ کے لگ بھگ ہے اور اس کے آٹھ کونے ہیں۔ اس قلعے کے قابل دید مقامات میں؛ نوبت خانہ، دیوان عام، دیوان خاص، نہر بہشت، ممتاز محل، حمام، باؤلی، موتی مسجد، ہیرا محل اور شہزادوں کی رہائش گاہیں شامل ہیں۔

قلعہ اپنی وسعت اور ڈیزائن کے اعتبار سے ایک قابل دید عمارت ہے۔ اس قلعے اور اس میں بنی ہوئی عمارات کی تفصیل بیان کرنے کے لیے الگ سے ایک کتاب درکار ہے۔ میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ یہ وہ جگہ ہے، جس نے بہت سے عروج و زوال دیکھے۔ میں اسی لاہوری دروازے

سے گزرا اور آگے جا کر مختلف عمارتوں کے سامنے بے ٹوک پھرتا رہا، جس دروازے سے کبھی شاہجہاں گزرتا تھا۔ شاہ جہان کے بعد اس کی اولاد بھی اسی جگہ سے گزرتی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر نادرشاہ نے تباہی مچائی اور اس کے بعد انگریزوں نے بھی اسے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جنگِ آزادی سے قبل ہی وظیفہ خوار بادشاہ بہادر شاہ ظفر قلعے تک محدود ہو گیا تھا جبکہ قلعے کے باہر ہر جگہ انگریزوں کی حکومت تھی۔

1857ء کی جنگ آزادی شروع ہونے کے بعد، مجاہدین قلعے تک پہنچے اور انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو اپنا سربراہ بنایا۔ پھر مجاہدین نے ان کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کی۔ اس جنگ میں بہادر شاہ کی اولاد بھی شریک ہوئی، بخت خان بھی اسی جنگ میں آیا اور انھوں نے کچھ وقت کے لیے انگریزوں کو شکست بھی دی اور ان کو دلی سے باہر بھی نکال دیا۔ اسی جگہ بیٹھ کر بہادر شاہ ظفر نے قریبی ریاستوں کو بھی شرکتِ اقتدار کے لیے کہا لیکن رب کائنات کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن بادشاہ اپنی ہی جان بچانے کے لیے اپنے پردادا، ہمایوں کے مقبرے پر چلا گیا۔۔ وہاں پر اس کے پاس دو ہی راستے تھے، یا تو وہ بخت خان کی تجویز پر دلی سے چلا جاتا اور دور بیٹھ کر اس جنگ کی قیادت کرتا، یا پھر وہ انگریزوں کی اِس شرط کو منظور کرتا کہ اگر وہ اپنے آپ کو سرنڈر کر دے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔ بادشاہ سلامت نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ پھر اسی قلعے میں (جسے اس کے بزرگوں نے بنایا تھا) بادشاہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ باغی کی سزا تو موت کی بنتی ہے۔ سزا دینا یا نہ دینا حکومت کا کام ہے۔ انگریز پہلے ہی ان کی جان بخشی کا وعدہ کر چکے تھے لیکن وہ ان کو دلی کے آس پاس بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھیں وہاں سے پانچ ہزار میل دور برما کے ایک شہر رنگون بھیج دیا۔ جہاں انھوں نے ایک معمولی سے مکان میں اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کیے۔ رنگون میں ہی ان کی وفات ہوئی۔

؎ اتنا ہے بدنصیب ظفر، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

مجھے ان کے مقبرے پر جانے کا موقع ملا ہے۔ رنگون کے مسلمانوں نے ان کی قبر پر ایک

عالی شان مقبرہ تعمیر کیا ہے اور مقبرے کے ساتھ ہی ایک مسجد بھی بنائی ہے۔اس وقت ان کی قبر کو ایک درگاہ کا مقام حاصل ہے۔اب لوگ ان کو ایک عظیم صوفی سمجھتے ہیں اور ان کے مزار پر سالانہ عرس کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

میں قلعے کی دیواروں پر یہ سب کچھ پڑھ رہا تھا۔میں بہت دیر تک قلعے کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔ مجھے ہر جگہ عروج وزوال کی داستان کے سوا کچھ نظر نہ آیا، باقی عمارت تو عمارت ہے۔اس میں لال پتھر لگا ہوا ہے۔یہ بہت وسیع ہے اِس میں خوب صورت باغ ہیں، یہاں باغیچے ہیں اور تو سب کچھ ہے لیکن اس کی اصل پہچان تو مغلیہ حکومت کا پایہ تخت ہونا تھا۔

مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ جو اقبال نے کہا تھا: ع

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

لیکن جب طاؤس رباب اول اور شمشیر و سناں آخر ہو جائے تو پھر کوئی لال قلعہ کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔

قلعے کا کام پناہ دینا ہے، اس میں کون پناہ لیتا ہے اس کا انحصار صرف ہمت مرداں پر ہے۔ یہ عمارت تو کسی کو خود اپنے اندر آنے سے نہیں روک سکتی، اس میں تو وہی آئے گا جس میں اندر آنے کی ہمت اور حوصلہ ہوگا۔

مغلوں کے آخری پایہ تخت دلی کو انگریزوں نے فوجی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا اور ہر چیز پر قبضہ کر لیا، بادشاہ کی خواب گاہ، بیگمات کے کمرے، باغ، زیورات الغرض ہر چیز ان کے قبضہ میں آ گئی اور بادشاہ سلامت، ان کی بیگم کو چند افراد کے ساتھ ایک بیل گاڑی پر بٹھا کر انھوں نے اسی لال قلعے سے پانچ ہزار میل دور بھجوا دیا تھا۔

پھر ایک دن آیا، جب ہندوستان کے باسیوں نے انگریز کو بھی چلتا کیا اور پھر اسی قلعے پر بھارت کا پرچم لہرایا گیا۔آج اس قلعے کے لاہوری گیٹ پر بھارت کا پرچم لہرا رہا ہے اور ہر سال یوم آزادی کی تقریب اسی قلعے میں منائی جاتی ہے۔انھی خیالات میں گم میں بہت دیر تک قلعے میں

رہا اور پھر واپس آ گیا۔ دوسری مرتبہ میں مغرب کے بعد اس قلعے میں ہونے والے پروگرام میں شرکت کے لیے گیا جس کی کسی نے بہت تعریف کی تھی۔

اس پروگرام میں شرکت کے بعد مجھے سمجھ آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس قلعے کے مالکوں کو کیوں بدلا اور کیوں نئے مالک آئے تھے اور کیسے یہ قلعہ مغلوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس پروگرام کی مختصر رُوداد پیش خدمت ہے۔

ایک شام قلعے میں بادشاہ سلامت کے ساتھ

اس پروگرام کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ مغرب کے بعد قلعے کے ایک لان میں تقریباً دوسو کے قریب کرسیاں لگا دی جاتی ہیں اور لوگ ان کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مکمل اندھیرا تو نہیں ہوتا لیکن روشنی بہت کم ہوتی ہے۔ اتنے میں کچھ آوازیں آنا شروع ہوتی ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ مبارک کی خواتین کی آوازیں ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خواتین قلعے کے قریب کسی مارکیٹ سے خریداری کر رہی ہیں، صرف آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن اتنی خوب صورت آواز اور اتنا خوب صورت تلفظ شاید ہی کبھی دوبارہ سننے کو ملے۔ کچھ دیر تک تو خواتین کی آوازیں آتی ہیں اور پھر آوازوں سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر دربار میں تشریف لا رہے ہیں۔ چوب داروں کی زوردار اور بلند آواز باادب، باملاحظہ، ہوشیار! بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں، کی صدا بلند ہوتی ہے۔ ان کے نام کے ساتھ بے شمار القابات لگائے جاتے ہیں۔ ان کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور پھر بادشاہ سلامت تخت شاہی پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔

دربار سجتا ہے اور بادشاہ کے دربار میں شعرا حضرات اپنا کلام پیش کرتے ہیں، واہ واہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ شعراء میں مرزا غالب، استاد ذوق نمایاں ہوتے ہیں البتہ ان کے علاوہ بھی کئی اور شاعر موجود ہوتے ہیں۔ سب لوگ فرداً فرداً شعر پڑھتے ہیں اور واہ واہ کا شور مچتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں ساری دنیا ادھر سے ادھر کر دی جاتی ہے۔

بڑی دیر تک محفل چلتی ہے اور اس کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سب کو کھانا کھلایا جا رہا ہے، انعام واکرام دیے جاتے ہیں اور پھر کہیں جا کر یہ محفل برخواست ہوتی ہے۔ یہ قلعہ کے اندرونی حالات کی کہانی ہوتی ہے۔

یہ پروگرام ایک گھنٹے سے زائد چلتا رہتا ہے۔ اس پروگرام نے مجھ پر سحر طاری کر دیا اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میں اُس دور میں جا کر یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس پروگرام کی ریکارڈنگ حاصل کرنے کی کوشش کی جو مجھے نہ مل سکی۔ بہر حال وہ ایک دلچسپ تجربہ تھا جس کی گونج آج تک سنائی دیتی ہے۔ میرے دل میں یہ خیال ابھرا کہ ایک وقت تھا کہ جب جنگجو لوگ اس قلعے میں بیٹھ کر پورے ہندوستان پر حکومت کرتے تھے اور وہ اُس وقت بادشاہ کے درباری ہوتے تھے۔ لیکن جب بادشاہ سلامت کا وقت شاعروں کی محفل میں گزرے گا تو آپ خود اندازہ کریں کہ پھر کون ہے جو اس وسیع سلطنت کی حفاظت کرے گا؟

جب ایسی صورت حال ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بھی حکمرانوں کو بدل دیتا ہے اور جو وہ کچھ کرنا جانتے ہیں ان کو اپنی زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ جو صرف شعر وشاعری پہ زندہ رہتے ہیں انھیں رنگون جانا پڑتا ہے، ان کے بچوں کو ان کے سامنے قتل کیا جاتا ہے اور ذلت کی انتہا یہ کہ بچوں کے سر باپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل میں جانا میرے لیے ممکن نہیں، اس کے لیے آپ کو تاریخ پڑھنی چاہیے یا کم از کم کبھی موقع ملے تو لال قلعہ دہلی تو ضرور ہی دیکھنا چاہیے۔ اس طرح سے میری آج کے دن کی سیر مکمل ہوئی اور میں واپس اپنے میزبان کے آفس پہنچ گیا اور اسی شام میرے ایک دوست مجھے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

کریم ریستوران: دہلی کی ایک روایت کا تسلسل اور درشن چودھری عرف بیرا

انیس سو پچانوے میں مجھے ترکی جانے کا موقع ملا ایک روز میں اور ڈاکٹر سلیمان وہرہ صاحب ایک ہوٹل کی لابی میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب سیڑھیاں اتر کر ہمارے پاس آئے۔ شکل وصورت سے لگ رہا تھا کہ ان کا تعلق بھارت یا پاکستان سے ہے۔ وہ ہمارے پاس آئے اور

انھوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا آپ پاکستان سے ہیں؟ ہم نے کہا کہ جی ہاں ہمارا تعلق پاکستان سے ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میرا نام رنبیر سنگھ مانگٹ ہے اور میرا تعلق بھارت سے ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ وہ اس وقت مشرقی یورپ سے آ رہے ہیں اور بوڈاپیسٹ میں کسی نے ان کا بریف کیس چرا لیا تھا جس میں پاسپورٹ اور رقم تھی جس کی وجہ سے انھیں خاصی پریشانی ہوئی۔ اب گروکی کِرپا سے بھارت کی ایمبیسی نے نیا پاسپورٹ بنا کر دے دیا ہے اور یوں وہ سفر کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ ہم نے اس واقعے پر ان کے ساتھ افسوس کا اظہار کیا اور مانگٹ ہونے کی وجہ سے ہماری دوستی کا آغاز ہونے میں کچھ بھی دیر نہ لگی۔ ان کے آباؤاجداد لدھیانہ کے رہنے والے تھے لیکن اب وہ دہلی میں رہتے ہیں۔ وہ پیپر انڈسٹری میں استعمال ہونے والے کیمیکلز بنانے والی ایک انٹرنیشنل کمپنی میں سینئر مینجر تھے۔ ان سے پہلی ملاقات کو آج 25 سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک ان کے ساتھ ہمارا گہرا تعلق موجود ہے۔ میں جب بھی بھارت گیا تو ان سے میری ملاقات ضرور ہوئی ہے اور وہ بھی جب کبھی لاہور آئے تو ہمیں میزبانی کا شرف بخشا ہے۔

میں نے بھارت جا کر ان سے رابطہ قائم کیا تو ان کے ساتھ یہ طے ہوا کہ آج شام کا کھانا ہم اکٹھے کھائیں گے۔ وہ شام کو مجھے ہوٹل سے لینے آ گئے اور کہنے لگے کہ آج آپ کو ایک بڑے ہی معروف ریسٹورنٹ میں کھانا کھلاؤں گا۔ ہم ریسٹورنٹ پہنچے تو پتہ چلا کہ اس ریسٹورنٹ کا نام کریم ریسٹورنٹ ہے۔ وہ ایک بہت ہی روایتی ریسٹورنٹ تھا جس کی ایک بڑی پارکنگ تھی جو دہلی جیسے شہر میں بہت کم کسی کے پاس ہوتی ہے اور سجاوٹ بھی بے حد خوب صورت تھی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ تمام سٹاف سرخ رنگ کی لمبی اچکن پہنے ہوئے تھے۔ جس سے میرا پہلا تاثر یہ بنا کہ یہ کوئی بہت ہی مقامی روایات کا حامل ریسٹورنٹ ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر تھا کہ یہ کسی مسلمان کا ہوٹل ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ ہم نے کیا کھایا، میں چاہوں گا کہ ریسٹورنٹ کے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

کہتے ہیں کہ انیسویں صدی میں، مغلوں کے آخری دور میں، محمد عزیز نامی ایک شخص مغل

بادشاہ کے شاہی باورچی خانے کا سربراہ تھا۔ جہاں مغل گئے وہاں ان کے شاہی باورچی خانے بھی چلے گئے۔ محمد عزیز بھی دلی چھوڑ کر میرٹھ چلا گیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ وفات سے پہلے اس نے کھانا پکانے کا فن اپنے خاندان کے چند لوگوں کو سکھایا جن میں حاجی عبدالکریم بھی تھے۔

انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں 1911ء میں دہلی میں ایک بہت بڑا دربار لگایا۔ جس میں انگلینڈ کا بادشاہ جارج پنجم مہمان خصوصی تھا۔ اس وقت پورے ہندوستان سے راجے، مہاراجے اور ان کے بے شمار دوست احباب بھی دلی آئے۔ حاجی کریم الدین نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ میرٹھ سے دلی آ گیا اور یہاں آ کر اپنا ریسٹورنٹ کھولا جس کا نام کریم ہوٹل رکھا۔ اس نے یہ طے کیا کہ وہ بہت ہی کم ریٹ پر لوگوں کو شاہی کھانا کھلائے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور وہ کامیاب ٹھہرا۔ آج کریم ہوٹل کی بہت سی برانچیں ہیں جن میں سب سے پرانی برانچ جامع مسجد کے پاس ہے۔ یہ ہوٹل دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے رزق میں بے حد برکت عطا فرمائے۔ آمین! اس وقت کریم صاحب کی چوتھی نسل یہ کام کر رہی ہے اور بہت ہی خوب کر رہی ہے۔

جب ہم اندر گئے تو رنبیر سنگھ مانگٹ صاحب نے کہا کہ ان کی ایک بہت ہی اسپیشل ڈش ہے جسے مکھنی دال کہتے ہیں۔ مسور کی ثابت دال (جو قدرتی طور پر سیاہ رنگ کی ہوتی ہے) کو خاص طریقے سے پکاتے ہیں اور اسے مکھن کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

شاید یہیں سے یہ محاورہ بنا ہوگا۔

یہ منہ اور مسور کی دال!

ہمارے بچپن میں ہمارے گھروں میں یہ معروف ترین کھانا ہوا کرتا تھا، اس لیے کہ یہ سستا پڑتا تھا۔ دال بھی مہنگی نہیں ہوتی تھی اور مکھن تو گھر میں ہی بنایا جاتا تھا۔ مجھے یہ کھاتے ہوئے وہ سب کچھ یاد آیا کہ کس طرح ہماری والدہ یہ دال بناتی تھیں۔

بہرحال کریم ہوٹل کا انداز دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ ہوٹل بھی چلا رہے ہیں اور انھوں نے اپنے کلچر کو بھی نہیں چھوڑا۔ وہ سب لوگ انتہائی خوب صورت انداز میں اردو بول رہے تھے اور

بہت ہی مؤدبانہ طریقے سے اپنے مہمانوں کی خدمت کر رہے تھے۔اتنی خاموشی تھی کہ لگتا تھا یہاں کوئی نہیں ہے۔در و دیوار بھی ایک روایتی انداز سے سجائے ہوئے تھے۔کھانا جو مقدر میں تھا، کھا لیا لیکن وہ منظر اب بھی یاد ہے۔اب جب بھی کبھی بھارت جانا ہوا تو ان شاءاللہ حاجی کریم الدین کے لگائے ہوئے اس پودے سے ضرور فیض یاب ہوں گا۔اس طرح سے میرا دوسرا دن بھی بخیر و عافیت گزر گیا۔رنبیر سنگھ مانگٹ نے مجھے ہوٹل اتارا اور میں یہ سوچ کر سو گیا کہ صبح چھ بجے خفیہ ایجنسی کا میرا دوست رام لال ملنے آئے گا اور میں اس سے پوچھوں گا کہ اس کی پتنی کا کیا حال ہے کیونکہ اس نے کل بتایا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

اگلے روز رام لال کے جانے کے بعد تقریباً دس بجے شرما صاحب تشریف لے آئے۔آج پروگرام کے مطابق مجھے ان کی ڈائیز بنانے والی فیکٹری میں جانا تھا کیونکہ میں ان سے ڈائیز خریدنا چاہتا تھا۔شرما صاحب نے بتایا کہ ہم یہاں سے دفتر چلیں گے اور پھر دفتر سے بیرا جی آپ کو ڈائیز بنانے والی فیکٹری میں لے کر جائیں گے۔بیرا جی کا لفظ سن کر میں ایک دفعہ تو چونک گیا کیونکہ یہ لفظ ہمارے گھر میں بڑے بھائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

میرے والد محترم اپنے بھائیوں اور کزنز میں سب سے بڑے تھے، اس لیے سب لوگ انھیں بیرا کہتے تھے۔ویر بھی بھائی کے لیے بولا جاتا ہے اور بیرا کا مطلب بھی بڑا بھائی ہی ہے۔ مجھے بھی میرے کزن اور بھائی، بیرا ہی کہتے رہے ہیں۔اب ایک دو کے علاوہ باقی سب نے بھائی جان کے لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔یہ ہماری پنجابی زبان پر اردو کے اثرات کی ایک نشانی ہے۔لیکن بھارت میں ایسا نہیں ہے، پنجابی بولنے والے لوگ ابھی بھی اپنی زبان کے ساتھ بڑے اچھے طریقے سے جڑے ہوئے ہیں۔میں نے شرما صاحب کو بتایا ہے کہ یہ لفظ ہمارے گھر میں بھی بڑے بھائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔درشن چودھری (جو اس کمپنی کے مالک ہیں) کو بھی ان کے بھائی بڑے ہونے کی وجہ سے بیرا کہتے ہیں۔شرما صاحب نے کہا آپ نے ٹھیک سمجھا۔ انھوں نے بتایا دہلی میں یہ لفظ نہیں بولا جاتا لیکن پنجاب کے کچھ علاقوں میں بڑے بھائی کے لیے بیرا کا لفظ اب بھی استعمال ہوتا ہے۔اس سے میرا بیرا جی کو ملنے کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔

ہم اندرون دلی اُن کے دفتر چلے گئے جہاں بیرا جی تشریف فرما تھے۔ درمیانے قد کا ایک پچاس سالہ شخص جو طبیعت کے لحاظ سے نہایت ہی بردبار تھا۔ ان کی باتوں سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے کاروبار کو بہت اچھے طریقے سے سمجھتے ہیں اور اپنے خاندان کو بھی مناسب انداز میں ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ وہ مجھے لے کر اپنی فیکٹری چلے گئے جو دہلی سے خاصے فاصلے پر تھی۔ راستے میں مجھے ان سے بہت سی باتیں کرنے کا موقع ملا۔ ہم ڈائیز بنانے والی فیکٹری میں بیٹھے تھے کہ وہاں پر ایک انتہائی دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

ہماری موجودگی میں ایک صاحب سکوٹر پر آئے، انھوں نے بیرا جی کو سلام کیا اور میرے ساتھ بھی ہاتھ ملایا۔ بیرا جی نے پوچھا کہ آپ جس کام سے گئے تھے کیا وہ کام ہو گیا ہے؟ اس پر اس صاحب نے کہا جی ہو گیا ہے۔ اس پر دونوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے تھا لیکن ماحول ایسا بن گیا اور بیرا جی سے میری بے تکلفی بھی کام آ گئی۔

میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ہمیں سرکار سے ایک سرٹیفکیٹ چاہیے تھا۔ جس کے لیے ہم نے ایک سرکاری دفتر میں درخواست دے رکھی تھی۔ وہاں پر ایک صاحب تھے جو اس کام کے تیس ہزار روپے مانگ رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ یہ زیادہ ہیں تو انھوں نے بہت ہی دلچسپ جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ میرا پکا ریٹ ہے اور میں اپنا ریٹ خراب نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے بتایا کہ میں دو ماہ بعد یہاں سے ریٹائر ہو رہا ہوں، اس کے بعد جو صاحب آئیں گے ان کا ریٹ بیس ہزار روپیہ ہے، آپ انتظار کریں اور دو ماہ کے بعد آپ اپنا کام کروالیں۔

بیرا جی نے بتایا کہ نئے صاحب آ گئے اور انھوں نے بیس ہزار روپے لے کر ہمیں سرٹیفکیٹ دے دیا ہے۔ میں نے بیرا جی سے کہا کہ لگتا ہے کہ رشوت کا رواج عام ہے اور اس میں کسی کو کسی طرح کا کوئی خوف بھی نہیں ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ ہاں آپ کی بات درست ہے۔ ہم اگر یہ چھوٹی چھوٹی رقمیں نہ دیں تو ایک دن بھی کام نہیں کر سکتے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہمارے ہاں بھی معاملات کچھ ایسے ہی ہیں۔ فرق شاید صرف ریٹ کا ہو۔ دوپہر کے بعد ہم ان کی فیکٹری سے واپس اندرون دلی آ گئے۔ آج پھر میں نے ان سے رخصت لی اور اندرون دلی کے جو

مقامات دیکھنے باقی تھے، ان کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

فتح پوری مسجد

میں بیرا جی کے دفتر سے نکل کر چاندنی چوک کے پاس پہنچ گیا۔ میں سب سے پہلے فتح پوری مسجد دیکھنا چاہ رہا تھا، جس کے متعلق یہ سنا تھا کہ یہ مسجد بہت وسیع تو نہیں لیکن بہت ہی خوب صورت ہے اور مغل فن تعمیر کا ایک نہایت ہی خوب صورت شاہکار ہے۔

چاندنی چوک کے مغرب میں واقع فتح پوری مسجد سترھویں صدی کے وسط میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس کا نام شاہ جہاں کی ایک بیوی فتح پوری بیگم کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ مسجد مکمل طور پر سرخ پتھر سے بنی ہوئی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ آزادی کے مجاہدین نے قیام کیا تھا۔ انگریزوں نے اس مسجد کو بھی نہ بخشا اور اسے ایک مقامی تاجر کو فروخت کر دیا تھا۔

اس مسجد کو دیکھنے کے بعد میں اس بات کا قائل ہو گیا کہ شاہ جہاں میں قدرتی طور پر ایک فن تعمیر کا ماہر چھپا ہوا تھا اور اس سلسلے میں اس کے اہل خانہ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ چاندنی چوک اس کی بیٹی نے ڈیزائن کیا تھا اور یہ مسجد اس کی بیوی نے بنوائی تھی۔ جنگ آزادی میں اس مسجد کا کردار بے حد اہم رہا تھا۔ میں یہ سوچتا ہوا وہاں سے واپس آ گیا کہ بالآخر اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہی لوگوں کو پناہ ملی۔

گردوارہ سیس گنج صاحب: گرو تیغ بہادر سنگھ کی جائے قتل

مجھے یاد ہے کہ پہلی مرتبہ میں دورِ طالب علمی میں ننکانہ صاحب میں موجود سکھوں کے گردوارے گیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے حسن ابدال میں واقع پنجہ صاحب اور شیخوپورہ کے قریب گردوارہ سُچا سودا میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ چاندنی چوک کی سنہری مسجد کے قریب ایک تاریخی گردوارہ موجود ہے جس کا نام سیس گنج گردوارہ ہے۔ میری اگلی منزل یہی گردوارہ تھا۔ بھارت میں کسی بھی گردوارے میں جانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ کو گردوارہ سیس گنج صاحب کے متعلق کوئی بات بتاؤں، میں

آپ کو یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخی کتب خاص طور پر سکھوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اورنگزیب اور اور سکھوں کے درمیان شدید کشمکش پائی جاتی تھی۔ اسی کشمکش کے نتیجے میں اورنگزیب نے بہت سے سکھوں کو قتل کیا۔ ان میں سے ایک قتل سکھوں کے نویں گرو، گرو تیغ بہادر کا بھی ہے، جس کا سکھوں کو سب سے زیادہ دکھ ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ مجھے بھارتی پنجاب کے شہر سرہند میں اس گردوارے جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے جہاں پر گرو گوبند صاحب کے بچوں کو دیوار میں زندہ چنوایا گیا تھا۔ یہ بات بہت حد تک سچ ہے، سکھ اس بات کا بڑے زور و شور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ مغل بادشاہ نے یہ جرم کیا تھا۔ میں جب آپ کو پنجاب کی سیاحت کے بارے میں بتاؤں گا تو اس وقت سرہند میں واقع اس گردوارے کا ذکر بھی آپ کے سامنے رکھوں گا۔

میں پیدل چلتا ہوا سیس گنج گردوارہ پہنچ گیا۔ ایک بڑی تعداد میں وہاں لوگ موجود تھے اور ایک خاص پروٹوکول کے تحت لوگ گردوارے کے درمیان میں واقع ہال کی طرف جا رہے تھے۔ جب سب لوگ کوئی ایک کام کر رہے ہوں تو آپ کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہاں سب سے پہلا کام ایک واش بیسن پر ہاتھ اور منہ دھونا ہوتا ہے، اس کے بعد صاف پانی کی ایک چھوٹی نالی چل رہی ہوتی ہے جس میں پاؤں دھوئے جاتے ہیں۔ ہاں یاد آیا ایک جگہ جس کا نام جوڑا گھر ہے، وہاں پر آپ کو اپنے جوتے بھی جمع کروانے ہوتے ہیں اور جرابیں بھی اتارنی ہوتی ہے۔

ہر گردوارہ میں جوڑا گھر کی روایت بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پر کام کرنے والے افراد، گردوارہ میں آنے والوں کے جوتے لے کر ریکس میں رکھتے ہیں اور ایک ٹوکن دے دیتے ہیں۔ میں نے جوڑا گھر میں دیکھا کہ ایک آدمی، جو شکل و صورت سے خاصہ پڑھا لکھا اور خوشحال لگ رہا تھا، وہ بھی وہاں پر لوگوں کے جوتے پکڑ کر رکھ رہا تھا۔ جبکہ ہمارے ہاں تاریخی مقامات کے باہر یہ کام عام سے لوگ کرتے ہیں اور ہم ان کو اس کام کی ادائیگی بھی کرتے ہیں۔ مجھے کچھ عجیب لگا۔ میں نے ایک صاحب سے اس بارے میں پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ اس نے مجھے بتایا کہ سکھ لوگ جوڑا گھر میں کام کرنے اور لوگوں کی خدمت کرنے کی منت مانتے ہیں۔ اس

سے ان کے نفس کی تربیت ہوتی ہے اور اس سب کچھ کرنے کا مقصد اپنے اندر سے غرور یا تکبر کو ختم کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمارے بابا گرونانک کی تعلیم ہے۔

اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ جو صاحب سفید کپڑوں میں لوگوں کے گندے جوتے پکڑ کر رکھ رہے ہیں وہ ایک بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ انھوں نے دس دن کے لیے جوڑا گھر کی خدمت کرنے کی منت مانی ہوئی ہے۔ یہ بھی تزکیہ نفس کا ایک انداز ہے۔ میں اس پروٹوکول سے گزر کر اندر ہال میں چلا گیا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے دوسرا اہم کام سر پر رومال رکھنا ہوتا ہے۔ میں نے بھی وہاں پر پڑے ہوئے ریشمی رومالوں میں سے ایک رومال لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

ایک بہت بڑے ہال کے درمیان اونچے چبوترے پر ایک سکھ گرنتھ صاحب جو سکھوں کے نزدیک سب سے مقدس کتاب پڑھ رہے تھے اور باقی لوگ اردگرد بیٹھے سن رہے تھے۔ کچھ لوگ گرنتھ صاحب کو پنکھا بھی جھل رہے تھے۔ میں نے ایک سردار سے پوچھا کہ کتاب کو پنکھا جھلنے کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے بتایا کہ ہم کتاب کو اپنا زندہ گرو سمجھتے ہیں اور اس کا اسی طرح احترام کرتے ہیں جیسے زندہ گرو کا احترام کیا جاتا ہے اور اسی طریقے سے اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں جس طرح سے ایک انسانی جسم کی حفاظت کی جاتی ہے۔

میں کچھ دیر گردوارہ ہی میں رہا، جہاں مجھے دو بے حد دلچسپ چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو یہ کہ سب لوگ خاموش بیٹھے تھے اور صرف گرنتھ صاحب پڑھنے والوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور لوگ آپس میں کوئی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ یہ ایک طرح سے گرنتھ صاحب کے احترام کا طریقہ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہاں پر بڑے پیمانے پر کھانے کا بندوبست تھا۔ دال روٹی کے ساتھ ساتھ حلوہ بھی تھا جسے وہ پرشاد کہتے ہیں۔ ایک سردار نے بتایا کہ دنیا بھر میں موجود گردواروں میں ایسا ہی کھانا پکتا ہے اور ہر وقت دستیاب بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمارے گرو کا حکم ہے کہ جو بھی گردوارہ میں آئے اِسے ہر حالت میں کھانا ملنا چاہیے۔

میں نے ایک بات نوٹ کی ہے کہ سکھوں کے علاوہ، ہندوؤں کی عبادت گاہوں اور اکثر مسلمان بزرگوں کے مزارات پر دال اور سبزی ہی پکائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ کوئی ایسا

شخص جو گوشت نہ کھاتا ہو وہ بھوکا نہ رہے۔ مسلمان مزارات میں داتا صاحب اور حضرت نظام الدین اولیا کا میں عینی شاہد ہوں۔

اس وقت سی ڈی کا رواج نہیں تھا بلکہ ٹیپ ریکارڈر کی کیسٹس ملتی تھی۔ میں نے گردوارے کے باہر سے چند کیسٹس خریدیں، جو بہت ہی سادہ پنجابی زبان میں وعظ ونصیحت پر مبنی تھیں۔ میں ان کو خاصے عرصے تک اہتمام کے ساتھ سنتا رہا۔ اس کے علاوہ میں نے وہاں سے ایک کڑا بھی خریدا جو میں پاکستان آکر پہنتا بھی رہا۔ کچھ اہلِ ایمان نے اسے سکھوں کی نشانی سمجھ اس پر اعتراض کیا اور میرے ایمان کے اوپر بھی شک شروع کر دیا۔ کچھ نے کہا کہ کیونکہ تمہارے آباؤاجداد سکھ تھے، اس لیے تم یہ کڑا پہن رہے ہو۔ میں نے اپنے ایمان کو کڑے پر ترجیح دی اور ایک دن کڑا اتار دیا۔

گردوارے کی سیر کے بعد میں باہر نکل آیا اور ایک تھڑے پر بیٹھ کر میں نے اس گردوارے کی تاریخ کو جاننا چاہا جو گردوارے کے پاس سے لی ہوئی ایک کتاب میں درج تھی۔ اُس کتاب کے مطابق اس جگہ پر 1675ء میں گرو تیغ بہادر کو قتل کیا گیا تھا۔ قتل سے پہلے گردوارہ سے ملحقہ کوتوالی میں انھیں قید بھی رکھا گیا تھا۔

اورنگ زیب کی فوج نے گرو کا قتل کر دیا لیکن لاش کے بارے میں وہ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ اس دوران رات بھی ہوگئی۔ سکھوں کو خیال آیا کہ کہیں ان کے گرو کی لاش کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ ہو جائے۔ اسی خوف سے گرو کے ایک ساتھی نے گرو کی لاش کو رات کے وقت اٹھایا اور اپنے گھر میں رکھ لیا۔ یاد رہے کی سکھ مردوں کو جلاتے ہیں۔ اس شخص نے ان کی میت کو جلانے کے لیے اپنا پورے کا پورا گھر جلا دیا۔ لاش کو کسی متوقع توہین سے بچانے کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا۔ اس بناء پر سکھ ایسا کرنے والے سکھ کی بے حد قدر کرتے ہیں۔

جب مغلوں کی حکومت کمزور پڑ گئی تو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سکھوں نے دلی پر حملہ کیا اور انھوں نے اُس جگہ پر جہاں گرو صاحب کو قتل کیا گیا تھا ایک گردوارہ بنانے کا مطالبہ کیا۔ مغلوں نے انھیں اس بات کی اجازت دے دی اور اس طرح یہ گردوارہ 1783ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس گردوارہ کی تعمیر کا سہرا سکھوں کے ایک جرنیل بیگھل سنگھ کو جاتا ہے۔ بعد میں مسلمانوں نے اس جگہ پر ایک مسجد

بھی بنائی اور اس طرح یہ جگہ ایک جھگڑے کا باعث بھی بنی رہی۔ انگریزوں کے دور میں اس جگہ کا فیصلہ سکھوں کے حق میں ہوگیا۔ گرو کے قتل کی وجہ سے سکھ اس جگہ کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

میں جب بھی تاریخ پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ تاریخ پڑھنے کے لیے بہت زیادہ حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے طے شدہ نظریات اور احساسات کے ساتھ تاریخ کو پڑھیں گے تو آپ کو تاریخ پڑھنے کا مزا نہیں آئے گا اور نہ ہی آپ کبھی سچ جان سکیں گے۔ آپ صرف اپنے ہی نظریات کو پڑھ رہے ہوگے لیکن اگر آپ غیر جانبدار ہو کر تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اپنوں اور غیروں کے کردار کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوگا۔

میرے بزرگ بتایا کرتے تھے کہ آزادیِ ہند کے وقت جب سکھ مسلمانوں کو مارتے تھے تو ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ اورنگزیب کے مظالم کا بدلہ ہے۔ انھی خیالات اور سوچوں کے ساتھ میں وہاں سے اپنی اگلی منزل کی طرف چل پڑا۔

دلی کے بازار: دلی کی ثقافت کی ایک زندہ مثال

میری اگلی منزل دلی کے بازار تھے اور کسی ریسٹورنٹ سے کھانا کھانا تھا۔ اس دوران جو چند چیزیں میں نے محسوس کی وہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جو مقامات میں دیکھنا چاہتا تھا وہ کچھ فاصلے پر تھے۔ اس لیے میں نے ایک آدھ مرتبہ سائیکل رکشہ بھی استعمال کیا۔

دلی کے بازاروں میں پھرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ مسلمان ایک خاص علاقے تک محدود ہیں۔ ان علاقوں میں غیر مسلموں کی تعداد خاصی کم نظر آتی تھی۔ ویسے تو پہچان مشکل ہوتی ہے لیکن سکھ اپنی پگڑی اور ہندو اپنے ہاتھ پر بندھے ہوئے دھاگے یا ماتھے پر لگے ہوئے کشکہ سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ دکان کی بھی یہی پہچان ہے۔ ہر شخص نے اپنی دوکان پر کوئی نہ کوئی مذہبی نشاں ضرور لگایا ہوتا ہے۔ حال ہی میں (مارچ، اپریل 2020ء میں) ہونے والے مسلم کش فسادات سے بھی میرے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے۔ تمام ہنگامے ان علاقوں میں ہوئے جہاں پر مسلمان اکثریت میں تھے۔ بازاروں میں خواتین کی تعداد مردوں کی نسبت کافی زیادہ تھی۔ بحیثیت مجموعی ساڑھی پہنی ہوئی خواتین کی تعداد نمایاں تھی۔

میں سائیکل رکشہ چلانے والوں کے پاس جہاں وہ سواریوں کا انتظار کرتے تھے بہت دیر تک کھڑا رہا اور یہ سننے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کیا باتیں کرتے ہیں۔ میں نے جو محسوس کیا اس کے مطابق دو باتیں بڑی واضح تھیں، ایک تو ان رکشہ چلانے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور دوسری یہ کہ ان کی زبان بھی بہت سخت تھی۔ وہ آپس میں کافی سخت لہجہ میں بات کر رہے تھے۔ دہلی میں عام آدمی کا لہجہ بھی خاصہ تحکمانہ تھا۔ اگر میں نے کسی سے راستہ پوچھا تو اس نے راستہ بتاتے ہوئے بھی اپنا احساس تفاخر ضرور ظاہر کیا۔

میں چاندنی چوک کے قریب ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے لیے چلا گیا۔ یہ ریسٹورنٹ ہماری پرانی انارکلی میں واقع ریسٹورنٹس جیسا تھا۔ کھانوں کی ایک طویل فہرست تھی جن کے بڑے ہی خوب صورت نام تھے۔ میں سفر میں سبزی اور دال کو پسند کرتا ہوں لہذا یہاں پر بھی میں نے سبزی ہی کھائی۔ لاہور اور دلی کے کھانوں میں مرچ مصالحوں کی مقدار کا واضح فرق تھا۔ اس قدر مصالحہ جات استعمال کیے گئے تھے جو تقریباً میرے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!

ایک اور بات جو ممکن ہے آپ کو بھی پسند نہ آئے، وہ صفائی ستھرائی کی طرف سے لاپرواہی تھی۔ اس کا جتنا خیال ہم سب کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو کرنا چاہیے، اس میں بہت زیادہ کمی تھی۔ ایک بات جو بے حد خوب صورت لگی، وہ نماز کے وقت بہت خوب صورت انداز میں اذانوں کا سنائی دینا تھا اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کا نماز کے لیے مساجد کا رخ کرنا تھا۔ مساجد جانے والے اکثر لوگوں کا لباس سفید کرتا پاجامہ اور سر پر سفید ٹوپی تھی۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں ہمدرد دواخانہ جاتا۔ اس وقت حکیم سعید شہید صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید حیات تھے۔ میں ان کے دفتر گیا بھی لیکن تھوڑی دیر ہو گئی، شام کا وقت تھا اور دفاتر بند ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود میں باہر سے ہمدرد وقف کی عمارت کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

ایک اور جگہ جہاں میری جانے کی خواہش تھی، وہ راج گھاٹ تھا، یعنی جہاں راجوں کی

آخری رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ یہ ایک وسیع میدان ہے۔ راج گھاٹ پر ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کی آخری رسومات ادا کی گئی۔ ان میں سب سے اہم مہاتما گاندھی کی آخری رسومات ہیں۔ مہاتما گاندھی کے علاوہ بھی بہت بڑی بڑی شخصیات، جن میں نہرو کے ساتھ ساتھ اندرا گاندھی بھی شامل ہیں، کی آخری رسومات ادا کرنے کی جگہ بھی اسی علاقے میں موجود ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں پر مردے نذرآتش کیے جاتے ہیں اور مرنے والے کی یاد میں اس جگہ پر کوئی یادگار بنادی جاتی ہے۔ یہ ایک اہم تاریخی علاقہ ہے جسے میں صرف دور سے دیکھ سکا۔

ایک اور علاقہ جو پورے بھارت میں کتابوں کی مارکیٹ کی وجہ سے بہت مشہور ہے، دریا گنج کہلاتا ہے۔ کسی دور میں یہاں پر انگریزوں کی چھاؤنی ہوتی تھی اور اب یہاں پر کتابوں کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔

دلی کے بازاروں میں چلتے ہوئے مجھے سید مودودی کے پاؤں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ مجھے وہ آواز بھی سنائی دی جب مسلمانوں کے ایک بڑے رہنما مولانا محمد علی جوہر نے جامع مسجد دہلی میں کہا تھا کہ کون ہے جو ہندوؤں کے جہاد پر لگائے گئے الزامات کا جواب دے؟ پھر ایک 22 سالہ نوجوان سید مودودیؒ نے الجہاد فی الاسلام نامی کتاب لکھ کر ان کی اس خواہش کو پورا کیا۔ میرے راستے میں کشمیری گیٹ بھی آیا، جسے خونی گیٹ بھی کہتے ہیں۔ اس گیٹ کے آس پاس انگریزوں نے اپنے ہندوستانی سپاہیوں کی مدد سے ہزاروں لوگوں کو قطار میں کھڑا کر کے شہید کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جنگ آزادی کے بعد دلی کے گردونواح میں 25 ہزار سے زائد لوگوں کو شہید کیا گیا۔ اس وقت انگریزوں نے مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی تمیز نہیں کی تھی۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے انگریزوں اور اُن کی فوج میں شامل سکھوں، مسلمانوں اور ہندو سپاہیوں کو صرف ایک رسی اور کسی درخت کی شاخ درکار ہوتی تھی۔ کسی بھی شخص کو شک کی بنا پر پکڑتے، گلے میں رسی ڈالتے اور کسی بھی درخت پر لٹکا دیتے۔ وہ لوگ خود ہی مدعی، خود ہی منصف اور خود ہی جلاد ہوتے تھے۔

میں انھی سوچوں میں گم دلی کے بازاروں میں گھومتا رہا اور سوچتا رہا وہ کون ہے جس نے دلی کو بخشا ہو؟

دلی کا حسن ہی اس کا قاتل ٹھہرا

امیر تیمور، نادر شاہ اور احمد شاہ درانی نے بھی اسے معاف نہیں کیا۔ انگریز بھی اس کا قلع قمع کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، سب ہی اپنی باری پر آئے۔ اس سب کے باوجود دلی آج بھی موجود ہے۔ دلی کا ایک بڑا احسان کہ یہاں پر اردو زبان کی آبیاری ہے، وہ اردو جو آج پوری دنیا میں بولی جاتی ہے اور اپنی ایک خاص پہچان رکھتی ہے۔ دلی کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہاں اتنا ہی کافی جو میر تقی میر نے کہا تھا۔؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پوُرب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

ماڈل ٹاؤن لاہور: جو ایک ہندو خاندان کو اب تک یاد ہے

بھارت جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایسی کمپنی تلاش کی جائے جو ویسٹ واٹر کا ٹریٹمنٹ کر سکے یعنی انڈسٹری سے نکلنے والے آلودہ پانی کو پروسس کرے اور اسے اس قابل بنائے کہ وہ دریا میں ڈالا جا سکے۔ اس سلسلے میں میرا کچھ لوگوں سے رابطہ ہوا، ان میں ایک ہائی ٹیک پاور کمپنی بھی تھی۔ جب ان سے میرا رابطہ ہوا تو انھوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کی پاکستان سے میں پہلا شخص تھا جس نے ان سے رابطہ کیا تھا۔ جب انھیں یہ پتا لگا کہ میں لاہور سے ہوں تو انھوں نے زور دے کر کہا کہ آپ ہر صورت ہمارے دفتر آئیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی محبت سے کیوں بلا رہے ہیں؟ بہر حال میں نے اسے ایک عام سی بات سمجھ کر اپنے ذہن میں رکھ لیا۔

اندرون دلی کی سیاحت سے فارغ ہونے اور بیرا جی سے اپنے معاملات طے کرنے کے بعد اگلے دن میں نے ان کے دفتر جانے کا پروگرام بنایا۔ جب میں نے ان سے رابطہ کیا تو

کمپنی کے مالک راکیش گپتا صاحب نے مجھے لینے کے لیے گاڑی بھجوادی۔ اس طرح سے میں ان کے دفتر چلا گیا۔

جب میں ان کے دفتر میں گیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ تو ایک بہت ہی بڑی کمپنی ہے جو پورے بھارت میں بڑے پاور پلانٹس کی کنسلٹنسی کے ساتھ ساتھ ان کی تعمیر بھی کرتی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس دفتر میں سو سے زیادہ لوگ کام کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بے حد مرعوب ہو گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی چھوٹی سی کمپنی ہے لیکن یہاں تو معاملات بالکل ہی مختلف تھے۔ راکیش گپتا صاحب کسی میٹنگ میں مصروف تھے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک میں فارغ نہیں ہو جاتا، آپ ہمارے سب سے سینئر منیجر ڈاکٹر ادارش سے میٹنگ کر لیں۔

ڈاکٹر ادارش ان دلچسپ لوگوں میں سے ہیں جن سے زندگی میں میری ایک ہی ملاقات ہوئی اور وہ بھی ناقابل فراموش۔ ڈاکٹر ادارش ستر سال کی عمر کے ایک منجھے ہوئے نہایت ہی عقلمند اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ انھوں نے ایم آئی ٹی امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی تھی۔ اب وہ امریکہ کی کچھ فرمز کے ساتھ مل کر بھارت میں لگنے والے پاور پلانٹس کی کنسلٹنسی کرتے ہیں۔

آپ کو ایسے بے شمار لوگ مل جائیں گے جن کی اسی طرح کی تعلیم ہو گی اور کام بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے لیکن ڈاکٹر ادارش ایک مختلف شخصیت کے مالک تھے۔ میرے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد انھوں نے جیب سے ایک ڈبیہ نکالی جس میں کوئی دو انچ لمبائی اور چوڑائی کے باریک کاغذ تھے۔ پھر دوسری ڈبیہ نکالی جس میں تمباکو تھا۔ میرے سامنے انھوں نے میز پر کاغذ بچھایا پھر اس کے اوپر تمباکو ڈالا، کاغذ کو رول کیا اور پھر اپنے لب سے اسے جوڑنے کے بعد سلگایا اور سگریٹ پینا شروع کر دی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی بھی سگریٹ بنا کر پینے والا یہ عمل نہیں دیکھا تھا۔

عام طور پر اس طرح کے اداروں میں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہوتی، اس لیے مجھے کچھ عجیب بھی لگا۔ انھیں بھی اس بات کا احساس ہوا کہ میں کچھ الگ محسوس کر رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے کہا کہ میرے سوا اس دفتر میں کوئی شخص سگریٹ نہیں پی سکتا اور یہ لوگ مجھے منع نہیں کر سکتے کیونکہ اگر انھوں نے مجھے سگریٹ پینے کی اجازت نہ دی تو میں ان کا دفتر چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور مجھے

چھوڑنا اس کمپنی کے لیے بہت بڑے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔ میں تمام کنسلٹنٹس کا ہیڈ ہوں اسی لیے راکیش گپتا صاحب میری اس بدتمیزی کو برداشت کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک عام سی بات تھی کچھ دفاتر میں ایسا کر لیا جاتا ہے۔ دلچسپی کی بات اگلی تھی جو انھوں نے مجھے بتائی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی بیوی کلکتہ کی رہنے والی ہے اور وہ دونوں شملہ سے آگے ایک جنگل میں تنہا رہتے ہیں، جہاں پر بجلی بھی نہیں ہے۔ رات کو ہمارے گھر کے پاس جنگلی جانوروں اور درندوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ وہاں ایک انتہائی قدرتی ماحول ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ جس طرح اُس جنگل میں جانور رہ رہے ہیں اسی طرح سے ہم بھی اس جنگل میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری خوراک میں کوئی بھی چیز شہر سے نہیں آتی۔ ہم اپنا سب کچھ خود اگاتے ہیں۔ ہم گوشت نہیں کھاتے۔ جنگل کے اندر بے شمار پھل اور سبزیاں ہیں۔ میں اکثر اوقات گھر پر ہی رہتا ہوں اور وہیں بیٹھ کر اپنی سٹڈی اور اپنا کام کرتا ہوں۔ پندرہ دن کے بعد دو دن کے لیے شہر آتا ہوں اور پھر واپس چلا جاتا ہوں۔

جب وہ یہ باتیں بتا رہے تھے تو میں بڑے غور سے انھیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایک شخص جو ایم آئی ٹی امریکہ سے پڑھ کر آیا اور اتنی بڑی کمپنی کا ایک سینئر فرد بھی ہو اس کی بیوی بھی ہزاروں میل دور کلکتہ سے آئی ہو اور یہ دونوں جنگل میں رہ رہے ہوں۔ انھوں نے قدرتی ماحول میں اپنی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیوں کر کیا ہوگا؟ میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشتاق جی، چشموں کا صاف پانی، پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوا، خالص قدرتی ماحول میں پیدا ہوئی سبزی اور پھل جن پر کسی طرح کا کوئی بھی کیمیکل نہ چھڑکا گیا ہو، نہ ہی کھاد استعمال کی گئی ہو جب یہ سب کچھ میسر ہو تو اس سے بہتر زندگی کیا ہوگی؟ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے اس لیے بچوں کی کوئی فکر نہیں۔ میں مناسب پیسے کما لیتا ہوں۔ تھوڑا کھا لیتے ہیں، بہت سا بچ جاتا ہے۔ مجھے اور میری بیوی کو پڑھنے پڑھانے کا بہت شوق ہے۔ ہم اُس جگہ پر بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں اور کتابیں لکھتے ہیں۔

میری بیوی نے نیٹروپیتھی میں ماسٹرز کیا ہوا ہے اُسے نت نئی جڑی بوٹیوں کی تلاش رہتی

ہے۔جنگل میں اُس کا یہ شوق بھی پورا ہو جاتا ہے۔ہمارے اردگرد بے شمار پرندے اور جانور پھرتے رہتے ہیں جو کہ ہمیں اپنا ہی حصہ سمجھتے ہیں۔اس طرح ہم ایک قدرتی ماحول میں زندگی بسر کررہے ہیں جسے ہرلحاظ سے ایک پرسکون زندگی کہا جاسکتا ہے۔اس وقت میری عمر 70 سال ہے اور میں اب تک کسی بھی بیماری کا شکار نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی دوائی کھاتا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا ایسا ہی رہوں گا۔

آخر میں انھوں نے مجھے بتایا کہ مشتاق جی اگرآپ زیادہ دیر جنگل میں نہیں رہ سکتے تو کم از کم مہینے میں ایک دن قدرتی ماحول میں زندگی ضرور گزاریں۔قدرتی کھانے کھائیں،شہر کے ہنگاموں سے دور رہیں۔یقیناً یہ سب آپ کی ذہنی اور جسمانی صلاحیت کے لیے بے حد مفید ہوگا۔میں ایسا تو نہ کرسکا لیکن زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ایک آدھ دن کے لیے گاؤں چلا گیا جہاں جنگل جیسا ماحول تو نہیں ہوتا لیکن بہرحال شہر سے مختلف ضرور ہوتا ہے۔یہ تھے ڈاکٹر ادارش جو مجھے اب تک یاد ہیں۔ کچھ ہی دیر میں راکیش گپتا صاحب بھی تشریف لے آئے اور مجھے اپنے دفتر لے گئے۔انھوں نے غیر معمولی طور پر میری خاطر مدارات کی اور مجھ سے لاہور کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

میں نے محسوس کیا کہ جب بھی لاہور کی بات ہوتی ہے تو وہ تھوڑے سے جذباتی ہوجاتے ہیں ۔فوری طور پر مجھے اس رویے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔وہ مجھ سے لاہور کے متعلق بے شمار باتیں پوچھتے رہے،خاص طور پر ماڈل ٹاؤن کے متعلق ان کی دلچسپی کچھ زیادہ ہی تھی۔آخر میں پوچھنے لگے آج شام کی کیا مصروفیت ہے؟ میں نے بتایا کہ ابھی مجھے ایک دوجگہ جانا ہے اور پھر چار بجے تک میں اپنے ہوٹل آجاؤں گا۔آپ بتائیے کیا پروگرام ہے؟ انھوں نے کہا کہ آج شام کوآپ کو میرے گھر آنا ہوگا۔مجھے تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی کہ یہ اتنا بڑا آدمی ہے اور اس کا اتنا ہی بڑا گھر ہوگا لیکن مجھے اتنی محبت سے اپنے گھر کیوں بلا رہے ہیں جبکہ میرا ان سے کوئی پرانا تعلق بھی نہیں ہے۔میرے اندر ایک انجانا سا خوف بڑھتا جارہا تھا لیکن میں انکار بھی نہ کرسکا۔میں نے ان سے کہا کہ میں چار بجے ہوٹل میں تیار رہوں گا۔آپ کسی کو بھجوادیں تو میں آپ کے گھر آجاؤں گا۔

ایک عمر رسیدہ ہندو خاتون: جس کے دل میں اب تک ماڈل ٹاؤن بستا ہے

شام چار بجے کے قریب میں ان کی طرف سے بھیجے گئے آدمی کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ وہ ایک بہت ہی بڑا گھر تھا جیسے ہر امیر آدمی کا ہوتا ہے۔ ذہن میں کئی خدشات لیے میں ان کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس دوران میں ان کا بیٹا جس کا نام موہن تھا (جو کوئی بیس سال کی عمر کا ایک نوجوان تھا) آ گیا اور اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ موہن بھی ایک دلچسپ لڑکا تھا، اس سے پہلے کہ ہم ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے وہ مجھے اپنا گھر دکھانے کے لیے لے گیا۔ اس نے مجھے بہت سارے کمرے دکھائے، اس وقت اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ موہن کی ایک دلچسپ بات، جو آپ کو بھی دلچسپ لگے گی، اس سے پہلے اور اس کے بعد کہیں نہیں دیکھی۔

موہن نے مجھے بتایا کہ اسے ٹھنڈ بہت پسند ہے جبکہ دلی میں گرمی ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے بیڈروم میں دو اے سی لگائے ہوئے ہیں۔ جب میں اس کمرے میں گیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی برفانی علاقے میں آ گیا ہوں۔ موہن نے بتایا کہ یہ دونوں اے سی پوری گرمیاں بند نہیں ہوتے اور سارا دن چلتے رہتے ہیں۔ جب میں رات کو اس کمرے میں آتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی برفانی علاقے میں آ گیا ہوں۔ یہ میرا ایک انوکھا شوق ہے اور ڈیڈ کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہے۔ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ یہ فضول خرچی ہے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں اس لیے وہ مجھے منع نہیں کرتے۔

گھر کی سیر کے بعد ہم نیچے فیملی روم میں آ گئے جہاں ان کی فیملی کی بے شمار تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی تک میری حیرانی دور نہیں ہوئی تھی اور مجھے سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ میرے ساتھ یہ خصوصی سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟

اتنی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک خاتون، جن کی عمر ستر پچھتر سال کے قریب ہو گی لیکن وہ بہت صحت مند تھیں، انھوں نے بڑی اچھی ڈریسنگ کی ہوئی تھی وہ اپنی وہیل چیئر پر کمرے میں آ گئیں۔ ان کے احترام میں ہم سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سب نے انھیں سلام کیا میں نے بھی سلام کیا اور پھر ہم سب دوبارہ بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب آگے بات کیسے بڑھائی جائے؟ کچھ وقت گزرا تو میں نے محسوس کیا کہ بوڑھی اماں کی آنکھوں میں

آنسو ہیں اور وہ ان کو اپنے پلو سے پوچھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میری حیرانی مزید بڑھ گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے؟

کچھ دیر بعد انھوں نے ایک گہری سانس لی اور مجھے کہنے لگیں کہ آج مجھے پچاس سال پرانی بات یاد آ رہی ہے۔ اسی لیے جب مجھے پتہ چلا کہ کوئی لاہور سے آ رہا ہے تو میں نے راکیش سے کہا کہ اسے گھر لے کر آنا۔ آپ نے ہماری دعوت قبول کی، میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے جو بات شروع کی وہ اب تک جاری ہے اور مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے کان ابھی بھی ان کے کہے ہوئے الفاظ سن رہے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ میرے میاں ڈنڈوت سیمنٹ پلانٹ میں منیجر تھے جو انگریزوں کی ملکیت تھا۔ ہم ماڈل ٹاؤن لاہور میں رہائش پذیر تھے، گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارا دفتر شملہ منتقل ہو جاتا اور ہم چار ماہ شملہ میں رہتے تھے۔ ہم صدیوں سے لاہور کے رہنے والے تھے۔ پہلے ہم اندرون لاہور رہتے تھے لیکن جب ماڈل ٹاؤن آباد ہوا تو ہم ان لوگوں میں سے تھے جو سب سے پہلے آ کر ماڈل ٹاؤن میں آباد ہوئے تھے۔ ہمارا تعلق کشمیر سے تھا ہم کشمیری برہمن نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری اور میرے میاں کی تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ شادی کے بعد میں اپنے میاں کے ساتھ ماڈل ٹاؤن آ گئی۔ ہمارا بڑا سا گھر تھا۔ ہمارے گھر کی کوئی چار دیواری نہیں تھی اور ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ ہم ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔

یہ کہتے وہ رک گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد بولیں کہ راکیش نے پہلا قدم ماڈل ٹاؤن میں ہی اٹھایا تھا۔ اس کے چلنے کی خوشی میں ہم نے ایک دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد آزادیِ ہند کی بات ہونے لگی۔ ہمارا تو سب کچھ ہی لاہور تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوگا؟ آزادیِ ہند تک تو بات ہماری سمجھ میں آتی تھی لیکن اس سے آگے کیا ہوگا یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی؟

پھر ایک دن پتہ چلا کہ قتل و غارت شروع ہو گئی ہے، ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں کو ہندوستان میں قتل کیا جا رہا ہے۔ جب ان کی لاشیں لاہور سٹیشن پر آئیں تو یہاں بھی لوگوں کو غصہ آیا اور انھوں نے یہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ لوگ جان بچا کر بھاگ

رہے ہیں ۔انھی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے پرانے محلے ، (اندرون شہر میں جہاں ہندو اکثریت میں رہتے تھے) کا پانی بند کر دیا گیا ہے۔ ہندو اکثریت کے علاقے کرشن نگر میں بھی قتل و غارت شروع ہوگئی ہے اور یہ بات بڑھتی ہی چلی گئی ۔ چند دن پہلے ہم راکیش کے پہلا قدم اٹھانے کی خوشی منا رہے تھے اور اب یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ راکیش کو بچائیں گے کیسے؟

اردگرد کے حالات کو دیکھ کر صاف نظر آ رہا تھا کہ لاہور میں رہنے والے تمام ہندوؤں اور سکھوں کو اس علاقے میں جانا ہوگا جو آزادیِ ہند کے بعد بھارت کا حصہ بن گیا ہے۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ ایک گاڑی ہندوؤں اور سکھوں کو لے کر بھارت جائے گی لیکن سٹیشن تک کیسے جایا جائے گا؟ یہ بہت بڑا سوال تھا۔انھوں نے مجھ سے کہا کہ مشتاق بیٹا میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ کتنا خوف تھا؟ کئی دن تک ہمارے گھر میں کوئی کھانا نہیں بنا، بس ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔خبریں سنتے تھے تو خوف میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔

ماڈل ٹاؤن میں ہمارے ساتھ والے بلاک میں ایک خاتون رہتی تھیں، جنھیں ہم مسز خان کہتے تھے۔ وہ ایک امیر عورت تھی ان کے گھر میں کئی گاڑیاں بھی تھیں اور وہ کافی اثر ورسوخ والے لوگ تھے۔ ہمارا ان کی طرف آنا جانا بھی تھا۔اس خوف کے عالم میں جب کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی تو ایک دن اوپر والے نے کرم کیا اور مسز خاں ہمارے گھر آئیں اور انھوں نے ہمیں حوصلہ دیا۔لیکن صرف حوصلے سے تو مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال ایک امید ضرور پیدا ہوگئی۔

مسز خان نے ہمیں کہہ رکھا تھا کہ آپ ہر وقت تیار رہیں، میں کسی بھی وقت آپ کو لے کر ریلوے سٹیشن چھوڑنے کے لیے آ سکتی ہوں۔ہم نے تیار کیا ہونا تھا۔ کچھ قیمتی سامان ہم نے ایک بیگ میں رکھ لیا۔ایک ہی بیٹا تھا، وہی ہماری سب سے بڑی متاع تھی۔ہم دونوں میاں بیوی ہر وقت ایک کونے میں بیٹھے رہتے اور مسز خان کا انتظار کرتے۔ہمیں ہر آہٹ پر ان کی آمد کا گماں گزرتا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا، جب ہمیں کسی نے بہت آہستہ سے آواز دی، رات کا پچھلا پہر تھا۔ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے گھر پر آخری نظر ڈالی اور باہر تاریکی میں کھڑی کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ مسز خان ہم تینوں کو رات کی تاریکی میں ماڈل ٹاؤن سے سٹیشن تک لے آئیں۔مسز خان نے ہمیں

یہ بتایا کہ وہ صبح سے اب تک دس خاندانوں کو ماڈل ٹاؤن سے سٹیشن پہنچا چکی ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہم رات کے اندھیرے میں ایک ٹرین میں بیٹھ کر بھارت کی طرف روانہ ہو گئے۔۔۔

اور میں رات کی تاریکی کی وجہ سے لاہور کو آخری مرتبہ جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکی۔ بھارت آنے کے بعد باوجود شدید خواہش کے، کبھی لاہور جانا نہیں ہوا۔

جب ہماری گاڑی چلی تو اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی ہندوستان کی طرف سے آکر رکی ہے۔ اس میں بے شمار لوگ زخمی حالت میں تھے اور لاشوں کے انبار بھی نظر آرہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں جن کو ہندوؤں اور سکھوں نے بھارت میں قتل اور زخمی کیا تھا۔ جو لوگ بھارت جا رہے تھے وہ بھی زخمی اور جو آرہے تھے وہ بھی بدحال۔ ہم انتہائی کسمپرسی کی حالت میں بھارت آگئے۔ ہم یہاں کئی سال عارضی رہائش گاہوں میں رہے۔ وہ زندگی کے اتنے مشکل دن تھے کہ ہم زندگی میں اٹھائی ہوئی ہر آسائش کو بھول گئے۔

بھارت آنے کے بعد ہمارا مسز خان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ آج آپ آئے تو مجھے مسز خان بھی یاد آئیں اور ہمارے وہ ہمسائے بھی یاد آئے جو سٹیشن تک آتے ہوئے قتل کر دیے گئے تھے۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں اپنی ماں سے ان کی ہجرت کی داستان سن رہا ہوں کہ وہ کس طرح سے ہندوستان سے پیدل قصور پہنچیں اور تیرہ سال کی عمر میں کئی سو میل کا پیدل سفر اپنے خاندان کے ساتھ طے کیا۔ میری والدہ کے خاندان کے کتنے ہی لوگ قتل کیے گئے اور کتنے ہی اغوا کیے گئے۔ ان کی تعداد کتنی تھی؟۔۔۔

جب کوئی چیز ان گنت ہو تو اسے گنا کیسے جا سکتا ہے؟۔۔۔ وہ تو ان کے اپنے خونی رشتہ دار تھے جن کو گننے کا حوصلہ بھی کسی میں نہ تھا۔

مجھے یہ بھی یادِ آیا کہ میری والدہ اور ان کا خاندان کس طرح ایک سال سے سے زائد عرصہ تک سکھ بن کر اور اپنے گھروں میں چھپ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ ان کو بھی ایک "مسز خاں" نے پناہ دی تھی۔ میری والدہ کے خاندان کو بچانے والے محسن کا نام سردار دلیر سنگھ کھروڑ تھا جو میری والدہ کے گاؤں کا نمبردار تھا۔۔۔

دونوں طرف مارنے والے بھی تھے اور بچانے والے بھی ۔۔۔کوئی مسز خان تھا اور کوئی دلیر سنگھ۔۔۔

دردتو درد ہی ہوتا ہے وہ کسی کا بھی ہو، بات تو صرف محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اماں جی نے بہت ساری باتیں کیں۔ میں پوری توجہ سے سنتا رہا اور جب وہ تھک کر جانے لگیں تو میرا سر چوم کر کہا کہ لاہور جا کر مسز خاں کو ڈھونڈ نا اور مل جائیں تو میرا سلام کہنا۔۔۔کہنا کہ ایک خاندان آپ کے احسان کا اب تک شکر گزار ہے۔۔۔

اب مجھ میں مزید باتیں سننے کی ہمت باقی نہ تھی۔۔۔بھیگی آنکھوں کے ساتھ چائے کی آدھی پیالی چھوڑ کر میں نے رخصت چاہی۔۔۔گفتگو کا یہ سلسلہ پچھلے پچیس سال سے چل رہا ہے۔۔۔لگتا ہے کہ گفتگو ابھی ادھوری ہے۔۔۔نہ جانے کب بات دوبارہ شروع ہو جائے۔۔۔

میں نے ماڈل ٹاؤن میں رہنے والے اپنے ایک دوست (جن کا نام یوسف خان تھا) سے مسز خاں کے بارے میں پوچھا۔انھوں نے بتایا کہ ہم نے بھی ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ایک عظیم خاتون تھیں جنھوں نے بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کو سٹیشن پر پہنچایا تھا لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔مدت ہوئی وہ اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔۔۔اللہ ان کی روح کو سکون عطا فرمائے۔۔آمین۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ یہ سفر نامہ ایک درد نامے میں تبدیل ہو گیا۔۔۔لیکن ایسا ہی ہوا۔۔۔ یہ ایک حقیقت ہے۔۔۔اس کا ذکر ضروری تھا تا کہ راکیش اور مشتاق کو یاد رہے کہ ان کے بڑوں پر کیا بیتی۔۔۔ یہ ہم سب کی خواہش ہے آیندہ ایسا نہ ہو!

❁ ❁ ❁

بہائی ایک مذہبی فرقہ اور جماعت اسلامی ہند و لکھنؤ کے امیر جماعت اسلامی

بہائی مذہب کی بنیاد 19 ویں صدی کے وسط میں مرزا حسیان علی نوری نے رکھی تھی، جسے بہا اللہ (خدا کی شان) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہائی عقیدے کے لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ بہا اللہ اور اس کا پیش رو خدا کے مظہر تھے۔ اس مذہب کے مطابق، تمام مذاہب اور انسانیت کا اتحاد ہونا نہایت ضروری ہے۔ بہائی انسانیت کی یکجہتی پر یقین رکھتے ہیں اور نسلی، طبقاتی اور مذہبی تعصّبات کے خاتمے کے لیے خود کو وقف کرتے ہیں۔ بہائی کی تعلیمات کا بہت بڑا حصہ معاشرتی اخلاقیات سے وابستہ ہے۔ ان کی تعداد پوری دنیا میں پچاس لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے۔

پاکستان میں بہائی عقیدے کا آغاز آزادیِ ہند سے پہلے ہو گیا تھا۔ شیخ سعید ہندی (جو ملتان سے تھے) پاکستان میں اس فرقے کے بانی مانے جاتے ہیں۔ ان کے بانی کا کہنا ہے کہ انسانی اتحاد میں اتنی طاقت ہے کہ یہ پوری دنیا کو روشن کر سکتی ہے۔

بہائیوں نے 1986ء میں دہلی کے اندر اپنی ایک عبادت گاہ بنائی جس کا نام اس کے ڈیزائن کی وجہ سے لوٹس ٹیمپل، یعنی کنول کا پھول رکھا گیا۔ اگر آپ نئی دہلی سے جنوب کی طرف چلیں تو پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار والے علاقے کے بعد یہ عمارت موجود ہے۔ ایک وسیع و عریض میدان کے درمیان میں یہ ایک بہت بڑی عمارت ہے جو پنکھڑیوں کی شکل کی ہے اور اس کے اردگرد باغیچے اور لان ہیں۔

اس عبادت گاہ کی دو انفرادی خصوصیات ہیں ۔ پہلی خصوصیت اس عمارت کا ڈیزائن ہے جسے کنول کے پھول کی طرح بنایا گیا ہے۔ اس کی 23 مختلف پنکھڑیاں ہیں اور ان کے تین سیٹ بنائے گئے۔ اس عمارت کی اونچائی 40 میٹر ہے۔ مرکزی ہال کا فرش بھی یونانی سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ اس جگہ کا کل رقبہ 126 ایکڑ ہے۔ دوسری اہم بات اس عمارت کی یہ ہے کہ اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد آپ کو کسی بھی طرح کی گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ سب کو خاموش ہو کر بیٹھنا ہوتا ہے۔ یہ شاید بہائی لوگوں کے عبادت کرنے کا طریقہ ہے۔

میں نے اس عمارت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ میرے پاس تھوڑا سا وقت بھی تھا لہذا اس وقت کا استعمال کرتے ہوئے اس جگہ جانے کا فیصلہ کیا۔ جب میں لوٹس ٹیمپل پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی اور وہاں پر خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ میں عمارت کے مین ہال میں چلا گیا جو کہ خاصہ بڑا تھا۔ اس میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں، ہال میں اڑھائی ہزار لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

میں نے دیکھا کہ مختلف جگہوں پر لوگ بیٹھے تھے، نہ کوئی پڑھ رہا تھا، نہ کوئی تسبیح کر رہا تھا اور نا ہی کوئی بول رہا تھا۔ ہال میں اتنی خاموشی تھی کہ جس کا اندازہ کرنا انتہائی مشکل ہے۔ ایک تو یہ جگہ شہر سے دور ہے، دوسرا اس کے ارد گرد دور دور تک ٹریفک نہیں ہے، کوئی بھی گاڑی اس عمارت کے قریب نہیں آتی۔ لگتا ہے کہ یہاں پر خاموشی ہی عبادت سمجھی جاتی ہے۔ میں بڑی دیر تک لوگوں کو دیکھتا رہا، اکثر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے اور مسلسل کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ شاید یہ بھی ایک طرح کا نفسیاتی علاج ہوتا ہوگا۔ ایسی صورتِ حال میں لوگوں کو اپنے آپ کے متعلق سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ میں بھی وہاں پر چلا گیا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ جب آپ کے سامنے بہت ہی خوب صورت عمارت ہو جس کی کسی بھی دیوار پر کوئی تحریر نہ ہو اور نہ ہی کوئی تصویر، ایسی صورت میں آپ خاموشی سے بیٹھیں تو لازمی بات ہے کہ آپ کو بھی بہت کچھ سوچنے کو ملتا ہے۔ جب میں ہال میں چپ چاپ بیٹھا تھا تو مجھے یاد آیا کہ جب پہلی مرتبہ میں عمرے کے لیے مکہ شریف جا رہا تھا تو میرے ایک دوست ڈاکٹر عبدالمتین نے (وہ لیفٹ کے بڑے نظریاتی لیڈر تھے اور اس کے ساتھ

ساتھ کیمیکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کی ہوئی تھی اور پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر بھی تھے) مجھ سے یہ کہا کہ جب تم خانہ کعبہ جاؤ تو کسی کونے میں بیٹھ کر اللہ کے گھر کو دیکھنا اور اللہ سے باتیں کرنا۔ جو آپ کے دل میں آئے وہ کہنا، جو مانگنا چاہو وہ مانگنا، جو گلہ شکوہ ہو وہ بھی کرنا لیکن یہ سب کچھ اپنے دل میں کہنا، آواز نہ نکلے، تمھیں جواب ملے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ میرا یقین ہے کہ اللہ تمہاری باتوں کا جواب دے گا اور تم اسے محسوس بھی کرو گے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور ایک خوب صورت تجربے سے گزرا، ایسا کرنے سے ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی، جواب تک یاد ہے۔

اس ٹیمپل میں آکر بھی مجھے یوں لگا کہ اس مذہب کے ماننے والوں نے خاموشی سے اپنے خدا سے باتیں کرنے کے لیے یہ ٹیمپل بنایا ہے۔ ہر مذہب میں خدا کا تصور موجود ہے کیونکہ یہ مذہب کی بنیاد ہے۔ خدا کا تصور کیسا ہے اس میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن خدا کے تصور کے بغیر کوئی مذہب نہیں ہوسکتا۔ مذہب کی بنیاد ہی یہ ہے کہ کسی ان دیکھی طاقت کو ماننا اور اس پر یقین کرنا۔

میرے لیے یہ تجربہ انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد منفرد بھی تھا۔ ٹیمپل میں دیواروں پر اسلام اور عیسائیت کے علاوہ بھی کئی اور مذاہب کے مقدس مقامات کی تصاویر لگی ہوئی تھیں جو اس بات کو ظاہر کرتی تھیں کی اس مذہب کے ماننے والے دیگر مذاہب کا بھی احترام کرتے ہیں۔

آپ خاموش بھی ایک خاص وقت تک ہی رہ سکتے ہیں۔ خاموش رہنے کا یہ تجربہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ میں اب بھی کبھی کبھار یہ تجربہ کرتا ہوں جس سے بڑا روحانی سکون ملتا ہے۔۔۔ آپ بھی کر کے دیکھیں۔۔۔

بہائی لوگوں کے متعلق مزید جاننے کے لیے Warburg Margit کی کتاب

Citizens of the World: A History and Sociology of the Baha'is from a Globalisation Perspective

بہت مفید ہے۔

بہائیوں کے ٹیمپل کے بعد میری اگلی منزل جماعت اسلامی ہند کا دفتر تھا۔ وہ دفتر دریائے

جمنا کے پاس ابوالفضل انکلیو میں واقع تھا۔ میں نے کسی سے ان کا پتہ لیا اور ان کے دفتر چلا گیا۔ جماعت اسلامی ہند کا دفتر ایک انتہائی سادہ عمارت میں واقع تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ دفتر لمبائی میں زیادہ تھا اور چوڑائی میں کم تھا۔ زیادہ تر لوگ ایک بڑے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جماعت اسلامی ہند کے امیر دفتر میں موجود نہیں تھے۔ میں نے استقبالیے پر ایک صاحب کو اپنا تعارف کروایا۔ انھوں نے مجھے جماعت اسلامی کے شعبہ نشر و اشاعت کے ایک ذمہ دار کے پاس بھجوا دیا۔ میں ان صاحب کے پاس کافی دیر بیٹھا رہا۔ اس وقت وہاں پر جماعت اسلامی لکھنؤ کے امیر بھی تشریف فرما تھے۔

امیر صاحب بہت ہی شائستہ اردو میں بات کر رہے تھے۔ ان کی عمر ستر سال سے زائد تھی، سفید چمکتا ہوا رنگ اور سفید ڈاڑھی کے ساتھ بڑی ہی پیاری اور وضع دار شخصیت کے مالک تھے جس نے مجھے پہلی ہی نظر میں ان کا گرویدہ بنا دیا۔ یہ میرا کسی بھی لکھنو کے فرد کے ساتھ پہلا براہ راست رابطہ تھا۔ یاد رہے جماعت اسلامی کا قیام 1941ء میں لاہور میں عمل میں آیا تھا۔ آزادیِ ہند کے بعد 1948ء میں جماعت اسلامی ہند کے نام سے جماعت اسلامی کا نیا تنظیمی ڈھانچہ بنایا گیا اور اس کے دستور میں بھی ضروری ترامیم کی گئیں۔

شعبہ نشر و اشاعت کے انچارج نے مجھے بتایا کہ اس وقت ہم تین شعبہ جات میں کام کر رہے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا شعبہ جو سب سے زیادہ متحرک بھی ہے وہ دعوت کا شعبہ ہے۔ ہم خاص طور پر غریبوں میں کام کرتے ہیں اور انھیں دائرہ اسلام میں بھی داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے بھی دعوت کا کام جاری ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہمارا دوسرا شعبہ تعلیم کا شعبہ ہے۔ ہمارے سکولوں کے ساتھ ساتھ مدارس بھی ہیں اور تعلیم کے دیگر شعبوں میں بھی ہم خاصے متحرک ہیں۔ ہم یہ کام بہت بڑی تعداد میں تو نہیں کر پا رہے لیکن جتنا بھی ہم سے ممکن ہو پاتا ہے، وہ ہم کرتے ہیں۔ تعلیم کا کام ہم مسلمانوں سمیت سب لوگوں کے لیے کرتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ان کا تیسرا شعبہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام ہے۔ اس کام کے

لیے مختلف علاقوں میں مختلف تنظیمیں کام کرتی ہیں ۔ مرکزی تنظیم کا نام ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن ہے۔ ملک میں کسی بھی مسئلے کی صورت میں ہم آگے بڑھ کر ریلیف کا کام کرتے ہیں ۔ اس میں بے شمار لوگ ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں ۔ ہمارے اس شعبے کو بھارتی معاشرے میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

جب میں نے ان سے یہ پوچھا کہ سیاسی طور پر ان کی حکمت عملی کیا ہوتی ہے؟ جواب میں انھوں نے بتایا کہ ہم اپنے معروضی حالات کے مطابق کسی ایک سیاسی جماعت کا ساتھ دیتے ہیں ۔ ہماری طاقت بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن ہمیں کسی نہ کسی کے ساتھ کھڑے تو ہونا ہی پڑتا ہے ۔البتہ ہم بین الاقوامی معاملات میں حکومت ہند کی پالیسی کو ہی فالو کرتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے بتایا کہ وہ نوجوانوں میں بھی کام کر رہے ہیں لیکن وہ کام بہت محدود پیمانے پر ہے۔

میں نے ہندو مسلم فسادات کے بارے میں ان سے پوچھا جس کے جواب میں انھوں نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ ہم ہر جگہ اس کی مذمت کرتے ہیں لیکن اکا دُکا ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنے کچھ رسالے بھی دکھائے جو وہ ہفتہ وار اور ماہانہ بنیادوں پر نکالتے ہیں۔ جماعت اسلامی لکھنؤ کے امیر صاحب سے میں کافی دیر باتیں کرتا رہا۔

میرا مقصد معلومات کے ساتھ ساتھ ایک خوب صورت اور خالص اردو سننا بھی تھا۔ میں ان کے اندازِ گفتگو سے تا دیر لطف اندوز ہوتا رہا۔ انھوں نے بھی مجھ سے جماعت اسلامی پاکستان کے بارے میں پوچھا تو جو میرے علم میں تھا میں نے انھیں بتایا۔ اُٹھنے سے پہلے ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے ایک سوال پوچھا کہ پچھلے دنوں لکھنؤ میں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں ان فسادات کا آغاز کون کرتا ہے؟ میرے اس سوال کے جواب میں وہ مسکرا دیے اور میں سمجھ گیا اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ان سے اجازت چاہی اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔

مقبرہ نصیر الدین محمد ہمایوں

آج کے دن میں نے دہلی میں موجود چند تاریخی مقامات پر جانے کا پروگرام بنایا۔ میری

پہلی منزل ہمایوں کا مقبرہ تھا۔ ہمایوں کا پورا نام نصیر الدین محمد ہمایوں ہے۔ آپ کی پیدائش 1508ء میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ بچپن میں سخت بیمار ہو گئے تھے۔ آپ کے والد، ظہیر الدین بابر نے، جو ہندوستان میں مغل سلطنت کے بانی ہیں، منت مانی کہ ان کی زندگی ان کے بیٹے کو لگ جائے۔ ظہیر الدین بابر بیمار ہو کر فوت گئے اور نصیر الدین محمد ہمایوں ٹھیک ہو گئے۔ کہانی اسی طرح سے مشہور ہے۔ ظہیر الدین بابر کی جلد موت کی وجہ سے بائیس سال کی عمر میں ہمایوں کو سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنا پڑی۔ بائیس سال کا ناتجربہ کار نوجوان اتنی بڑی سلطنت کو سنبھال نہ سکا۔

مغل فوج میں بہت سارے افغان جرنیل تھے، جن میں شیر شاہ سوری اور اس کا والد بھی شامل تھے۔ ان افغان سرداروں نے شیر شاہ سوری کی قیادت میں بغاوت کر دی اور بنگال سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ مغلوں کی پوری سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہندوستان سے مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

پندرہ سال تک ہمایوں اپنے چند سو ساتھیوں کے ہمراہ دلی چھوڑ کر سندھ، بلوچستان، افغانستان اور ایران کے علاقوں میں مایوس پھرتا رہا۔ پھر ایک وقت آیا جب ہمایوں نے مغلوں کے وفادار لوگوں کی فوج اور ایران کے حکمرانوں کی مدد سے شیر شاہ سوری کی موت کے بعد اس کے بیٹوں سے جنگ کر کے اپنی سلطنت واپس لے لی اور دلی واپس آ گیا اور مغل سلطنت کی نئے سرے سے شروعات کیں۔ اس دربدری کے دوران سندھ کے ایک عام سے قلعے میں جہاں ہمایوں نے پناہ لی ہوئی تھی، اکبر کی پیدائش ہوئی۔

میں آج اسی بادشاہ کے مقبرے پر جا رہا تھا جس نے نئے سرے سے مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ایک لحاظ سے ہمایوں کا مقبرہ وہ پہلی بڑی عمارت تھی جو مغلوں نے ہندوستان میں بنائی۔ اس عمارت کی تعمیر میں پہلی بار سرخ پتھر کا استعمال کیا گیا۔ یہ مقبرہ اور اس سے ملحقہ باغات، ہمایوں کی بیوی حاجن بیگہ بیگم نے اپنے شوہر کی یاد میں بنوائی تھی۔ پھر اس کے بعد بہت ساری بیگمات نے اپنے شوہروں اور بہت سارے شوہروں نے اپنی بیگمات کے مزارات بنوائے، جیسے لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ اس کی بیگم نے بنوایا۔ اسی طرح سے تاج محل، ممتاز محل کے خاوند شاہجہاں نے بنوایا

اور یوں مغلوں میں یہ رواج عام ہو گیا۔ مغلوں نے مقبرے کو صرف مقبرہ ہی نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے اردگرد اتنے خوب صورت باغات بنوائے کہ وہ باقاعدہ تفریحی مقامات بن گئے۔ ان میں سے تاج محل نے ایسی شہرت حاصل کی کہ وہ دنیا کے عجائبات میں شامل ہو گیا۔

اگر آپ کا لاہور میں موجود جہانگیر کے مقبرے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمایوں کا مقبرہ کیسا ہوگا؟ دونوں کے طرزِ تعمیر میں خاصی مماثلت ہے البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ ہمایوں کا مقبرہ اپنی وسعت کے اعتبار سے جہانگیر کے مقبرے سے زیادہ بڑا ہے۔

ہمایوں کا مقبرہ درگاہِ نظام الدین اولیا کے قریب واقع ہے۔ میں نے درگاہ جانے سے پہلے ہمایوں کے مقبرے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس علاقے میں ایک پرانا قلعہ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمایوں کی موت اسی قلعے میں ہوئی تھی اور اسی قلعے میں ہی انھیں دفنایا گیا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کیوں، ہمایوں کی میت موجودہ بھارتی پنجاب کے شہر سرہند لے جائی گئی اور انھیں وہاں دفنایا گیا۔ بعد میں جب یہ عمارت تعمیر ہو گئی تو ان کی میت کو سرہند سے لا کر اس مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اس مقبرے کی تعمیر اکبر کے دور میں ہوئی لیکن اس کی تعمیر کی تمام تر نگرانی ہمایوں کی بیوی حاجن بیگم نے کی اور اس کا خرچ بھی خود ہی برداشت کیا تھا۔

اس مقبرے سے ایک اور دلچسپ کہانی بھی جڑی ہوئی ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بہادر شاہ ظفر نے یہاں آ کر پناہ لی اور پھر یہیں سے ان کی گرفتاری بھی ہوئی۔ ان کے ساتھ جو بھی ظلم ہوئے وہ زیادہ تر اسی مقام پر ہوئے۔ اس جگہ کو مقبرہ کہنا درست نہیں ہے کیونکہ مقبرے میں تو کسی جگہ کے اوپر ایک قبر ہوتی ہے۔ یہ جگہ تو در حقیقت ایک وسیع باغ ہے جس کے اردگرد ایک اونچی چار دیواری ہے۔ باغ میں چاروں طرف پانی کے تالاب ہیں اور بے شمار فوارے موجود ہیں جو ہر وقت پانی ہوا میں اچھال رہے ہوتے ہیں۔ عام طور پر مقبرے عبرت کی جگہ ہوتے ہیں، لیکن یہ تو ایک تفریح کی جگہ ہے۔ یہاں پر لوگ فاتحہ خوانی کے لیے کم اور تفریح کے لیے زیادہ آتے ہیں۔ اگر میں اس جگہ کو ایک کمپلیکس کا نام دوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

انھی احساسات کے ساتھ میں اس عظیم عمارت کو دیکھنے چلا گیا۔ جب میں ایک بہت بڑے

گیٹ سے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ کئی سوفٹ کے فاصلے پر دوسرا بڑا گیٹ تھا۔ ان دونوں گیٹس کے درمیان ایک وسیع میدان تھا جس میں بے شمار درخت لگے ہوئے تھے۔ میرے خیال میں یہ جگہ ایک طرح سے پارکنگ اور استقبالیہ کے لیے بنائی گئی ہوگی۔ دوسرے بڑے گیٹ کے بعد ایک بہت بڑے میدان کے درمیان میں وہ عمارت تھی جہاں ہمایوں کی قبر کے علاوہ اور بھی کئی قبریں ہیں۔ دور سے دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ درمیان میں واقع عمارت مقبرہ نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی خوب صورت محل ہے۔ جس کے چاروں طرف سے آپ اندر جا سکتے ہیں۔ یہ عمارت ایک وسیع میدان کے درمیان میں بنائی گئی ہے۔ اس کے چاروں طرف خوب صورت باغ اور باغیچے انتہائی خوب صورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس عمارت کے آرکیٹیکٹ کا تعلق ایران سے تھا۔

یاد رہے کہ جب ہمایوں ایران سے واپس آیا تھا تو اس کے ساتھ بہت سے ایرانی آرکیٹیکٹ اور مختلف علوم کے ماہر بھی ساتھ آئے تھے۔ میرے خیال میں اسی دور میں ہندوستان کے اندر شیعہ مسلک کے لوگوں کا آنا جانا پہلے سے زیادہ ہوا اور ان کی مغل دربار تک رسائی ہوئی۔ ایران سے جو لوگ ہمایوں کے ساتھ آئے وہ عالم فاضل لوگ تھے اور مختلف علوم کے ماہر تھے۔ اس لیے وہ جلد ہی مغلوں کے قریب ہو گئے جس کی وجہ سے مغلوں کے معاملات پر ان کا گہرا اثر پڑا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعد ہندوستان میں شیعہ مسلک کی ترویج میں بے حد اضافہ ہوا۔

یہ بات بھی آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ آیت اللہ خمینی کے دادا کی پیدائش لکھنؤ کی ہے جو ریاست اودھ کی راجدھانی تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد اس علاقے میں کافی عرصے قبل آ کر آباد ہوئے تھے۔ ریاست اودھ کے حکمران شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے مسلک کے فروغ کے لیے ایرانی علما کو بلاتے رہتے تھے۔ خمینی صاحب کے آباؤ اجداد بھی اسی سلسلے میں ہندوستان آئے تھے۔

نہ جانے کیوں مجھے ان باغات، باغیچوں اور بلند و بالا عمارتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ میری دلچسپی ان عمارتوں سے جڑی داستانوں سے ہوتی ہے، البتہ میں اُن کاریگروں کے فن کی

تعریف ضرور کرتا ہوں جنھوں نے یہ کارنامے سرانجام دیے ہوتے ہیں۔ میں ان کے فن کی داد دیے بغیر نہیں رہتا۔ یہاں بھی میں نے ایسا ہی کیا۔

ایک کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے، مجھے گائیڈ نے بتایا کہ یہ وہ کمرہ ہے جہاں بہادر شاہ ظفر نے لال قلعے سے آکر پناہ لی اور وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کئی دن تک اس چھوٹے سے کمرے میں مقیم رہے۔ اب یہ کمرہ میرے لیے کمرہ نہیں رہا بلکہ تاریخ کا ایک گواہ بن گیا اور میں چشم تصور سے اس کمرے میں ایک تاریخی واقعہ دیکھتا رہا۔ جب ایک عظیم سلطنت کا سورج غروب ہو رہا تھا اور سات سمندر پار سے آکر انگریز قوم کا ایک نمائندہ ہڈسن، آخری مغل بادشاہ کو گرفتار کرتا ہے اور تھال میں اس کے بیٹوں کے سر پیش کرتا ہے۔

مجھے یہ بھی یاد آیا کہ جس کا یہ مقبرہ ہے حکومت چھن جانے کے باوجود اس نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ پندرہ سال تک ویران جنگلوں میں پھرتا رہا لیکن حوصلہ نہیں ہارا۔ پھر ایک دن اس نے اپنا کھویا ہوا تخت واپس لے لیا اور مغل سلطنت کو دوبارہ سے زندہ کیا۔ اس نے ان افغانوں کو شکست دی جو کبھی اس کے ملازم تھے اور بعد میں اس کے دشمن بن گئے۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شیر شاہ سوری ایک جنگ میں مارا جا چکا تھا اور اس کے بچوں میں اتنی بڑی سلطنت کو سنبھالنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ ہمایوں نے صرف تخت واپس ہی نہیں لیا بلکہ اس نے مغلیہ سلطنت کی نئے سرے سے بنیاد رکھی جو تین سو سال سے بھی زیادہ اس علاقے میں قائم رہی۔ اس دوران مغل حکمرانوں نے ہندوستان میں بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ کامیاب حکمرانوں میں چند نمایاں نام اکبر، جہانگیر، شاہ جہان، عالمگیر کے ہیں اور آخری حکمران بہادر شاہ ظفر تھا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں 1857ء میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

پھر ایک فارسی کہاوت کے مطابق

ہر کمالِ را زوالِ

ہمایوں کے ساتھ بدقسمتی یہ ہوئی کہ دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے بعد وہ صرف ایک سال تک زندہ رہا۔ یہ ایک قدرتی المیہ ہے۔ جس حکومت کو حاصل کرنے کے لیے اس نے پندرہ سال

جدوجہد کی، وہ اسے حاصل بھی ہوئی تو صرف ایک سال کے لیے۔ اس کی وفات کے بعد اکبر نے بھی سولہ سال کی عمر میں حکومت سنبھالی۔ یہ سب دیکھ کر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمایوں مغلوں کے لیے دوسرا بابر ثابت ہوا۔ ہمایوں کے پاس واپس اپنے آبائی شہر مرغانہ، ازبکستان جانے کا موقع تھا اور یہی شیر شاہ سوری کی خواہش بھی تھی لیکن ہمایوں نے دربدر ہونا تو پسند کیا لیکن ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کا نہ سوچا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شیر شاہ سوری مسلسل ہمایوں کا پیچھا کرتا رہا اور اس دوران وہ خوشاب تک آیا۔ اس کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس دوران بنگال میں اس کے خلاف بغاوت ہوگئی اور اسے واپس جانا پڑا، ورنہ وہ ہمایوں کو ہندوستان سے ضرور باہر کر دیتا۔ اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے خواب نے ہی اسے تباہ کیا۔

یہ کمپلیکس ہمایوں سے اس کی بیوی کی بے مثال محبت کی ایک نشانی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس مقبرے نے ہندوستان میں مغلوں کے ایک منفرد طرزِ تعمیر کی بنیاد رکھی۔ جو بعد میں ان کی پہچان بن گیا۔ ہمایوں کی بیگم نے اس کمپلیکس کی تعمیر کے لیے ایک ایرانی آرکیٹیکٹ مرزا غیاث کا انتخاب کیا۔ مرزا نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر اس کمپلیکس کو ڈیزائن کیا۔ یہ کمپلیکس 80 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس جگہ کے انتخاب میں دو باتیں پیشِ نظر رکھی گئیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے قریب دریا بہتا ہے اور دوسری درگاہِ نظام الدین اولیا کی قربت۔ اس کمپلیکس کے ایک کونے میں وہ جگہ اب بھی محفوظ ہے جہاں پر حضرت نظام الدین اولیا نے چلہ کاٹا تھا۔ یہ مغلوں کی مسلمان صوفیہ سے محبت کا ایک اظہار ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ مغلوں کی اکثر عمارتیں دریاؤں کے کنارے ہوتی ہیں جو ان کی دریاؤں سے محبت ظاہر کرتی ہیں۔

گائیڈ نے یہ بھی بتایا کہ مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد انگریزوں نے اس عمارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ کسی حد تک اسے سنبھالے رکھا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ مقبرہ نہیں تھا بلکہ ایک خوب صورت اور دیدہ زیب باغ کا ہونا تھا۔ گائیڈ نے اور بھی بہت ساری قبریں دکھائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہاں پر ایک سو سے زائد قبریں ہیں۔ جس سے مجھے لگتا ہے کہ اس کمپلیکس کی تعمیر کے بعد دلی میں مغل خاندان کا یہ شاہی قبرستان تھا۔

میں فاتحہ خوانی کے بعد مقبرے کی مین بلڈنگ سے باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور کمپلیکس بھی تھا جس میں ایک بہت ہی خوب صورت عمارت تھی۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ بھی ایک مقبرہ ہے اور اس میں دفن شخص کا نام عیسیٰ خان نیازی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ شیر شاہ سوری ایک افغان تھا۔ افغان اور مغلوں کی آپس میں بے شمار جنگیں بھی ہوئیں۔ پانی پت کی پہلی جنگ میں بھی ایک طرف لودھی اور دوسری طرف بابر تھا۔ اس طرح ہندوستان کی حکومت درحقیقت بابر نے افغانوں سے ہی چھینی تھی۔ عیسیٰ خان نیازی شیر شاہ سوری کے دربار کا اہم فرد تھا۔ اس کا مقبرہ بھی شیر شاہ سوری نے ہی بنوایا تھا۔ یہ عمارت بھی بے حد شاندار اور قابل دید ہے لیکن ہمایوں کے مقبرے کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے۔ یونیسکو (UNESCO WORLD HERITAGE) نے اس کمپلیکس کو ایک قومی ورثہ قرار دیا ہو۔ اس کی بہت سی معلومات ان کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ عیسیٰ خان نیازی کا تعلق میانوالی کے علاقے کالا باغ، عیسیٰ خیل میں بسنے والے نیازی قبیلے سے ہے۔ مجھے یقین تو نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کہیں پڑھا ہے کہ عیسیٰ خیل شہر کا نام بھی لودھی اور شیر شاہ سوری کے دربار سے تعلق رکھنے والے عیسیٰ خان نیازی کے نام پر ہی رکھا گیا ہے۔

میں کچھ دیر کے لیے دور ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور یہ دیکھتا رہا کہ میرے دائیں طرف ایک افغان اور میرے بائیں طرف وسطی ایشیا سے آنے والے تیمور کی اولاد کا ایک مغل ہے۔ دونوں کا ایک ہی مقصد تھا، ہندوستان پر حکومت کرنا۔ دونوں باری باری ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔ آٹھ سو سال کے طویل عرصے میں شمالی اور وسطی ہندوستان کے علاقے میں شاید ہی کسی مقامی فرد کو کبھی حکومت کرنے کا موقع ملا ہو۔ حکومت کرنے کا حق صرف مغلوں، ترکوں، غوریوں، غزنویوں یا پختونوں کا تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میرے خیال میں اس کی وجہ ان لوگوں کا جنگجوانہ رویہ تھا۔ یہ جنگجو دور دراز علاقوں سے آتے تھے۔ یہاں انھیں مذہبی یا قومی بنیاد پر کسی بھی طرح کی مقامی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ اس علاقے پر قابض ہو گئے اور ایک طویل عرصے تک حکمرانی کی۔

مقامی لوگوں کی ایک واضح اکثریت نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے اوران کے درباری بن بیٹھے۔ پھر ایک اور صاحب سات سمندر پار سے تشریف لاتے ہیں اور مغل حکمرانوں کو باہر نکال کر اپنی حکومت قائم کرتے ہیں، ان کو ہم انگریز صاحب بہادر کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ بھی چار سو سال تک ہندوستان میں رہا۔ اس نے اپنی حکومت کا آغاز چند تجارتی کوٹھیوں سے کیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ ہندوستان کے طول وعرض پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بالآخر پھر مقامی لوگوں نے جمہوری طریقے سے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیا اور آج اس خطے پر مقامی لوگ حکمران ہیں۔ بہت سے مقامی حکمرانوں کا تعلق بھی انھی سابقہ حکمرانوں کی نسلوں سے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان کا موجودہ حکمران؛ عمران خان نیازی بھی اسی عیسیٰ خان نیازی کی نسل سے ایک نیازی ہے۔ وہ کل بھی حکمران تھے، آج بھی ہیں اور حالات ایسے ہی رہے تو پرسوں بھی یہی حکمران ہوں گے۔

اب کافی وقت ہو گیا تھا اور میں ایک جدوجہد کرنے اور کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے والے بادشاہ کے مقبرے سے اس عظیم ہستی کے مقبرے کی طرف چل پڑا جس کی حکومت آج بھی بے شمار دلوں پر قائم ہے اور جن کا نام ہے خواجہ نظام الدین اولیار حمت اللہ علیہ۔

سید محمد نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی

سید محمد نظام الدین اولیا ان بزرگان دین میں سے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں اشاعت اسلام میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھیں محبوب الٰہی بھی کہا جاتا ہے۔ آپ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم آپ کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔ والد کی وفات کے بعد آپ کی والدہ آپ کو لے کر دلی آ گئیں۔ آپ جوانی میں بابا فرید الدین المعروف گنج شکر کے مرید ہو گئے اور ہر سال رمضان کے مہینے میں اجودھن، موجودہ پاکپتن آتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی ان کے مزار پر آتے ہیں اور ان سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

میں انھی عقیدت کے جذبات اور احساسات کے ساتھ ان کے مزار پر چلا گیا۔ ان کے مزار کو درگاہ کہتے ہیں۔ وہ علاقہ جہاں آپ کا مزار ہے، اسے بستی نظام الدین کہتے ہیں۔ یہ ایک بہت وسیع

علاقہ ہے۔تبلیغی جماعت کا مرکز بھی اسی علاقے میں ہے۔ یہاں پر دلی کی میٹرو اور ریل کا سٹیشن بھی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ ہم بمبئی سے دہلی آئے تھے تو ٹرین کا آخری سٹیشن بستی نظام الدین ہی تھا۔اس سے پہلے کہ میں آپ کو حضرت نظام الدین اولیا کی زندگی سے متعلق کچھ باتیں بتاؤں، میں چاہوں گا کہ درگاہ پر جانے والے واقعے کی کچھ تفصیل آپ کے سامنے رکھوں۔

جب میں بستی نظام الدین کے علاقے میں داخل ہوا اور وہاں کا ماحول دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ علاقہ ایک غربت زدہ علاقہ ہے۔گلیوں اور بازاروں کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ میں ایک نہایت ہی پسماندہ علاقے میں آ گیا ہوں۔ بہت سی تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا میں درگاہ کے مین گیٹ پر پہنچا۔ راستے میں صفائی ستھرائی کا نام ونشان نہیں تھا۔ یہ دہلی کا ایک مضافاتی علاقہ ہے لیکن اس کی دہلی سے کوئی نسبت نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب میں درگاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ کاریڈور میں بہت سے لوگ لیٹے ہوئے ہیں جن کی اکثریت نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ میں ان کے پاس سے بہت مشکل سے گزرا۔ایک چھوٹے سے صحن کے ایک طرف کمرے میں حضرت نظام الدین اولیا کی قبر مبارک ہے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ صحن میں دو تین جگہوں پر فربہ قسم کے لوگ مختلف ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے تھے۔انھوں نے اپنے سامنے ایک بڑا سا رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ جو آدمی بھی اندر آتا یہ اسے گھیر لیتے اور اس سے مطالبہ کرتے کہ ہم لوگ عرس کے موقع پر ایک بہت بڑی حلیم کی دیگ پکاتے ہیں آپ بھی اس میں اپنا حصہ ڈالیں اور بتائیں کتنے پیسے دیں گے تاکہ رجسٹر میں ہم آپ کا نام لکھیں۔ یہ ایک طرح سے زبردستی کا منظر تھا۔

میرے لیے یہ ایک عجیب بات تھی۔ جب میں نے ایک صاحب سے معذرت کی تو انھوں نے بہت ہی بُرا منایا۔ میں نے ایک سے جان چھڑائی تو دوسرے گروہ کے لوگ آ گئے اور ان سے جان چھڑائی تو تیسرا گروپ آ گیا۔ اُن کا رویہ انتہائی جارحانہ تھا۔ وہ نہایت ہی اونچی زبان میں بات کر رہے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ عقیدت جو میں حضرت نظام الدین اولیا کے بارے میں لے کر یہاں پر آیا تھا، وہ تو ختم ہوتی جا رہی ہے جس کا مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ یہ عجیب وغریب منظر

تھا جو مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان لوگوں سے اپنی جان چھڑا کر چھوٹے سے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر دعائے مغفرت کی۔

درگاہ سے فارغ ہو کر میں امیر خسرو کے مزار کی طرف چلا گیا، جو اسی احاطے کے ایک حصے میں واقع تھا۔ دور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہاں قوالی ہو رہی ہے جو میرے لیے حیران کن بات تھی۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو امیر خسرو کے متعلق کچھ معلومات فراہم کروں، حضرت محمد نظام الدین اولیاء کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے اسلام کی بے حد خدمت کی۔ ہندوستان بھر میں اسلام کی اشاعت میں ان کا حصہ قابلِ ذکر ہے۔

آپ کو عرف عام میں حضرت نظام الدین بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کا لقب محبوب الٰہی بھی بے حد مشہور ہے۔ آپ کی پیدائش تیرھویں صدی کی تیسری دہائی میں اتر پردیش میں ہوئی۔ آپ ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے ایک بڑے صوفی اور بزرگ مانے جاتے ہیں۔ آپ سے پہلے فرید الدین گنج شکر، قطب الدین بختیار کاکی اور معین الدین چشتی، چشتیہ سلسلے کی نامور شخصیات ہیں۔

آپ کی تعلیمات کی بنیاد بھی محبت ہی ہے۔ اسی ذریعے کو آپ نے خدا کو پہچاننے کا ایک راستہ بتایا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ خدا سے محبت کا صحیح طریقہ، انسانیت سے محبت کے اظہار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب ابھی آپ کی عمر پانچ سال کی تھی کہ آپ کے والد وفات پا گئے۔ آپ کی والدہ آپ کو لے کر دلی آ گئیں۔ آپ جب بڑے ہوئے تو آپ صوفی بزرگ فرید الدین گنج شکر کے مرید بن گئے۔ وہ ہر سال رمضان کا مہینہ اجودھن میں اپنے پیر کے پاس گزارتے تھے۔ بابا فرید نے انھیں اپنا جانشین بھی مقرر کیا تھا۔

انھوں نے دلی سے ہٹ کر ایک علاقے میں رہنا شروع کیا اور اپنی خانقاہ بنائی۔ اس خانقاہ میں ہر آنے والے شخص کو کھانا دیا جاتا تھا۔ جسے آپ لنگر کہہ سکتے ہیں جو بعد میں ہر خانقاہ کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ آپ کے شاگرد کافی مشہور ہوئے جن میں امیر خسرو کا نام سرِ فہرست ہے۔ پاکستان میں کئی لوگ اپنے نام کے ساتھ نظامی لکھتے ہیں جس کی وجہ آپ کی ذات ہی ہے۔ آپ کے بارے میں مزید معلومات آپ کو خلیق احمد نظامی کی کتاب *The Life and times of*

Shaikh Nizam-u'd-din Auliya میں مل سکتی ہے۔ یہ کتاب آپ کی زندگی کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔

امیر خسرو: ایک عظیم صوفی شاعر، ذہین موسیقار اور اردو زبان کا بانی

جب بھی میں نے حضرت امیر خسرو کا نام سنا تو میرے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ موسیقی کے چند آلات بنانا اور چند نئی دھنیں ایجاد کرنا ہے۔ جب میں نے ان کے مزار پر قوالی ہوتے دیکھی اور مختلف لوگوں کو ان کے بنائے ہوئے موسیقی کے آلات کے ساتھ دیکھا تو میرا یہ خیال مزید پختہ ہو گیا۔

وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی مجھے اپنی مخصوص وضع قطع سے فن موسیقی سے وابستہ ہی لگے لیکن جب میں نے امیر خسرو کے متعلق پڑھا تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ان کے متعلق پتہ چلا کہ وہ تو ایک بہت بڑے صوفی تھے اور خواجہ نظام الدین کے انتہائی قریبی مرید بھی تھے۔ خواجہ صاحب نے ان سے متعلق یہ کہا تھا کہ اگر شریعت کی اجازت ہوتی تو میں انھیں اپنی قبر میں دفن کرنے کے لیے کہتا۔ خواجہ صاحب کی وفات کے چند ماہ بعد ہی امیر خسرو کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہ چند ماہ بھی انھوں نے نہایت خاموشی سے گزارے، وہ ہر وقت ایک افسردگی کے عالم میں رہتے۔ یہ سب ان کی اپنے مرشد سے محبت کی وجہ سے تھا۔

امیر خسرو کا اصل نام عین الدین اور ابوالحسن ان کی کنیت تھی۔ مختلف مسلمان بادشاہوں نے آپ کو امیر خسرو اور ان جیسے کئی دوسرے القابات سے نوازا تھا۔ آپ کے والد ترک تھے جو اپنے آبائی علاقے ثمرقند سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آ گئے تھے۔ امیر خسرو، پٹیالی، اتر پردیش میں تیرھویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ایک ہندو خاندان سے تھیں۔ یہ بات مجھے خاصا حیران کرتی ہے کہ بہت سے اثر و رسوخ رکھنے والے مسلمانوں، خاص طور پر مسلمان حکمرانوں کی بیویاں ہندو خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عام رواج تھا کہ لوگ ہندو خاندان میں شادیاں کرتے تھے۔

امیر خسرو کی والدہ بھی ایک ہندو راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب آپ آٹھ

سال کے ہوئے تو آپ کے والد وفات پا گئے۔آپ کی والدہ اپنے بچوں کو لے کر اپنے والد کے گھر دہلی آ گئیں۔ جب امیر خسرو بیس سال کے ہوئے تو آپ کے نانا بھی فوت ہو گئے اور یوں آپ اپنے بڑوں کی شفقت سے محروم ہو گئے۔

جو بات مجھے سب سے زیادہ حیران کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس دور میں جب سفر کرنا بے حد مشکل تھا امیر خسرو نے اس قدر علم کیسے حاصل کیا اور کس طرح سے انھوں نے اپنے اس علم کی بدولت نت نئی چیزیں ایجاد کر کے لوگوں کو حیران کیا۔ وہ بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں۔ طبلہ اور سارنگی انھی کی ایجاد ہے۔ وہ قوالی کے بھی بانی مانے جاتے ہیں۔ایک اور بات جو ان سے متعلق کہی جاتی ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں شعر لکھا۔

امیر خسرو کی مادری زبان فارسی تھی۔ میں نے یہ بات کئی جگہ پڑھی ہے اور سنی بھی ہے کہ اُس وقت ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں ایک زبان بولی جاتی تھی جسے ہندوستانی زبان کہا جاتا تھا۔ یہ زبان سنسکرت سے خاصی مختلف تھی۔ جو لوگ یہ زبان بولتے تھے انھیں عام طور پر ہندوستانی کہا جاتا تھا۔عربی، فارسی، سنسکرت اور اسی ہندوستانی زبان کے ملاپ سے اردو زبان کی بنیاد رکھی گئی۔ بہت سارے لوگ امیر خسرو کو اردو زبان کا بانی کہتے ہیں اور انھیں طوطی ہند کا لقب بھی دیا گیا ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ زبان کسی خاص تاریخ کی ہی ایجاد ہو۔ یہ ایک عوامی معاملہ ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ایک اور بات بھی آپ کی دلچسپی کے لیے بڑی اہم ہوگی کہ جس طرح خواجہ نظام الدین کا عرس منایا جاتا ہے اسی طرح سے ان کا عرس بھی باقاعدگی سے منایا جاتا ہے۔ایک بڑا طبقہ ان کو پیر بھی مانتا ہے اور انھیں لوگ خواجہ امیر خسرو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

میں ان ہی خیالات میں خواجہ امیر خسرو کی قبر مبارک کے پاس چلا گیا۔قبر کے چاروں طرف جالی لگی ہوئی تھی اور اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ زیادہ تر لوگ چادریں چڑھا رہے تھے اور کچھ لوگ وہاں پر پہلے سے موجود چادریں لے کر جا رہے تھے۔ میں کافی دیر وہاں بیٹھا قوالی سنتا رہا۔

قوالی کبھی ہمارے ہاں بھی بہت سنی جاتی تھی۔ ہر گلی محلے میں کسی نہ کسی پیر کا مزار ہوتا تھا اور ان کے عرس کے موقع پر قوال، قوالی پیش کرتے تھے لیکن اب آہستہ آہستہ قوالی کا رواج ختم ہوتا

جا رہا ہے۔ نصرت فتح علی خاں نے قوالی کے فن کو عروج تک پہنچانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں امیر خسرو کے مزار پر بیٹھا قوالی سن رہا تھا تو میں یہ دیکھ رہا تھا کہ قوال بار بار ہاتھوں سے امیر خسرو کے مزار کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور انھی کی لکھی ہوئی کوئی قوالی گا رہے تھے۔ وہ منظر مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ میرے بھارت کے دورے کا یہ ایک اہم واقعہ تھا جو مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ تصور کریں کہ آپ قوالی سن رہے ہوں اور ان کی قبر بھی سامنے ہو جنھوں نے قوالی ایجاد کی ہو، تو اس منظر کا ناقابل فراموش ہو جانا تو بنتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہاں پر کوئی حلیم کی دیگ پکانے کے لیے پیسے نہیں لے رہا تھا۔

امیر خسرو سے متعلق پڑھنے کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ایک بہت ہی عظیم صوفی تھے اور جنھوں نے اردو اور فارسی ادب میں بے حد اہم کام سرانجام دیے۔ آج آٹھ سو سال بعد بھی ان کے اشعار زبان زدِ عام ہیں۔ یہ اشعار ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است
خسرو دریا پریم کا اُلٹی واکی دھار
جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا اس پار

امیر خسرو نے بے شمار کتابیں بھی لکھیں، غزلیں بھی کہیں۔ ان کے کام کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر فن مولا تھے۔ ان کے مزار پر جانے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ ان کی اصل شناخت ایک شاعر اور ایک مصنف کی ہے جنھوں نے اردو جیسی خوب صورت اور عظیم زبان کی بے حد خدمت کی لیکن قوال حضرات نے ان کی پہچان قوالی ایجاد کرنے والے ایک موسیقار کے طور پر کروائی ہے۔

انھی خیالات کے ساتھ میں ان کے مزار سے واپس آ گیا اور احاطے کے باہر کھلے میدان میں ایک چار دیواری کے اندر مرزا غالب کی قبر کے پاس چلا گیا۔ اس وقت اس احاطے میں صرف انھی کی اکیلی قبر تھی جس کے اوپر کوئی چھت وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اب میں نے تصاویر میں دیکھا ہے کہ اُن کی قبر پر ایک کمرہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ اب اِس بادہ خوار کا مزار دو عظیم مزاروں کے قریب

موجود ہے۔ ابھی اس پر عرس شروع نہیں ہوا۔ ایک بات جو میرے لیے حیران کن تھی کہ مرزا غالب کو (جن کا انتقال ڈیڑھ سو سال پہلے ہوا تھا) دلی شہر میں دفن کرنے کی بجائے دلی سے باہر بستی نظام الدین میں دفنایا گیا۔ یقیناً اس کی وجہ اُس وقت بھی لوگوں کی حضرت نظام الدین سے عقیدت ہی ہوگی۔ انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں امیر خسرو کے بارے میں ایک مختصر تحریر موجود ہے۔ اس کے علاوہ امیر خسرو دہلوی نے بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے *Amir Khusrau: Memorial Volume* جسے مشی گن یونیورسٹی نے چھاپا ہے۔ اس میں امیر خسرو کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

امیر خسرو کے کلام کے چند نمونے

خسرو دریا پریم کا الٹی واکی دھار
جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا اس پار
گوری سووے سیج پہ مکھ پہ ڈالے کھیس
چل خسرو گھر اپنے ، سانجھ بھئی چو دیس

❁❁❁

نئی دہلی

تاریخ، اقتدار اور نوآبادیاتی ورثہ

میرا آج کا دن مزارات پر گزرا، پہلے ہمایوں کا مقبرہ، پھر درگاہ نظام الدین، اس کے بعد امیر خسرو اور غالب کی قبریں۔ دن میں میرا رابطہ رنبیر سنگھ مانگٹ صاحب سے ہو گیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ میں آپ کو شام کے بعد نئی دہلی میں واقع اہم عمارات کی سیر کے لیے لے کر جاؤں گا۔ میں نے ان سے فرمائش کی کہ میں راشٹریہ پتی بھون یعنی صدارتی محل، پارلیمنٹ ہاؤس اور انڈیا گیٹ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ رات کے وقت بہت اچھی روشنی ہوتی ہے اور زیادہ رش بھی نہیں ہوتا اس لیے ہم شام کے بعد ان مقامات پر جائیں گے۔

رنبیر صاحب مغرب کے بعد تشریف لے آئے۔ میرا ہوٹل ان مقامات سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے ہم جلد ہی نئی دہلی کے اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں بھارتی حکومت کے مرکزی دفاتر اور صدارتی محل کے ساتھ پارلیمنٹ ہاؤس بھی ہے۔ یہ ایک وسیع و عریض علاقہ ہے۔ یہاں بے شمار کھلی سڑکیں ہیں اور بہت ہی خوب صورتی سے سجائے ہوئے لان ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں حکومت کے مرکزی پروگرام بھی منعقد ہوتے ہیں۔

ہم سب سے پہلے پارلیمنٹ ہاؤس کی بلڈنگ کی طرف گئے۔ اس وقت امن و امان کی صورت حال بہت بہتر تھی اس لیے ہمیں اس عمارت کے قریب جانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ یاد رہے کہ 1911ء تک برٹش انڈیا کے مرکزی دفاتر کلکتہ میں تھے۔ بعد میں یہ دفاتر دہلی منتقل

کیے گئے۔اس وقت دہلی میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں مرکزی دفاتر کے لوگ بیٹھ سکیں۔اس لیے عارضی طور پر شام ناتھ کے علاقے میں پہلے سے قائم چند عمارتوں میں مرکزی دفاتر قائم کیے گئے۔ اس وقت کا وائسرائے بھی انھی دفاتر میں بیٹھتا تھا۔

ہندوستان بہت بڑا ملک تھا اس وقت اس کی سرحدیں افغانستان سے نیپال اور برما تک پھیلی ہوئی تھیں۔ایک طرف ہمالیہ اور دوسری طرف بحرِ ہند تھا۔اتنے بڑے ملک کو سنبھالنے کے لیے مرکزی دفاتر اور مختلف پروگرامات کے لیے ایک بڑی جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔انگریز حکمرانوں نے 1912ء میں نئی دہلی کی تعمیر کا فیصلہ کیا۔اس سے پہلے اس نام کا کوئی علاقہ موجود نہیں تھا۔انھوں نے سب سے پہلے پارلیمنٹ ہاؤس بنانے کا منصوبہ بنایا گیا۔

بھارت کا یہ پارلیمنٹ ہاؤس ایک گول شکل میں ہے۔درمیان میں بہت بڑا ہال ہے اور اردگرد بے شمار کمرے ہیں۔کہتے ہیں کہ مدھیہ پردیش میں گیارھویں صدی کا ایک مندر ہے جو گول شکل کا ہے۔نئی دہلی کے ماہرینِ تعمیرات نے بھی پارلیمنٹ ہاؤس کا ڈیزائن اُسی سے ملتا جلتا بنایا ہے۔یہ محض اتفاق بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماہرین ایک ہزار سال پرانی عمارت کی طرزِ تعمیر سے متاثر ہو گئے ہوں۔

رنبیر صاحب اور میں اس عمارت کے بہت قریب چلے گئے۔رات کا وقت تھا اور روشنی بھی بہت زیادہ تھی۔مجھے اس عمارت کی طرزِ تعمیر نے بے حد متاثر کیا۔میں سوچتا رہا کہ یہ وہ عمارت ہے جہاں انگریز امپیریل لجسلٹو کونسل، انڈین لجسلٹو (Legislative) کونسل اور کونسل آف سٹیٹس کے اجلاس منعقد کرتے تھے اور ایک محکوم قوم کی قسمت کے فیصلے کرتے تھے۔پورے ملک سے انگریزوں کے وفادار اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے ان کونسلز کے ممبر بنائے جاتے تھے اور وہ یہاں پر منعقد ہونے والے اجلاسوں میں آتے تھے۔میں تصور ہی میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کس طرح سے راجے، مہاراجے دور دراز کا سفر طے کر کے اپنے غیر ملکی آقا کی خدمت میں پیش ہوتے تھے۔

اس عمارت کا افتتاح 1927ء میں کیا گیا یہ وہ دور تھا جب آزادی کی تحریک زوروں پر

تھی۔ یہ عمارت تحریک آزادی کی عینی شاہد ہے۔ یہ وہی عمارت ہے جہاں موتی لال نہرو بھی آتا تھا، گاندھی بھی آیا ہوگا، قائداعظم بھی بارہا یہاں تشریف لائے ہوں گے۔ اگر آپ کو یاد ہو 1929ء میں بھگت سنگھ اور اس کے ایک ساتھی نے اس عمارت پر حملہ کیا تھا۔ یہ عمارت اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس نے تحریک آزادی کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ اسی عمارت میں آزادی کے بعد کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا، جس طرح کراچی میں سندھ اسمبلی کی عمارت میں پاکستان کی قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا تھا۔

اب اس جگہ لوک سبھا اور راجیہ سبھا یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ ۔اس عمارت میں آٹھ سو لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ میں دیر تک عمارت کے پاس کھڑا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ یہ وہ عمارت ہے جو ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے بنائی۔ اِس شہر میں ایک لال قلعہ بھی بنایا گیا تھا جس کے بنانے والے بھی غیر ملکی ہی تھے۔ اس پورے عرصے میں ہم کہاں تھے۔ اُس وقت ہمارے دیسی حکمران درباری کہلاتے تھے اور اب وہ ممبر آف پارلیمنٹ کہلاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پھولن دیوی بھی اس کی ممبر تھی اور وہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے قانون سازی میں حصہ لیتی تھی اور اب ارب پتی لوگ غریبوں کی قسمت کے فیصلے کرتے ہیں۔

یہ طبقاتی خلیج ازل سے ہے اور شاید کبھی ختم نہ ہو۔۔ کبھی بادشاہت کے نام پر اور کبھی جمہوریت کے نام پر!

مجھے اس عمارت کو دیکھ کر یہ خیال بھی آیا کہ ہر ملکی اور غیر ملکی حکمران نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے اس عمارت کی مضبوط دیواروں کا سہارا لیا۔ موجودہ حکمران بھی یہیں پر تشریف فرما ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جو حال دہلی شہر کے باقی حصے کا ہے، اس سے تو لگتا ہے کہ وہ دہلی کا حصہ ہی نہیں ہیں۔ اگر یہ وہ حصہ نہیں ہے تو یہاں منتخب ہو کر آنے والے نمائندوں کا بھی اپنے عوام سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ انھیں اس جمہوری دور میں صرف ان کا ووٹ درکار ہوتا ہے اور ضرورت کے وقت ان کا خون بھی۔

اِس عمارت کے ارد گرد ہر جگہ انتہائی خوب صورت روشنیوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ یوں لگتا

تھا جیسے ہم بہت ہی حسین وجمیل اور وسیع میدان میں آ گئے ہیں۔ یہ ظاہری فرق اس فرق کو بھی ظاہر کرتا ہے جو حکمرانوں اور عام آدمی کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

میں اور رنبیر صاحب انھیں راستوں پر چل کر واپس آ گئے جن راستوں پر یہاں کا وائسرائے چل کر آتا تھا۔ اس عمارت کی سیر کے بعد میں ایڈون اور ہربرٹ کے (جنھوں نے اس عمارت کا ڈیزائن بنایا تھا) ہنر کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس عمارت کی تعمیر کرنے والے کاریگروں نے بھی کمال کیا ہے۔ یقیناً یہ ایک شاہکار عمارت ہے۔ اس عمارت کا ایک تفصیلی تعارف ایک کتاب کی شکل میں پارلیمنٹ کے دفاتر نے چھاپی ہے۔

ہماری اگلی منزل بادشاہ کا محل تھا جسے اب جمہوری دور میں ہم صدارتی محل کہتے ہیں!

پہلے وائسرائے ہند کی رہائش گاہ اور اب راشٹر یہ پتی بھون

انگریزوں نے 1911ء میں دلی میں منعقدہ ایک تاریخی دربار میں یہ فیصلہ کیا کہ حکومت کے مرکزی دفاتر کلکتہ سے دلی منتقل کیے جائیں۔ یادرہے کہ کلکتہ کے نواحی علاقے راج بھون میں وائسرائے کی رہائش اور دفاتر تھے۔ انگریز سرکار کا خیال تھا کہ اتنے بڑے ملک کو کسی کونے میں بیٹھ کر کنٹرول نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اس کام کے لیے ان کے نزدیک سب سے بہترین جگہ دلی تھی۔ اس سے پہلے بھی دلی بے شمار حکمرانوں کا پایہ تخت رہ چکا تھا۔ دلی کے علاوہ بھی کئی شہر حکمرانوں کے پایہ تخت رہ چکے ہیں، جن میں لاہور اور آگرہ بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود انگریز سرکار نے دلی ہی کو اپنے مرکزی دفاتر کے لیے پسند کیا۔ اس طرح دلی میں ایک نئی دہلی نام کا شہر بسانے کا فیصلہ ہوا جس میں صرف حکمرانوں، ان کے ساتھیوں اور رکھوالوں کو رہنے کی اجازت دی جائے گی۔

یادرہے کہ 1858ء سے پہلے تک ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا کنٹرول تھا اور اس کے سربراہ کو گورنر جنرل انڈیا کا خطاب دیا جاتا تھا۔ بعد میں جب ہندوستان پر براہِ راست برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی تو برطانوی سلطنت کے نمائندے کو وائسرائے آف انڈیا کہا جاتا تھا۔

یہ بات انتہائی دلچسپی کا باعث ہے کہ بھارت کا صدارتی محل دنیا کا سب سے بڑا صدارتی محل ہے۔ میں رنبیر سنگھ مانگٹ کے ساتھ راج پاتھ پر چل رہا تھا۔ ہمارا رخ صدارتی محل کی طرف

تھا۔ ہم اس کے بہت قریب تو نہ جا سکے لیکن کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس کا نظارہ ضرور کیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ انتہائی پرسکون ماحول تھا۔ اس وقت انتشار بھی نہیں تھا اور آسمان بھی صاف ہونے کی وجہ سے صدارتی محل واضح نظر آ رہا تھا۔

اس عظیم عمارت کے تین نام ہیں، پہلا نام تو وائسرائے کی رہائش گاہ تھا، پھر اسے صدارتی محل کہا جانے لگا اور اب اسے راشٹر یاپتی بھون یعنی صدر کی رہائش گاہ کہتے ہیں۔ میں اس عمارت کا گنبد دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ بہت ہی خوب صورت بیلنس تھا، اس گنبد کے دائیں اور بائیں بے شمار عمارتیں تھیں۔ سامنے گراؤنڈ کے اندر ایک بہت بڑا پول تھا جس پر بھارت کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جتنی دہشت اور ہیبت، یہ میں الفاظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں، اس عمارت کی مجھ پر ہوئی اور اور کسی چیز کی نہیں ہوئی۔ میں آج تک اس عمارت کی وسعت اور خوب صورتی کی ہیبت محسوس کرتا ہوں۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ انگریز عمارات کی طرز تعمیر میں اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ جو بھی وہاں پر آئے وہ لازماً مرعوب ہو۔ میرا خیال ہے کہ ہر بادشاہ کی ایسی ہی سوچ ہوتی ہے۔ میں نے رنبیر صاحب سے پوچھا کہ کیا ان کو کبھی اندر جانے کا موقع ملا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ پھر میں نے اندر کی تفصیلات پوچھیں، تو انھوں نے ایک ہی فقرہ کہا کہ جتنا سندر یہ باہر سے ہے، اس سے کہیں زیادہ سندر یہ اندر سے ہے۔

ہر محل کے نیچے کسی غریب کی جھونپڑی ضرور ہوتی ہے!

جب انگریز سرکار نے اس علاقے میں ایک نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے انھوں نے یہاں پر موجود دو گاؤں ختم کر دیے۔ ان غریب کسانوں کی زمین ہتھیانے کے لیے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ 1894ء کے تحت کارروائی کی گئی۔ اس ایکٹ کے تحت سرکار کسی کی بھی زمین کو سرکاری استعمال کے لیے مارکیٹ ریٹ سے کم ریٹ پر لے سکتی ہے۔ ان دو دیہات کا رقبہ چار ہزار ایکڑ یعنی 160 مربع زمین تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس زمین کے ساتھ ساتھ مغل دور کے باغات تھے جو اپنی نوعیت کے انتہائی منفرد باغات تھے اور وہ آج بھی موجود ہیں۔ ان کو مغل باغات کہا جاتا ہے۔ آج بھی ان کی شان و شوکت کا کوئی مقابلہ نہیں۔

اس کے ساتھ زمین پر ایک چھوٹا سا ٹیلہ بھی تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ وائسرائے کا گھر ایسی جگہ پر ہو جو ہر طرف سے لوگوں کو نظر آئے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ محل کے لیے کون سی جگہ مناسب ہوگی؟ کتنی جگہ درکار ہوگی؟ راستہ کس طرف سے ہو؟ ڈھلوان کتنی رکھی جائے؟ ان سب معاملات پر ایک طویل بحث ہوئی۔ اگر آپ کو موقع ملے تو آپ یہ دلچسپ بحث ضرور پڑھیں۔

اس محل کے ڈیزائن کی ذمہ داری Lutyens Edwin کو دی گئی جو اُس وقت انگلینڈ میں بھی ایک محل بنا رہا تھا۔ اس نے رضا کارانہ طور پر یہ ذمہ داری ادا کی اور اس کام کے لیے کوئی رقم نہیں لی لیکن جو کام اس نے کیا وہ کمال کا تھا۔ اس نے وائسرائے کی رہائش کے لیے 320 ایکڑ جگہ مختص کی اور تین سو چالیس کمرے بنائے۔ اس عمارت کا کل کورڈ ایریا دو لاکھ مربع فٹ ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز 1912ء میں ہوا اور سترہ سال کی مدت یعنی 1929ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس وقت کا وائسرائے، لارڈ آرون پہلا شخص تھا جس نے اس عظیم الشان محل میں رہائش اختیار کی۔ یہ عمارت انگریزوں کی شان وشوکت کو ظاہر کرتی ہے کہ انھوں نے اپنے جاہ وجلال کے اظہار اور اپنی خوشی کی لیے کتنی بے دردی سے غریب اور غلام عوام کا کثیر سرمایا خرچ کیا۔۔۔

یہ سب اس لیے ہوا کہ اس ملک پر ان کا غاصبانہ قبضہ تھا اور وہ حاکم تھے باقی سب محکوم۔

میں عمارت کے بہت قریب تو نہ جا سکا۔ اگر جا پاتا تو ضرور کسی غریب کسان کی جھونپڑی کے آثار دیکھ پاتا کہ جس کی چھت پر اس محل کی بنیاد رکھی گئی۔ میں صرف تصور ہی میں وائسرائے کی سواری اور اہل ہند پر مشتمل محافظ دستہ دیکھ رہا تھا کہ کس طرح وہ چند روپوں کی خاطر ایک غیر ملکی حکمران کی حفاظت کے لیے اپنی جان بھی دینے کو تیار تھے۔۔۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔۔۔ پہلے وہ افغان اور وسط ایشیا کے حکمرانوں کے لیے یہی کام کرتے تھے۔ اپنوں کی حفاظت کا کام تو انھوں نے ایک ہزار سال پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ہندوستان بھر کے راجے اور مہاراجے اس وقت کے وائسرائے کی خدمت میں پیش ہو کر اپنی وفاداری کا ثبوت تحائف کی شکل میں پیش کر رہے تھے۔

ایک خوب صورت بات جو مجھے آج بھی بہت اچھی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ جب 1947ء

میں انگریزوں کا آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو صرف پانچ ماہ وائسرائے رہا، چلا گیا تو اس کے بعد بھارت کا پہلا گورنر جنرل چکرورتی راجا گوپال چاری بنا، جس نے اس عمارت میں رہائش رکھی۔ راجا صاحب نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ بہت ہی خوب صورت کام ہے، جس کی جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے۔ انھوں نے اس بڑی عمارت کے ایک چھوٹے سے حصے کو جس میں صرف چند کمرے تھے فیملی ونگ کا نام دیا اور وہاں پر رہائش رکھی اور باقی تمام عمارت سے کوئی بھی سروکار نہیں رکھا اور یہ روایت آج بھی ہے۔ بھارت کا صدر اسی فیملی ونگ میں رہتا ہے۔ اس کے بعد 1950ء میں راجندرہ پرساد پہلے بھارتی صدر ہیں جنھوں نے اس عمارت میں رہائش رکھی۔

جب میں اس صدارتی محل کو دیکھتا ہوں جسے انگریزوں نے ڈیزائن کیا اور پھر پاکستان کے صدارتی محل کو بھی سامنے رکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اس عمارت کو بناتے ہوئے ہندوستان کی مختلف عمارتوں کے طرزِ تعمیر کو بھی ذہن میں رکھا۔ اسی طرح کے رنگ استعمال کیے۔ اس کے علاوہ بھی آپ اور بہت ساری مماثلت محسوس کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اسے غور سے دیکھیں تو اس عمارت میں زیادہ تر سرخ رنگ ہی استعمال ہوا ہے۔ اس طرح اور بھی بہت سارے مقامات پر انھوں نے ہندوستانی طرزِ تعمیر اپنایا ہے۔

صدارتی محل کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے ہندوؤں، مغلوں اور یورپی طرزِ تعمیر کو مکس کر کے اس عمارت کو بنایا ہے۔ دوسری طرف اگر آپ پاکستان کی قومی اسمبلی کی عمارت یا پرائم منسٹر ہاؤس یا صدارتی محل دیکھیں تو یہ لگتا ہے کہ ان عمارتوں کا کسی بھی طرح مقامی طرزِ تعمیر سے کوئی مماثلت نہیں ہے۔ اس محل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ہمیشہ سے ہی بہت پڑھے لکھے لوگ رہائش پذیر رہے ہیں جو سیاسی تو نہیں ہوتے تھے لیکن انھوں نے اپنے کسی فن یا علم سے لوگوں کی قابلِ ذکر خدمت کی ہوتی تھی۔ اس عمارت کی ایک مختصر تاریخ جگران جوش نے *The history of Rashtrapati Bhavan : The official home of the President of India* کے نام سے لکھی ہے جس میں کافی دلچسپ معلومات دی گئی ہیں۔

شاہی دستہ اور بادشاہ

اب بہت وقت گزر چکا تھا اور ہمیں ایک تیسری عمارت بھی دیکھنا تھی، جس کا نام انڈیا گیٹ ہے۔ آگے چلنے سے قبل میں ایک اور بات کا ذکر یہاں ضرور کرنا چاہوں گا جو کچھ لوگوں کے لیے نہایت ہی دلچسپی کا باعث ہوگی، وہ بھارتی صدر کا باڈی گارڈ دستہ ہے۔

مغلوں کے دور سے ہی بڑے قد کاٹھ کے خوب صورت نوجوان بادشاہ سلامت کے ذاتی باڈی گارڈ ہوتے تھے۔ جب بھی بادشاہ سلامت ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ان کا مقصد حفاظت سے زیادہ بادشاہ کے جاہ وجلال میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ مغل بادشاہوں کا بھی ذاتی محافظ دستہ ہوتا تھا۔ انگریزوں نے بھی مغل بادشاہ کی طرز پر 1773ء میں اپنے گورنر کے لیے باڈی گارڈ یونٹ بنائی۔ یاد رہے اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی ایک خاص علاقے تک محدود تھی اور مغل سلطنت کسی نہ کسی انداز سے قائم تھی۔ اس لحاظ سے یہ اب تک کی سب سے پرانی یونٹ ہے۔ اس یونٹ کی عمر دوسو سال سے زائد ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ بڑی اہم بات ہے۔

اس یونٹ میں ہندوستان کے خاص علاقوں سے مخصوص نسل کے لوگوں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ مختلف اوقات میں بھرتی کرنے کا معیار مختلف رہا لیکن ایک بات مشترک تھی کہ ہر شخص کا قد چھ فٹ تین انچ ہونا چاہیے۔ اس میں شامل لوگوں کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہی، مختلف قوموں کا کوٹہ بھی تھا اب اس یونٹ میں صرف ہندو جاٹ اور راجپوت ہی شامل ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ وفاداری اور ایک وجیہہ شباہت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ روایت ابھی بھی جاری ہے۔ اس وقت اس دستے میں صرف پنجاب سے تعلق رکھنے والے جاٹ اور راجپوت بھرتی کیے جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر حصہ مالوہ اور ماجہ کے سکھ جاٹوں کا ہے۔

اس وقت اس میں دوسو گھڑ سوار ہیں جو گھوڑوں پر سوار ہو کر پریڈ میں شریک ہوتے ہیں۔ کسی دور میں یہ اونٹوں پر سوار ہوتے تھے۔ یہ ایک بہت خوب صورت سلسلہ ہے جو نسل در نسل چلتا آ رہا ہے۔ بادشاہ سلامت کی حفاظت سے زیادہ بادشاہ سلامت کے وقار میں اضافہ کرنا اس یونٹ کا فرض ہے، جیسے بادشاہ کا لباس اور سواری اس کی شان وشوکت کو ظاہر کرتی ہے اسی طرح یہ دستہ

بھی بادشاہ کی شان وشوکت میں اضافے کے لیے رکھا جاتا ہے۔

اگر آپ نے اس دستے کی شان وشوکت دیکھنی ہو تو آپ بھارتی صدر کے کسی بھی پروگرام میں اس کی آمد ورفت دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس دستے کی موجودگی میں بادشاہ جیسا بھی ہو، اس کے قد کاٹھ میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ شاہی دستے کی ایک طویل تاریخ ہے جس کے بارے میں قدرے تفصیل سے اشوک ناتھ نے اپنی کتاب *Izzat: Historical Records and Iconography of Indian Cavalry Regiments, 1750-2007* میں لکھا ہے۔ یہ کتاب Centre for Armed Forces Historical Research, United Service Institute of India نے چھاپی ہے۔

یہ سب دیکھنے کے بعد میں نے رنبیر مانگٹ سے کہا کہ ہم دونوں جاٹ نسل سے تعلق رکھتے ہیں، میرے آباؤ اجداد سکھ تھے جبکہ رنبیر ابھی بھی سکھ ہیں۔ کیا ہم اس بات پر فخر کریں کہ ہمارے آباؤ اجداد کی پہچان غیر ملکی آقاوں کی حفاظت کرنے والے وفادار اور خوب صورت نوجوانوں کی سی تھی؟

ان کا جواب خاموشی تھا۔۔۔لیکن کچھ وقفے کے بعد انھوں نے کہا کہ اب ایسا نہیں ہے۔۔۔اب ہم اپنی پہچان علم کی دنیا میں بھی کروا رہے ہیں۔

میں نے اُن کی بات سے اتفاق کیا اور پھر ہم انڈیا گیٹ کی طرف چل دیے جہاں ہمارے اُن ہندوستانی لوگوں کے نام لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے ان غیر ملکی آقاؤں کے لیے جانیں دیں۔

کیا یہ لوگ جنھوں نے ہم پر غیر ملکی تسلط کو قائم کرنے میں اپنی جان تک دی، ہمارے ہیرو ہیں؟ میرا جواب تو نہ میں ہے۔ وہ ان کے ہیرو ہیں جنھوں نے ان کے نام کے گیٹ بنا کر اِن پر اُن کے نام لکھے ہیں، وہ میرے ہیرو نہیں ہیں۔۔۔

انڈیا گیٹ: انگریز کے وفاداروں کی یاد میں

میں اور رنبیر صاحب صدارتی محل سے مین روڈ پر آ گئے۔ اس سڑک کو راج پاتھ بھی کہتے ہیں اور اسے کنگز وے بھی کہا جاتا ہے۔ ہماری منزل انڈیا گیٹ تھی جو ہمیں دور سے نظر آ رہا تھا۔

انڈیا گیٹ ان ستر ہزار ہندوستانی افراد کی یاد میں بنایا گیا ہے جنھوں نے 1914ء سے 1921ء تک جنگ عظیم اول اور اس کے بعد افغانستان کے ساتھ انگریزوں کی لڑائیوں میں سلطنت برطانیہ کے پرچم کو بلند رکھنے کے لیے اپنی جانیں قربان کی تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو انڈیا گیٹ کے بارے میں کوئی بات بتاؤں میں یہ چاہوں گا کہ اس گیٹ کا ایک اور پہلو بھی آپ کے سامنے رکھوں۔ ان ستر ہزار افراد کا تعلق ہر طرح کے قبیلے سے تھا۔ ان میں ہندو بھی تھے، سکھ بھی، مسلمان بھی اور علاقے کے اعتبار سے ان میں موجودہ کے پی کے، پنجاب، سندھ، بلوچستان، یوپی، سی پی، گجرات، بنگال، کشمیر غرض ہر علاقے کے لوگ شامل تھے۔

انگریز کی فوج میں ہندوستانی فوجیوں کی تعداد کتنی ہوگی؟ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ستر ہزار لوگ سات سالوں میں مارے گئے تو ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کتنے لوگ ہوں گے جو انگریزوں کی فوج میں شامل تھے؟ یقیناً ان کی تعداد لاکھوں میں ہوگی۔

سلطنت برطانیہ کئی براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور یہ سچ بھی تھا۔ برٹش انڈیا آرمی اس سلطنت کا ایک حصہ تھی۔ برطانوی سلطنت کو جہاں بھی خطرہ درپیش ہوتا تھا، برٹش انڈیا آرمی کے لوگ وہاں بھیجے جاتے تھے۔ اس آرمی نے جاپان سے افریقہ تک اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ غرض جہاں بھی تاج برطانیہ کو ضرورت ہوتی ، برٹش انڈیا آرمی میں ہندوستان سے بھرتی کیے ہوئے فوجیوں کو بھیجا جاتا۔ یہ ہندوستانی سپاہیوں کی وفاداری اور کارکردگی کا ایک اہم ثبوت ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے انگریزوں کے ساتھ کسی دوسری قوم کے لوگ نہیں آئے کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ انگریزوں کی ہندوستان کی فتح میں سب سے اہم کردار مقامی لوگوں نے ہی ادا کیا۔

جب اپنے ہی میسر ہوں تو غیر کی کیا ضرورت تھی!

ایک سوال ہمیشہ سے میرے ذہن میں رہا کہ وہ کون سی ایسی وجہ تھی کہ ہندوستان کے لوگ

انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اور ان کے لیے جاپان سے افریقہ تک کے جنگلوں میں جنگ کے لیے جاتے تھے؟ ان میں سے ستر ہزار افراد تو زندہ گھروں کو واپس بھی نہ آئے اور ضرورت کے وقت انھوں نے اپنے ہی ہم وطنوں پر گولیاں بھی چلائیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کے مقدس مقام یعنی خانہ کعبہ پر بھی گولیاں چلانے سے گریز نہیں کیا۔ انگریز کے پاس کون سا ایسا گُر تھا جس کی وجہ سے انھوں نے ان لوگوں کی وفاداری حاصل کی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب میں بہت دیر سے ڈھونڈ رہا تھا۔

ہمارے خاندان کے ایک بزرگ صوبیدار فتح محمد بھی انگریز فوج میں رہے تھے۔ ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ انگریزوں کی فوج میں بھرتی کیوں ہوئے؟ جب کہ انگریزوں کی فوج بہت سی جگہوں پر مسلمانوں کے خلاف ہی جنگ کر رہی تھی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ افغانستان پر حملے کے وقت فوج کی اکثریت مقامی لوگوں پر مشتمل تھی اور جنگ آزادی میں بھی مجاہدین کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں کی فوج میں مقامی لوگ ہی پیش پیش تھے تو وہ کیا وجہ تھی کہ یہ لوگ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف جنگ کرتے تھے؟ میں نے یہ بھی کہا کہ یہاں تک کہ خانہ خدا پر حملے کرنے والے انگریزوں کی فوج میں ہندوستانی مسلمان ہی شامل تھے۔

انھوں نے مجھے جو بات بتائی اس سے میں کسی حد تک تو مطمئن ہوا لیکن مکمل طور پر نہیں۔ انھوں نے یہ کہا کہ ایک تو ہمارے پاس کوئی کام نہیں ہوتا تھا، ہندوستان میں کوئی انڈسٹری نہیں تھی، پڑھے لکھے ہم تھے نہیں اور کھیتی باڑی کے علاوہ ہمیں کوئی کام نہیں آتا تھا۔ ہماری اکثریت دیہات میں رہتی تھی۔ اتنی پیداوار بھی نہیں ہوتی تھی کہ سُکھ کی زندگی گزار سکیں۔ ہم انگریزوں کی فوج کی نوکری صرف نوکری سمجھ کر کرتے تھے جس کی ہمیں بہت اچھی تنخواہ ملتی تھی۔

مرجانے یا ریٹائر ہونے کی شکل پنشن ملتی تھی اور بہت سی دیگر سہولیات بھی دستیاب تھیں۔ اچھی کارکردگی پر زمین بھی انعام میں مل جاتی تھی۔ فوجی ہونے کے ناطے مقامی انتظامیہ بھی ہمارا خیال رکھتی تھی۔ باقی وہ ہم سے کیا کام لیتے تھے، یہ ان کی مرضی تھی۔ وہ ہمیں گولی چلانے کا حکم دیتے تھے اور ہم چلا دیتے تھے۔ یہ گولی کس کو لگتی تھی اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ ہم تو صرف اور صرف ایک نوکری کی خاطر انگریز کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ سچی

بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا کوئی شعور بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔

میں ان کی بات سے کسی حد تک متفق ہوں۔ میرے خیال میں انگریزوں کا اپنے فوجیوں کے ساتھ حسن سلوک بھی ایک وجہ تھی جس کے نتیجے میں انھیں وفادار ہندوستانی فوجی ملتے تھے۔ وہ اپنے لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے، ان کی اچھی کارکردگی پر انعام بھی دیتے، ان کے لیے پینشن کا بندوبست بھی کرتے تھے اور مرجانے کے بعد ان کے بیوی بچوں کے لیے بھی پینشن کا نظام قائم رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے کارناموں کی تشہیر بھی کرتے تھے، انڈیا گیٹ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

اس طرح کی سہولیات کا اس سے پہلے کوئی تصور نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی محکمانہ ترقی بھی ہوتی جس سے معاشرے میں ان کے وقار میں اضافہ ہوتا تھا۔ میں نے بذاتِ خود ڈسکہ میں ایک گھر کے ڈرائنگ روم میں انگریزوں کی طرف سے دیے گئے میڈل سجے دیکھے ہیں۔ میرے سگے ماموں بھی انگریز فوج میں سپاہی تھے۔ آزادیِ ہند سے چند ماہ قبل ان کو سکھوں کے ایک جتھے نے شہید کر دیا تھا۔ ان کی پینشن ان کی بیٹی کو شادی تک اور بیوی کو مرنے تک ملتی رہی ہے۔ ان کی اہلیہ کا انتقال 2010ء میں (یعنی انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے) ساٹھ سال بعد ہوا۔

انگریز تو چلا گیا لیکن اس نے اپنے وفادار کے مالی مفادات کا مکمل خیال رکھا۔ روپو چک ظفروال ضلع نارووال کے رہنے والے میرے انتہائی پیارے دوست جناب فیصل ٹھاکر نے مجھے اپنے گاؤں میں لگی ایک تختی کی تصویر بھیجی ہے۔ یہ تختی انگریزوں نے آزادیِ ہند سے قبل لگائی تھی۔ اس پر لکھا ہوا ہے کہ اس گاؤں کے ستانوے لوگوں نے جنگ عظیم اوّل میں تاج برطانیہ کی سربلندی کے لیے فوج میں خدمات سرانجام دیں اور جن میں سے دو واپس اپنے گھروں کو نہ آسکے اور وہ تاج برطانیہ کی آن بچاتے ہوئے قربان ہو گئے۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے مری کے ایک علاقے میں ایک گاؤں کی دیوار کے اوپر ایک سلیٹ لگی ہوئی دیکھی تھی جس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ اس گاؤں کے اکیس لوگوں نے سلطنت برطانیہ کی خاطر

اپنی جانیں دی تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے والے کسی نان کمیشنڈ آفیسر کی یہ خواہش تھی کہ میرے گاؤں کے باہر توپ لگائی جائے۔ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی اور اب کلر کہار سے چوا سیدن شاہ جاتے ہوئے راستے میں یہ گاؤں آتا ہے۔ جہاں یہ توپ نصب ہے۔ یہ بھی اپنے وفادار لوگوں کا خیال رکھنے کا ایک انداز ہے۔

ایک طرف نوکری، سہولیات، میڈل تھے اور دوسری طرف اپنے ہی ہم وطن تھے جن پر گولی چلانے کا حکم ملتا تھا۔ سب نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیصلہ کیا۔ اس میں ان پڑھ لوگ بھی تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے۔ آزادیِ ہند کے بعد انگریز کی فوج اور انتظامیہ کے لوگ ہی ہمارے حکمران ٹھہرے۔ پاکستان کا پہلا فوجی حکمران بھی انگریز کی فوج میں ایک آفیسر تھا۔ وہ ہمارے ملک کا حکمران تو بن گیا لیکن وہ اپنے سابقہ حاکموں کو کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ ایک جگہ حاکم تھا اور دوسری طرف محکوم تھا۔ ایسے لوگوں نے حقِ وفاداری خوب نبھایا۔ تاریخ ہمیشہ اس کی گواہی دے گی۔

انڈیا گیٹ کا پرانا نام آل انڈیا وار میموریل تھا جس کی بنیاد 1921ء میں رکھی گئی اور 1931ء میں اسے مکمل کیا گیا۔ اس گیٹ کے اوپر 13,300 لوگوں کے نام کندہ ہیں۔ یہ گیٹ انگریزوں کی اپنے لوگوں کی قدردانی کا مظہر ہے جس کے بدلے مقامی لوگ اپنی وفاداریاں پیش کرتے تھے۔ یہ بھی انعام کی ایک شکل ہے جو انگریز ان لوگوں کو دیتے تھے، جو ان کے لیے جان تک قربان کر دیتے تھے۔

اگر میں اپنے بزرگ کی اور اپنی اس بات کی تائید کروں کہ وہ اپنے لوگوں کا بے حد خیال رکھتے تھے، تو کسی حد تک مجھے میرے سوال کا جواب مل جاتا ہے کیوں کہ اہلِ ہند اپنے ملک سے ہزاروں میل دور افریقہ کے جنگلوں میں جا کر لڑتے تھے اور اپنی جان بھی قربان کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

میں انھی خیالات میں گم انڈیا گیٹ کے پاس پہنچ گیا۔ میرے سامنے انڈیا گیٹ ایک گیٹ نہیں تھا بلکہ ایک تاریخ کی کتاب کے مانند تھا جو مجھے بتا رہا تھا کہ مجھے پڑھو تاکہ تم جان سکو

کہ کروڑوں انسانوں پر مشتمل آزاد قوم غلام کیسے بنتی ہے؟ ایک وسیع وعریض علاقہ جس کا رقبہ بیالیس لاکھ مربع کلومیٹر سے بھی زائد تھا، اس پر ایک ایسے ملک کے لوگ قابض تھے جن کے اپنے ملک کا رقبہ صرف اڑھائی لاکھ مربع کلومیٹر تھا، یعنی ہم سے اٹھارہ گنا کم۔ یاد رہے ایک گیٹ وے ٹو انڈیا ہے جو ممبئی میں ہے۔ وہ گیٹ جارج پنجم کے دورے کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ اس کا احوال میں بعد میں بیان کروں گا۔

انڈیا گیٹ تقریباً ایک سو چالیس فٹ کے قریب بلند ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کے نیچے سے گاڑیاں گزرتی تھیں مگر اب ایسا نہیں ہے۔ میں بہت دیر تک گیٹ کے اوپر کندہ کیے ہوئے نام پڑھتا رہا۔ ان میں مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں سمیت سبھی کے نام تھے بلکہ ایک جگہ تو خواتین کے نام بھی تھے جس سے لگتا تھا کہ انگریز کی وفاداری میں خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں رہیں۔ میں اپنے ماموں دین محمد کا نام ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نہ مل سکا۔ شاید جگہ کم تھی اور وفادار زیادہ تھے۔۔۔

مجھے یاد ہے کہ میرے نانا جان، اپنے جوان بیٹے کی یاد میں اکثر آنسو بہاتے تھے اور ان کی بیوہ بھی اپنے سہاگ کو یاد کرتی تھیں اور ان کی بیٹی کو تو اپنے باپ کی شکل بھی یاد نہیں تھی لیکن باپ کا ذکر تو ہر بیٹی شوق سے ہی کرتی ہے، چاہے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔

اے انگریز صاحب بہادر!

یاد رہے کہ گیٹ پر نام لکھنے سے اُن تمام دکھوں کا مداوا نہیں ہوسکتا جو آپ کی وجہ سے ہم نے سہے ہیں۔۔۔

انڈیا گیٹ کے نیچے نشانی کے طور پر ایک الاؤ جل رہا ہے۔ یہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بناتے ہوئے ہلاک ہونے والے بھارتی سپاہیوں کی یاد میں جلایا گیا تھا۔ اسے وہ گمنام سپاہیوں کی یاد میں شمع جلانا کہتے ہیں۔ بظاہر ایک کالے پتھر سے بنے ڈبے کی شکل میں بنائی گئی ایک یادگار کا (جس پر فوجی لباس پہنے لوگوں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں) انڈیا گیٹ سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ اس یادگار سے انڈیا گیٹ کی خوب صورتی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ میرا خیال

ہے کہ بھارت کی حکومت کو اپنے سپاہیوں کی قربانی کی یاد میں کچھ بھی بنانے کا حق ہے لیکن کسی بنی بنائی چیز کو بگاڑنے سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر ہے۔

جنھوں نے بنگلہ دیش بنانے میں جان قربان کی ان کے لیے شمع جلانا بھارت کا حق ہے۔۔۔جنھوں نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بننے سے روکنے کی کوشش کی ان کے لیے کوئی شمع نہیں جلائی گئی۔۔۔میں نے پورا پاکستان ڈھونڈ مارا، ایسی کوئی شمع نہ ڈھونڈ پایا۔

اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم انھیں اپنا ہیرو ہی نہیں مانتے!

اگر آپ انڈیا گیٹ کو ایک عمارت سمجھیں تو یہ ایک لاجواب عمارت ہے۔ دنیا میں اس طرح کے بے شمار گیٹ موجود ہیں جو کسی نہ کسی کی یاد میں بنائے گئے ہیں۔ انگریزوں نے یہ گیٹ بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے وفادار سپاہیوں کو نہیں بھولتے اور ان کی قدر کرتے ہیں۔

جو کسی ایک کا وفادار ہوتا ہے وہ دوسرے کا دشمن تو لازماً ہوتا ہے!

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مین گیٹ سے ہٹ کر مناسب فاصلے پر ایک کنوپی بنائی گئی تھی اور اس کے نیچے برطانیہ کے بادشاہ جارج پنجم کا مجسمہ رکھا گیا تھا۔ آزادیِ ہند کے بعد کچھ لوگوں نے اسے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اپنے مطالبے کے حق میں انھوں نے کافی ہنگامہ کیا اور اس دوران مجسمے کو نقصان بھی پہنچایا گیا۔ ہنگامہ کرنے والوں نے وہاں سبھاش چندر بھوش کا مجسمہ رکھ دیا۔ مجبوراً بھارتی حکومت نے بادشاہ کا مجسمہ وہاں سے ہٹا دیا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اسے کہاں رکھا جائے۔ ایک رائے یہ تھی کہ اسے برطانیہ بھجوا دیا جائے، جس پر عمل نہ ہو سکا۔ دوسرا یہ حل تجویز ہوا کہ دہلی میں واقع برطانیہ کی ایمبسی میں رکھا جائے لیکن وہاں اتنی جگہ نہ تھی۔ بالآخر اسے آخری چارہ کار کے طور پر ایک ایسی جگہ پر رکھا گیا جہاں اور بہت سارے مجسمے رکھے ہوئے تھے، یہ ایک وسیع پارک ہے۔

اسے کہتے ہیں زمانے کی ناقدری۔ جب بادشاہ تھا تب اس کے لیے سب کچھ تھا، جب وہ بادشاہ نہ رہا تو اس کے مجسمے کے لیے جگہ بھی باقی نہ رہی۔

میں اور رنبیر صاحب کافی دیر تک وہاں پر رہے۔ ہم نے مختلف ناموں کو پڑھنے ہی میں اپنا

زیادہ وقت صرف کیا۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ تونہیں تھا۔ اس وقت دہلی میں یہ سب سے آسان پکنک پوائنٹ ہے جہاں آپ گزرتے ہوئے بھی رک سکتے ہیں۔ انڈیا گیٹ کے بارے میں David A. Johnson and Nicole F. Gilbertson نے اپنی کتاب *Commemorations of Imperial Sacrifice at Home and Abroad: British Memorials of the Great War* میں کافی تفصیل دی ہے۔ اس کتاب میں انڈیا گیٹ کے علاوہ بھی کئی اور یادگاری عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے بھی اس کتاب کے کچھ حصوں کا مطالعہ کیا ہے۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی دہلی: ایک مایہ ناز تعلیمی ادارہ

انڈیا جانے سے پہلے مجھے جن مقامات پر جانے کا شوق تھا ان میں ایک انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی دہلی بھی تھا، جسے عرف عام میں آئی آئی ٹی دہلی کہتے ہیں۔ جانے سے پہلے میں نے ڈاکٹر کھتری جو ٹیکسٹائل کے شعبے کے سربراہ تھے سے رابطہ کیا اوران کے ہاں آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میرا تعلق بھی ٹیکسٹائل سے ہونے کی وجہ سے انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہوگی کہ پاکستان سے ٹیکسٹائل سے تعلق رکھنے والے کوئی پروفیسر ہمارے پاس آئے۔

آج میں نے جن جگہوں پر جانا تھا ان میں ایک آئی آئی ٹی دہلی کا ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ بھی تھا۔ میں صبح دس بجے کے قریب آئی آئی ٹی دہلی پہنچ گیا۔ پہلی ہی نظر میں، جو میں نے دیکھا اس سے میرے ذہن میں موجود ادارے کے تصور کو تھوڑا سا دھچکا لگا۔ میرا خیال تھا کہ جتنا بڑا نام ہے اسی طرح کی عالی شان عمارت بھی ہوگی۔ بہت بڑے بڑے لان ہوں گے۔ رنگ برنگی عمارات ہوں گی۔ جیسا کہ ہم یہاں دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہماری پنجاب یونیورسٹی ہے۔ جب میں اس کے مین گیٹ سے اندر آیا تو اہم بات جو اس ادارے میں مجھے نظر آئی وہ یہاں کی سادگی تھی۔ جس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے لگا کہ شاید اس ادارے کی صرف شہرت زیادہ ہے لیکن علم کے میدان میں اس کی کارکردگی بھی شاید سادہ سی ہی ہوگی۔

ان ہی خیالات کے ساتھ میں ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ چلا گیا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب نے خوش آمدید کہا۔ یہ ٹیکسٹائل سے متعلقہ پاکستان کے کسی بھی پروفیسر کا ان کے ادارے کا پہلا دورہ تھا۔ میں ان سے ٹیکسٹائل کی تعلیم اور ریسرچ کے بارے باتیں کرتا رہا۔ اس ادارے میں ایک اور صاحب بھی کام کرتے ہیں جن کا نام ڈاکٹر سید اشتیاق ہے۔ اس دن وہ وہاں موجود نہیں تھے اس لیے ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں بتاؤں، میں علمی دنیا کی ایک خوب صورت اور سچی کہانی آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

ایک صاحب جن کا نام این ایم سرکار تھا، وہ وائسرائے کی قائم کردہ ایجوکیشن کمیٹی کے ممبر تھے۔ یہ تقسیمِ ہند سے پہلے کی بات ہے۔ انھوں نے 1945ء میں حکومت ہند کو یہ تجویز پیش کی کہ ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ بنایا جائے۔ اس دوران آزادیِ ہند کا واقعہ رونما ہوگیا اور یوں اس تجویز پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ چند سال کی تاخیر سے 1950ء میں مغربی بنگال کے ایک صنعتی شہر کھڑگپور میں پہلا انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بنایا گیا۔ اس ادارے نے اپنے علاقے کے لوگوں کی بے حد خدمت کی۔ اس کی کامیابی دیکھ کر حکومت ہند نے اس طرح کے مزید ادارے بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے اس مقصد کے لیے مغربی ممالک اور روس سے مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان ممالک نے ایسے ادارے بنانے کے لیے دل کھول کر تعاون کیا۔ روس کی مدد سے سب سے پہلا ادارہ آئی آئی ٹی بمبئی بنایا گیا۔ اس کے بعد مغربی جرمنی، امریکہ اور برطانیہ کی مدد سے مدراس، کانپور اور دہلی میں ایسے ادارے بنائے گئے۔

ابتداء میں ان کی تعداد چھ تھی لیکن 2004ء کے بعد دس مزید ایسے ادارے بنائے گئے۔ اس طرح بھارت میں اب انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے نام سے سولہ ادارے موجود ہیں۔ آئی آئی ٹی دہلی کے لیے تمام تر معاونت برطانیہ نے فراہم کی اور 1959ء میں پرنس فلپ نے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور صرف دو سال بعد 1961ء میں پہلا داخلہ ہوا۔

علمی دنیا میں ان اداروں کی اب کیا پوزیشن ہے؟ یہ جاننے کے لیے کوالٹی سٹینڈرڈز کے مطابق دنیا کی ٹاپ یونیورسٹیز کی فہرست (جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے) کو دیکھتے ہیں۔ اس

فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ آئی آئی ٹی بمبئی 152 نمبر پر اور آئی آئی ٹی دہلی 182 نمبر پر، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس 184 نمبر پر، آئی آئی ٹی مدراس 271 نمبر پر، آئی آئی ٹی کھڑگپورہ 281 نمبر پر اور آئی آئی ٹی کانپور 291 نمبر پر ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت کی ان چھ آئی آئی ٹیز میں سے پانچ کا شمار دنیا کی پہلی تین سو یونیورسیٹیز میں ہوتا ہے۔ جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھارت کے اندر اور بھارت سے باہر بھی ان اداروں نے علم کی دنیا میں کتنا بڑا نام کمایا ہے۔ اس لسٹ میں پاکستان کی ایک یونیورسٹی، نسٹ کا نمبر 400 ہے۔ اس میں ہمارے لیے بھی ایک سبق ہے جو ہمیں سیکھنا ہوگا کیونکہ ہم میں بھی دنیا میں باعزت طریقے سے زندہ رہنے کی خواہش تو موجود ہے۔ آئی آئی ٹی کے بارے میں مزید معلومات ان کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

اس یونیورسٹی کا ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ بھی علم کی دنیا میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ کھتری صاحب نے بتایا کہ ان کے شعبے میں سولہ پی ایچ ڈی ڈاکٹرز کام کر رہے ہیں۔ یہ 1996ء کی بات ہے جب پاکستان کی پہلی ٹیکسٹائل یونیورسٹی بنی تھی۔ یہ بھی کوئی نئی یونیورسٹی نہیں تھی بلکہ ٹیکسٹائل کالج فیصل آباد کو (جس کا سنگ بنیاد 1959ء میں صدر ایوب خان نے رکھا تھا) ہی اپ گریڈ کیا گیا تھا۔ میری تعلیم بھی اسی کالج سے ہے۔ اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملنے سے پہلے یہاں سے تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کو ڈگری انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور جاری کرتی تھی۔

جب کھتری صاحب نے مجھے اپنی لیبز دکھائیں تو مجھے عمارت کی سادگی بھول گئی اور مجھ پر ان کے علم کی گہرائی کا بہت گہرا اثر ہوا۔ میں نے ان کے طالب علموں کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا۔ اس وقت میں لاہور میں واقع یو ایم ٹی میں پڑھاتا تھا، اس لیے ہمارے درمیان باہمی دلچسپی کے کئی موضوعات تھے۔ میں نے ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ میں ہونے والی ریسرچ کا جائزہ لیا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے اور ان کے تعلیمی کام کے درمیان بہت واضح فرق ہے، جسے ختم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اس وقت آئی آئی ٹی دہلی کو ایک مکمل آزاد اور خود مختار ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ ادارہ 30 فیصد تک غیر ملکی طلبہ کو اپنے ہاں داخلہ دے سکتا ہے۔ میں وہاں ایک مناسب وقت گزارنے کے بعد اس عزم

کے ساتھ واپس ہوا کہ اللہ کرے ہم بھی پاکستان میں ایسا کوئی ادارہ بنا سکیں۔اس کے بعد میں جب بھی بھارت گیا تو اِس ادارے میں ضرور گیا اور میری مختلف لوگوں سے ملاقات بھی رہی ۔ بعدازاں ڈاکٹر اشتیاق سے بھی ملاقات ہوئی، وہ ٹیکسٹائل ریسرچ کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام ہیں۔

جب میں یونیورسٹی سے باہر نکلا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اگر ظاہری شان وشوکت پر زور دیا جائے تو بعض اوقات اصل مقصد سے توجہ ہٹ جاتی ہے!

❁ ❁ ❁

قطب مینار

مسجد قوت الاسلام، حوض خاص

قطب مینار آٹھ سو سال پرانا تاریخی مینار ہے جو نیو دہلی کے مغرب میں علاقہ مہرولی میں بنایا گیا تھا۔ مہرولی میں قطب مینار کے ساتھ مسجد قوت الاسلام بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ وہاں پر اور بھی کئی پرانی عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی وقت یہاں پر ایک راجہ کا قلعہ بھی تھا جس کا نام لال کوٹ تھا۔

آج میں نے قطب مینار اور اس کے قرب و جوار میں واقع مختلف تاریخی مقامات کو دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میں جب اس علاقے میں گیا تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ ایک بہت وسیع علاقہ ہے اور دہلی شہر کی نسبت اونچائی پر بھی واقع ہے۔ میں نے اس علاقے میں چند مقامات پر پتھر کی کٹائی وغیرہ کا کام بھی ہوتے دیکھا تھا (جو بعد میں پتہ چلا کہ بند کر دیا گیا ہے)۔ اس سے مجھے تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی موجود ہیں۔ مجھے مہرولی کو دیکھ کر یوں لگا کہ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے دفاعی نقطۂ نظر سے یہ ایک محفوظ مقام تھا۔ اسی لیے یہاں پرانے وقتوں میں حکمرانوں نے قلعہ بنایا تھا۔ میں جب قطب مینار پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں پر بے شمار لوگ موجود تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ایک بہت ہی مشہور پکنک پوائنٹ ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس جگہ کے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ اس کی مختصر تاریخ آپ کے سامنے رکھ دی جائے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن سات شہروں کو ملا کر دلی شہر آباد کیا گیا، ان میں مہرولی بھی شامل تھا۔ قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں مسلمان سلطنت کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ جب میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ قطب الدین ایبک نے یہ کام کیسے کیا تو مجھے بڑی ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ بہت ہی آسان الفاظ میں انھیں آپ کے سامنے پیش کروں۔

محمود غزنوی 971ء میں موجودہ افغانستان کے ایک شہر غزنی میں پیدا ہوا اور اپنے علاقے میں غزنوی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کا مزار بھی غزنی ہی میں ہے۔ اس نے 1001ء میں تیس سال کی عمر میں شمالی اور وسطی ہندوستان پر اپنا پہلا حملہ کیا۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر کل سترہ حملے کیے لیکن اس نے یہاں اپنی کوئی حکومت قائم نہیں کی۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے لاہور میں اپنے گورنر مقرر کر رکھے تھے جو اس کی غیر حاضری میں اس کے فتح کیے ہوئے علاقوں کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن اس کا یہ انتظام پشاور سے لے کر لاہور تک ہی تھا۔

محمود غزنوی حملہ کرتا اور بہت سا مالِ غنیمت سمیٹ کر واپس چلا جاتا۔ اس کا سومنات کے مندر پر حملہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ محمود غزنی کے حملوں کے 190 سال بعد محمد غوری نے دلی پر حملہ کیا۔ محمد غوری کا تعلق موجودہ افغانستان کے مرکزی حصے غور سے تھا جو کابل کے جنوب میں اور قندھار کے مغرب میں واقع ہے۔ اس نے یہاں پر کئی جنگیں لڑیں اور بہت سے مقامی ہندو حکمرانوں کو شکست دی۔ غوری کے متعلق ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ وہ پختون تھا یا ترک لیکن ایک بات طے ہے کہ اس کی مادری زبان فارسی تھی۔

اس نے اکثر حملے درہ گومل کے راستے کیے اور ملتان سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ اس لیے ملتان کو ہندوستان کا دروازہ بھی کہتے تھے۔ اس نے 1191ء میں خیبر پاس کے ذریعے ہندوستان پر ایک بڑا حملہ کیا اور ہریانہ کے علاقے تھانیسر کے پاس پرتھوی راج چوہان کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں تقریباً تین لاکھ کی تعداد میں راجپوت شریک تھے اور غوری کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار کی فوج تھی۔ ایک گھمسان کی جنگ کے بعد غوری یہ جنگ جیت گیا۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان میں اپنی سلطنت کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور افغانستان واپس نہ جانے کا

فیصلہ کیا اور دلی کو اپنے ایک ترک سردار، قطب الدین ایبک کے حوالے کر کے موجودہ پاکستان کے علاقے میں آ گیا۔ 1206ء میں جہلم کے علاقے میں اس کی وفات ہوئی اور جہلم کے پاس ہی سوہاوہ کے مقام پر اس کا مزار بنایا گیا جو اب بھی قائم ہے۔

اس کی وفات کے بعد اس کے گورنر قطب الدین ایبک نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا اور سلاطین دہلی کے نام سے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ یوں ہندوستان میں باقاعدہ ایک مسلمان ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ سلاطین دہلی کا راج کسی نہ کسی صورت میں 1206ء سے 1526ء تک شمالی اور وسطی ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں قائم رہا۔ تقریباً تین سو بیس سال سلاطین دہلی کے نام سے یہ حکومت چلتی رہی۔ پھر بابر نے ابراہیم لودھی کو (جو افغان تھا) شکست دے کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

قطب الدین ایبک نے اس علاقے کو فتح کرنے کی خوشی میں 1198ء میں مسجد قوت الاسلام کی تعمیر شروع کی۔ یہ مسجد ہندوستان کی سب سے پرانی مسجد تو شاید نہ ہو لیکن قدیم مساجد میں اس کا شمار ضرور ہوتا ہے۔ مسجد کے ساتھ قطب الدین ایبک نے ایک بلند مینار تعمیر کروانے کا بھی فیصلہ کیا جس کا نام قطب مینار رکھا گیا۔ یہ نام رکھنے کی وجہ ایک نہایت قابل احترام صوفی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ہیں۔ اتفاق سے بادشاہ کا نام بھی قطب تھا۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ قطب الدین ایبک لاہور میں پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر وفات پا گیا تھا۔ اگر آپ لاہور میں واقع لوہاری گیٹ کی طرف سے نئی انارکلی میں داخل ہوں تو آپ اپنے بائیں طرف قطب الدین ایبک کا مزار دیکھ سکتے ہیں۔ قطب الدین کی اچانک موت کی وجہ سے قطب مینار کی صرف تین منزلیں ہی بن سکیں۔ بعد میں اسے شمس الدین التمش نے مکمل کیا، کچھ کام بعد میں آنے والے بادشاہوں نے بھی کیے۔ شیر شاہ سوری بھی تعمیرات کا شوقین تھا، اس نے بھی قطب مینار کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالا۔

قطب مینار کی بلندی 240 فٹ ہے اور اس کی بنیاد کی چوڑائی پچاس فٹ کے قریب ہے جو اوپر جا کر نو فٹ رہ جاتی ہے۔ مینار کے اندر گول سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں جن کی تعداد 380

ہے۔ پہلے لوگوں کو اوپر جانے کی اجازت تھی لیکن 1981ء میں بھگدڑ کی وجہ سے بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔اس کے بعد سے اب اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے آپ صرف باہر سے ہی مینار کو دیکھ سکتے ہیں۔

میں کافی دیر تک اس مینار کے سامنے ایک جگہ بیٹھ کر اس کی کاریگری کو دیکھتا رہا۔آپ خود اندازہ کریں کہ اس وقت آمدورفت کے ذرائع بھی بہت کم تھے اور سائنس نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی لیکن اتنے بلند مینار کی سیدھ میں صرف بیس انچ کا ٹیڑھا پن ہے، جو خطرناک نہیں سمجھا جاتا، یہ کیسے ممکن ہوا؟ اس کام کے لیے جتنی مہارت اور علم کی ضرورت تھی اس کا صحیح اندازہ ماہرین تعمیرات ہی کر سکتے ہیں۔اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج سے ایک ہزار سال قبل بھی ہندوستان کے لوگوں کے پاس اتنا علم ضرور تھا جسے استعمال کر کے انھوں نے اتنی شاندار عمارتیں تعمیر کیں۔

مغلوں کی تعمیر میں نہ صرف بہت وسعت ہوتی ہے بلکہ پیسے کا استعمال بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔جبکہ اس مینار میں کاری گری کی انتہا ہے۔ یہ معمولی مینار نہیں ہے بلکہ اسے غور سے دیکھیں تو معلوم ہو گا اس کے چاروں طرف بہت خوب صورت کام کیا گیا ہے۔قرآنی آیات بھی لکھی ہوئی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے بہت ہی ذہین اور تربیت یافتہ کاریگروں نے بنایا ہے۔

ہندوؤں کا کہنا یہ ہے کہ اس جگہ پران کے ایک بھگوان وشنو کی چوتھی صدی کی نشانی بھی موجود ہے۔مختلف اوقات میں مینار کو آسمانی بجلی اور زلزلوں سے نقصان پہنچا لیکن اس کی مرمت بھی ہوتی رہی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مینار کی بالکل ٹاپ پر ایک کنوپی بنی ہوئی تھی جسے انگریز دور میں حفاظت کے نقطۂ نظر سے اٹھا کر نیچے رکھ دیا گیا اور اب وہ مینار کے پاس نیچے پڑی ہوئی ہے۔

مجھے اس مینار کو دیکھ کر احساس ہوا کہ یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ اُس وقت مسلمان سائنس نہیں جانتے تھے۔ایک ہزار سال پہلے دوسو چالیس فٹ بلند مینار کی تعمیر، جو آج بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہے، اس کے اوپر بے شمار نقش و نگار، اس کے لیے کتنی مضبوط بنیاد چاہیے تھی، کس طریقے سے سامان اوپر لے کر جانا تھا اور اس میں کیسا رنگ و روغن استعمال کرنا چاہیے تھا جو اب تک بھی موجود ہے، پتھر جوڑنے کے لیے کیا میٹریل استعمال کیا گیا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ تعمیراتی

انجینئرنگ سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یقیناً اِسے بنانے والے یہ سب معلومات بہت اچھے طریقے سے رکھتے تھے تب ہی انھوں نے ایک ایسا مینار بنایا جو آٹھ سو سال سے زلزلے بھی برداشت کر رہا ہے اور گرمی سردی میں بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

عمومی طور پر ایک بات کہی جاتی ہے کہ کتنا اچھا ہوتا اگر اس مینار کی جگہ پر ایک بڑی درسگاہ ہوتی۔ میں تو یوں کہوں گا کہ مینار کے ساتھ درسگاہ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ مینار کی اہمیت اپنی جگہ اور یونیورسٹی کی ضرورت اپنی جگہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

میں آج تک جن عمارتوں کی کاریگری سے متاثر ہوا، ان میں یہ عمارت بھی شامل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ تصاویر سے اس عمارت کی شان وشوکت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ مینار دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے کیونکہ کہ اس کی اونچائی بہت زیادہ اور چوڑائی کم ہے۔ اسی وجہ سے تصاویر سے اس کا اصل حسن ظاہر نہیں ہوتا۔

قطب مینار کے متعلق ایک بہت ہی مفید مضمون مرینا لینی راجا گوپلان *A Medieval Monument and Its Modern Myths of Iconoclasm: The Enduring Contestations over the Qutb Complex in Delhi, India* کے نام سے ایک کتاب میں لکھا ہے۔ یہ ایک انتہائی مفید کتاب ہے۔ میں نے اس کتاب میں بھی پڑھا ہے کہ چند ہندوؤں نے مسجد قوت الاسلام میں ہندو طریقے سے عبادت کرنے کا اعلان بھی کیا۔ جس کی عام لوگوں نے سخت مخالفت کی۔

مسجد قوت الاسلام: برِصغیر کی ایک قدیم مسجد

یہ مسجد بہت بڑے صحن کے ساتھ ایک عمارت پر مشتمل ہے۔ اس کی تعمیر مینار سے بھی پہلے 1198ء میں شروع ہوئی تھی۔ ایک عجیب بات میرے لیے باعثِ حیرت تھی اور آپ بھی اسے آسانی سے قبول نہ کر سکیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب میں مسجد کی سیر کر رہا تھا تو میرے گائیڈ نے بتایا کہ ستائیس مختلف مندروں کو توڑ کر اس مسجد کے ستون بنائے گئے تھے۔ میں نے اس کا

چہرہ غور سے دیکھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے لگا شاید یہ ایک ہندو ہے اور میں مسلمان ہوں اسی لیے وہ جان بوجھ کر ایسی بات کر رہا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مندروں کا سامان مساجد میں استعمال ہوا ہو؟ قطب الدین ایبک تو خود ایک بہت ہی مذہبی آدمی تھا اور اس کی خواجہ بختیار کاکی سے بھی بہت زیادہ عقیدت تھی۔ گائیڈ نے میری بات سن کر کہا کہ میں آپ کو کچھ چیزیں دکھاتا ہوں۔ اس نے مسجد کے چاروں طرف برآمدے میں لگے ہوئے بے شمار ستون دکھائے جن پر مختلف بتوں کی تصویریں تھیں جو عام طور پر مندروں میں ہوا کرتی ہیں۔ ان میں سے متعدد تصاویر کو کھرچ کر ختم کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن کچھ تصاویر تاحال موجود تھیں۔

آج یہ سفرنامہ لکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ اسی طرح کا واقعہ میرے ساتھ مسجد قرطبہ میں بھی پیش آیا تھا۔ جب میں مسجد قرطبہ اسپین کے اندر جانے لگا تو گیٹ پر موجود سپاہی نے کہا کہ اب یہ کیتھڈرل ہے، مسجد نہیں اور آپ اس میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ جب میں مسجد قرطبہ کے اندر گیا تو دیکھا کہ وہاں کی ساری ترتیب ایک چرچ کی سی تھی یعنی کرسیاں وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں ایک مختصر سی جگہ بند کی ہوئی تھی جہاں مسجد کے آثار نظر آرہے تھے، یعنی محراب بنی ہوئی تھی لیکن نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

سپین کے عیسائیوں کا بھی یہی کہنا تھا کہ اس وقت کے مسلمانوں نے گرجے کی جگہ کو زبردستی خرید کر مسجد میں تبدیل کیا تھا۔ قرطبہ کی انتظامیہ کے حکم کے مطابق زمین پر سجدہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔۔۔ لیکن ہوا میں سجدہ کرنے سے کون روک سکتا تھا۔۔۔ سو میں نے کھڑے کھڑے نماز عصر ادا کی۔۔۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔۔۔

میں نے گائیڈ سے مزید جاننا چاہا تو اس نے بتایا کہ اس مسجد کے برآمدے میں جتنے بھی ستون ہیں سب ہندوؤں اور جین مندروں سے لائے گئے ہیں۔ میرے لیے ان سب پر یقین کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا پھر میں انکار کیسے کرتا؟ اس نے مجھے

یہ بھی بتایا کہ ہندوؤں اور جین مت کے ماننے والوں کے بے حد اصرار پر اب یہاں کوئی مسلمان نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اب یہ مسجد صرف ایک تفریح گاہ ہے۔ جب تک مسلمانوں کی حکومت تھی تو یہ مسجد آباد تھی لیکن جب اُن کی حکومت آئی جن کے مندر توڑے گئے تھے تو مسجد کو بند کر دیا گیا۔ اب اس کا نام مسجد قوت الاسلام ہے لیکن درحقیقت یہ ایک تفریح گاہ ہے۔

یہ سب دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ جہاں پر ایک مسلمان بادشاہ اتنا بڑا مینار بنا سکتا تھا کہ جس کی دنیا میں اُس وقت کوئی مثال نہیں ملتی تھی اس کے لیے کیا ممکن نہیں تھا کہ وہ مسجد کے لیے بھی نئے ستون بنواتا اور کسی مندر کی کوئی چیز اٹھا کر یہاں نہ رکھتا؟ اگر قطب الدین ایبک نے ایسا کیا ہوتا تو آج میں اس مسجد میں نماز ادا کرسکتا تھا۔ میرے خیال میں دنیا میں یہ دو مساجد ہیں جو بنی تو مساجد تھیں لیکن ان میں نماز نہیں ہوتی۔

آہ۔۔۔ کاش ایسا نہ ہوتا اور ہم اس میں نماز پڑھتے اور آج کسی کو اسے بند کرنے کی ہمت نہ ہوتی!

لوہے کا ایک ستون: جو کتنا پرانا ہے کوئی نہیں جانتا: مسجد کے صحن میں ایک لوہے کا بہت بڑا ستون تھا، کسی کو یہ معلوم نہیں یہ ستون کہاں بنا اور کب یہاں لایا گیا۔ اس کے اوپر نا قابلِ شناس تحریریں لکھی ہوئی تھیں۔ اس کی اونچائی چوبیس فٹ کے قریب ہے اور اس کے وزن کا بھی کسی کو صحیح اندازہ نہیں ہے۔ سائنس کی دنیا میں یہ ایک بہت ہی عجیب وغریب بات ہے کہ اس ستون کو کسی بھی طرح کا زنگ نہیں لگتا۔ بہت سے لوگوں نے اس پر تحقیق کی ہے اور وہ اس بات پر قائل ہوئے کہ جب ہزاروں سال پہلے اسے بنایا گیا تھا تو اس وقت کے لوگ سائنس کو بہت اچھے طریقے سے سمجھتے تھے۔ اسے بناتے ہوئے کس طرح کے کیمیکل استعمال کیے گئے، ان کا کسی کو اب تک کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے دیکھا کہ اس پر کوئی رنگ نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے اوریجنل کلر میں تھا۔

قطب مینار سے ذرا فاصلے پر ایک نامکمل مینار ہے اسے علاؤالدین کا مینار کہتے ہیں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی نے یہ سوچا کہ وہ بھی ایک مینار بنائے گا جو قطب مینار

سے دوگنا بلند ہوگا۔ اس پر کام بھی شروع کیا گیا لیکن ابھی اس کی پہلی منزل ہی بنی تھی کہ سلطان علاؤالدین خلجی وفات پا ہو گیا اور وہ مینار نامکمل ہی رہا۔ میں اس نامکمل مینار کے پاس کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ ہماری بھی بے شمار ایسی حسرتیں ہوتی ہیں جو نامکمل رہتی ہیں۔۔۔ ایسی ہی حسرت ایک بادشاہ کی بھی تھی۔۔۔ جو نامکمل رہی۔

اگر آپ کو تاج محل جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھ سکتے ہیں تاج محل سفید سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں کالے سنگ مرمر کا ایسا ہی ایک اور تاج محل بنانا چاہتا تھا۔ اس کی بنیادیں بھی کھودی گئیں، پتھر بھی ڈالا گیا لیکن وہ بھی مکمل نہ ہوسکا۔ میں نے وہ نامکمل مینار آگرہ کے قلعے سے دیکھا ہے وہ دریائے جمنا کے پار دوسری طرف ہے۔۔۔

ابھی تک نامکمل ہے۔۔۔ شاید کسی شاہجہاں کا منتظر ہے جو اپنی بیوی کی خاطر اسے مکمل کردے!!!

یہاں پر بے شمار دوسری عمارتیں موجود تھیں جنھیں دیکھتے دیکھتے خاصا وقت گزر گیا۔ آج میرے ساتھ رنبیر سنگھ مانگٹ بھی نہیں تھے اس لیے میں نے آج اکیلے ہی سیاحت کی اور پھر وہاں سے نکل آیا۔ مینار سے دور آکر میں رکا اور ایک دفعہ پھر مینار کو دیکھا اور کتنی ہی دیر دیکھتا رہا۔ جب آپ مینار کے پاس ہوتے ہیں تو آپ جتنا مرضی سر اٹھالیں آپ مینار کی آخری منزل نہیں دیکھ پاتے لیکن اگر آپ دور سے دیکھیں تو آپ مکمل مینار دیکھ سکتے ہیں۔ جس سے آپ کو اس کے حسن کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اس کی اونچائی کا اندازہ لگانا ہو تو آپ اس طرح سے کر سکتے ہیں کہ مینار پاکستان لاہور کی اونچائی تقریباً 230 فٹ جبکہ قطب مینار کی اونچائی 240 فٹ ہے۔ بادشاہوں کے بنائے ہوئے مینار کو دیکھ کر اب میں اپنی اگلی منزل کی طرف چل دیا۔ مینار کے متعلق ایک دلچسپ بات مشتاق یوسفی نے لکھی وہ کچھ یوں ہے: انسان اور پہاڑ میں فرق یہ ہے کہ پہاڑ دور سے چھوٹا اور قریب سے بڑا لگتا ہے جب کہ انسان دور سے بڑا اور قریب سے چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔

حوض خاص: دہلی میں ایک خاص مقام

اگر آپ نئی دہلی سے قطب مینار کی طرف جائیں تو پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر حوض خاص کا علاقہ ہے۔ اسے حوض خاص گاؤں بھی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں حوض پانی کے ایک چھوٹے تالاب کو کہا جاتا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کے دور میں منگولوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس علاقے میں ایک قلعہ بنایا گیا تھا جس کا نام سری ہے۔ اس قلعے کو پانی مہیا کرنے کے لیے ایک تالاب بنایا گیا تھا جس کا نام حوض خاص رکھا گیا تھا۔ یہ علاقہ نئی دہلی کے جنوب میں واقع ہے جواب دہلی کا ایک بہت ہی پوش ایریا ہے۔ اسی علاقے میں گریٹر کیلاش کے نام سے بہت ہی اعلی پائے کی ایک رہائشی کالونی بھی بنائی گئی ہے۔

میں جب بھی نئی دہلی سے قطب مینار کی طرف جاتا تو یہ علاقہ میرے راستے میں پڑتا تھا۔ خواہش کے باوجود میں اسے تفصیل سے نہ دیکھ سکا۔ یہ علاقہ بھی خاصا وسیع ہے اور اسے دیکھنے کے لیے وقت بھی کافی درکار تھا۔ البتہ کچھ چیزیں فاصلے سے دیکھنے کا ضرور موقع ملا جن کا مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔

حوض خاص دہلی کا یہ سب سے وسیع اور سرسبز علاقہ ہے جس کے درمیان ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ اس علاقے کا رقبہ تقریباً ایک سوتیس ایکڑ ہے جہاں پر حکومت دہلی نے ہرنوں کے لیے ایک پارک بھی بنایا ہوا ہے۔ جس میں ہرنوں کے ساتھ ساتھ بے شمار پرندے بھی موجود ہیں۔ دہلی کا یہ وہ مقام ہے جہاں سب سے زیادہ سبزہ پایا جاتا ہے۔ جھیل کے اردگرد پرانے درختوں کی طویل قطاریں بھی موجود ہیں۔ یہاں آ کر آپ کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ آپ ایک مصروف شہر میں موجود ہیں۔ اس علاقے کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ علاقہ ہے جو خالصتاً ترکوں نے آباد کیا۔ جب میں اس کے قریب سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ بے شمار لوگ خاص طور پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک بڑے تالاب کے اردگرد بیٹھے تھے۔ ایک دفعہ میں یہاں سے گزر رہا تھا اور میرے پاس کچھ وقت بھی تھا، ایسی صورت میں مرکزی تالاب کے پاس کچھ وقت گزارنا

اچھا لگ رہا تھا۔لہٰذا میں تالاب کے پاس جا کر ایک جگہ گھنے درخت کے نیچے کچھ دیر کھڑا رہا۔

ذرا تصور کیجیے کہ آپ کے سامنے ایک وسیع و عریض تالاب ہو جو صدیوں پہلے ترک حکمرانوں نے بنایا ہو، اس کے ارد گرد انتہائی اونچے اور قدیم درخت ہوں، بیسیوں قسم کے پرندے چہچہا رہے ہوں، دنیا و جہان سے بے فکر نوجوان جوڑے ارد گرد تشریف فرما ہوں اور سب سے بڑھ کر انتہائی پرسکون ماحول۔۔۔

ایسے منظر کو بھول جانا ممکن نہیں ہوتا! اس منظر کو میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکا۔

ایسے منظر کی ایک جھلک مال روڈ سے کینٹ کی طرف جاتے ہوئے آپ کو نظر آتی ہے۔ جلو پارک بھی ایک سرسبز جگہ ہے لیکن حوض خاص اس سے کہیں زیادہ سرسبز ہے۔ حوض خاص کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اُن سات شہروں میں سے ایک ہے جنھیں ملا کر دلی شہر بسایا گیا تھا۔ باقی شہروں میں گڑگاؤں، فرید آباد، غازی آباد وغیرہ شامل ہیں۔ وائی ڈی شرما نے دہلی اور اس کے مضافات کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جسے آرکیالوجی سروے آف انڈیا نے چھاپا ہے۔ اس میں باب نمبر چودہ میں حوض خاص کے متعلق تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔

ہندوستان میں مختلف مقامات کو دیکھنے کے بعد میرا یہ احساس مزید پختہ ہوا ہے کہ وسطی ایشیا سے آنے والے حکمرانوں کے اندر خوش نما ماحول اور عالی شان عمارتیں بنانے کا بے حد شوق تھا اور ان کو اس کا سلیقہ بھی آتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے جو بھی چیزیں بنائی وہ صدیوں سے قائم ہے اور اب بھی اُن کا حسن لوگوں کے دلوں کو بے حد بھاتا ہے۔

اس علاقے میں ایک بہت ہی دلچسپ جگہ ہے جس کا نام چور مینار ہے۔ میرے علم کے مطابق ایسا مینار دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہ اینٹوں اور پتھر سے بنا ہوا ایک مینار ہے۔ اس کی اونچائی بھی تیس فٹ کے قریب ہوگی جبکہ چوڑائی بھی زیادہ نہیں ہے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب خلجی بادشاہ کسی کو موت کی سزا دیتا تھا تو اس کا سر کاٹ کر یہاں لٹکا دیا جاتا تھا۔ ابتداء میں یہاں چوروں کو سزا دی جاتی تھی۔ بعدازاں اس نے اپنے دشمنوں کو، جن میں منگول بھی شامل تھے، ایسی ہی سزا دینا شروع کر دی۔

میرا جی تو چاہتا ہے کہ میں ایسی باتیں نہ لکھوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور سب ہی لوگ اسے جانتے ہیں۔سزا دینا یا نہ دینا ایک فیصلے کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن سر کاٹ کر لٹکانا ہر لحاظ سے قابل مذمت ہے۔ یہ سب کچھ ایک مسلمان بادشاہ نے کیا۔ایسے کاموں سے غیر مسلم کیا تاثر لیتے ہوں گے؟ میں نے ایک ہندو کو یہ بھی کہتے سنا کہ یہ کیسے مسلمان تھے؟ میں نے اس سے کہا کہ اسلام میں ایسے کسی فعل کی کوئی اجازت نہیں ہے، یہ ان مسلمان بادشاہوں کا ذاتی فعل تھا جو یقیناً اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔

یہ مینار اب بھی موجود ہے اور ہمارے مسلمان بادشاہوں کے ایک ناپسندیدہ فعل کی گواہی دے رہا ہے۔اب حال یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے ایسے ناپسندیدہ کاموں کی سزا ہندو طاقت میں آنے کے بعد دہلی میں رہنے والے غریب مسلمانوں کو دے رہا ہے۔فروری 2020ء میں دہلی میں مسلمانوں پر ظلم کی آخیر کی گئی جس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ یہ سب مسلمان بادشاہوں کے اسی طرح کے اقدامات کا نتیجہ ہے، یہ میرا خیال ہے ممکن ہے آپ کے نزدیک کوئی اور وجہ ہو۔

اس علاقے میں ایک نیلی مسجد بھی موجود ہے جس پر لگی ہوئی تختی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد سولھویں صدی کے آغاز میں بنائی گئی تھی۔اس وقت دہلی میں لودھی خاندان کی حکومت تھی۔ میں وہ مسجد تو نہ دیکھ سکا البتہ تصاویر ضرور دیکھی ہیں۔تصاویر سے لگتا تھا کہ یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے لیکن نہایت ہی دیدہ زیب ہے۔جس علاقے میں یہ مسجد ہے وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ نہیں ہے، اس لیے اس مسجد میں صرف جمعہ کی نماز ہی پڑھی جاتی ہے۔

سر گنگا رام ہسپتال دہلی اور جنتر منتر

میں جب پرانی دلی سے جنتر منتر کی طرف جا رہا تھا تو میں نے اپنے دائیں طرف سر گنگا رام ہسپتال کا بورڈ دیکھا۔سر گنگا رام کا نام پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، اس کی وجہ سر گنگا رام کی لاہور کے لیے انمٹ خدمات ہیں۔سر گنگا رام وہ شخصیت ہیں جنھیں میں خدمت اور تعمیراتی کارناموں کی وجہ سے اپنے ہیروز میں سے سمجھتا ہوں۔ان کا ایک مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

سر گنگا رام اگروال 1851ء میں مانگٹا نوالا تحصیل جڑانوالہ میں ایک پولیس آفیسر کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم امرتسر میں ہوئی۔ بعد میں آپ نے سول انجینئرنگ میں گریجویشن کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ انگریز سرکار کے ساتھ بطور سول انجینئر کام کرنے لگے۔ اس دوران انھوں نے ساہیوال میں حکومت سے پچاس ہزار ایکڑ اراضی حاصل کی اور صرف تین سال کی محنت سے اسے زرخیز زمین میں بدل دیا۔

آپ نے 1921ء میں اندرون لاہور گنگا رام ہسپتال قائم کیا۔ موجودہ گنگا رام لاہور اسپتال کی جگہ بھی انھوں نے اپنی زندگی میں خرید کر وقف کر دی تھی۔ سر گنگا رام کی وفات 1927ء میں ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد 1943ء میں ان کے خاندان نے موجودہ گنگا رام ہسپتال کی تعمیر کی۔ 1944ء میں سر گنگا رام کے بیٹے بلک رام کے نام سے ایک میڈیکل کالج بھی بنایا گیا۔ آزادیِ ہند کے بعد یہ کالج بند کر دیا گیا اور بعد میں یہاں پر فاطمہ جناح میڈیکل کالج برائے خواتین بنایا گیا۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج بنانے کے لیے بلک رام اگروال میڈیکل کالج کی عمارت ہی استعمال میں لائی گئی۔

اس کا پرانا نام کیوں تبدیل کر دیا گیا؟۔۔۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ وہی بتا سکتے ہیں جنھوں نے تبدیل کیا۔۔۔

آزادیِ ہند کے بعد گنگا رام کا خاندان بھارت نقل مکانی کر گیا۔ سر گنگا رام کی اولاد نے دہلی میں بھی ایک گنگا رام اسپتال بنایا۔ اس طرح سے ایک شخص کا لگایا ہوا یہ پودا جسے آج ایک سو سال ہو چکا ہے، اس سے آج بھی لوگوں کی ایک کثیر تعداد مستفید ہو رہی ہے۔

یہ سب دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو بھی چیز اللہ کے بندوں کی بھلائی کے لیے بنائی جاتی ہے وہ تادیر قائم رہتی ہے۔ گنگا رام ٹرسٹ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

سر گنگا رام نے لاہور میں بہت سی عمارتوں کی ڈیزائننگ بھی کی اور ان کی تعمیر بھی ان ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ جنرل پوسٹ آفس، لاہور میوزیم، ایچی سن کالج، میو ہسپتال کا ایک وارڈ، ماڈل

ٹاؤن، نیشنل کالج آف آرٹس، رینالہ خورد کے اندر ہائیڈرو پاور پلانٹ ان میں سے چند ایک ہیں۔ ان کی بیش بہا خدمات کی وجہ سے حکومت برطانیہ نے ان کو سر، رائے بہادر اور نائٹ (Knight) کا خطاب دیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت زیادہ دولت کمائی اور اپنی زندگی میں ہی اسے لوگوں کی بھلائی کے لیے خرچ کر دیا۔

ہیلی کالج کا قیام بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ پنجاب میں ایک کامرس کالج ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے انگریز گورنر سے بات کی۔ اس نے کہا کہ جگہ نہیں ہے۔ جس پر سر گنگا رام نے اپنی کوٹھی دے دی۔ جس میں ہیلی کالج قائم کیا گیا۔ اس کالج کے افتتاح کے موقع پر کی گئی تقریر ہیلی کالج آف کامرس کی ویب سائٹ پر اب بھی موجود ہے۔ میں نے اس تقریر کو پڑھا ہے۔ یہ متاثر کن تقریر ایک شاہکار معلوم ہوتی ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اب بھی دہلی میں سر گنگا رام ٹرسٹ کی طرف سے لاہور میں واقع سر گنگا رام ہسپتال کی مالی امداد بھی کی جاتی ہے۔ وقت کی قلت کی وجہ سے میں یہ ہسپتال نہ دیکھ سکا، جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اس کے ساتھ میں نے دیکھا کہ وہاں مادام تساؤ کا میوزیم بھی موجود تھا۔ اس وقت تک میں نے لندن میں مادام تساؤ کا میوزیم نہیں دیکھا تھا۔ بعد ازاں مجھے 2008ء میں لندن میں یہ میوزیم دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ بہر حال اس وقت میری منزل جنتر منتر تھی۔

جنتر منتر: ستاروں کی گردش جاننے والا تین صدیاں قبل ایک مرکز

جنتر منتر دونوں ہندی کے لفظ ہیں۔ عام طور پر بچوں کو بہلانے والے جادوگر ایسے الفاظ بولتے ہیں۔ میرے لیے وہ جگہ جہاں پر علم و ہنر سے متعلقہ چیزیں پائی جائیں نہایت ہی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ جب میں نے جنتر منتر کے بارے میں پڑھا تو مجھے حیرانی ہوئی کہ کیسے تین صدیاں قبل جے پور کے مہاراجہ جے سنگھ نے پانچ مختلف شہروں میں اس طرح کی عمارتیں

بنوائیں، جہاں پر سورج اور ستاروں کی گردش دیکھی جاتی تھی اور اس کے مطابق کیلنڈر بنایا جاتا تھا۔ اس کام کے لیے مہاراجہ جے سنگھ نے ہندو اور مسلمان ماہرین پر مشتمل ایک ٹیم تشکیل دی جنھوں اس طرز کی عمارتیں بنائیں جن کے سائے سے تاریخ اور وقت معلوم کیا جاتا تھا۔ میں نے ایسا ہی ایک سن ڈائل چین میں بھی دیکھا تھا۔ ایک ٹیڑھی رکھی ہوئی بڑی پلیٹ کے اوپر لوہے کا ایک راڈ لگا ہوا تھا۔ جیسے جیسے سایہ اپنی جگہ بدلتا ویسے ویسے اس ڈائل پر لکھے ہوئے نمبروں سے وقت کا پتا چل جاتا تھا۔

دہلی کی یہ عمارت 1724ء میں بنائی گئی تھی۔ اس وقت نظام الملک آصف جاہ مغل بادشاہ تھا۔ اس عمارت کو جنگ آزادی میں کافی نقصان پہنچا لیکن اچھی حالت میں ہونے کی وجہ سے اب یہ ایک پکنک پوائنٹ بن گیا ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی حیرانی کی بات یہ تھی کہ کس طریقے سے انھوں نے یہ سن ڈائل بنایا جس کی اونچائی 70 فٹ اور لمبائی 114 فٹ ہے۔ وہ لوگ اس کی مدد سے بہت ساری معلومات حاصل کرتے تھے۔

آپ کو یہ جان کر بھی خوشی ہوگی کہ دنیا کے ایک بہت بڑے سائنس دان سٹیفن ہاکنگ نے 2001ء میں اپنے دورہ بھارت کے موقع پر یہ عمارت بھی دیکھی تھی اور وہ اس عمارت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھنے کے بعد اس نے یہ کہا تھا کہ قدیم زمانوں سے ہی اہلِ ہند ستاروں کے حساب کتاب میں سب سے آگے رہے ہیں۔ جنتر منتر میں چار بڑی عمارتیں ہیں جن سے بہت سی معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔ اس طرح کی چار مزید عمارتیں جے پور، متھرا، بنارس اور اوجین میں بھی بنائی گئی تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اُسی وقت ممکن ہوا ہوگا جب مہاراجہ اور مغل حکمرانوں نے مشترکہ طور پر کوشش کی ہوگی۔ یہ اس زمانے کی ایک بہت بڑی ایجاد تھی۔ اب تو خیر ٹیلی سکوپ کے ذریعے سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے، اس وقت صرف سائے کی گردش ہی سے ستاروں کی چال معلوم کی جاتی تھی۔ جنتر منتر پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جو ان لوگوں کے لیے بے حد دلچسپ ہیں جو

فلکیات کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میری دلچسپی ان لوگوں کو شاباش دینے تک تھی جنھوں نے تین صدیاں قبل یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ جنتر منتر کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بیری پرلس نے اپنی کتاب *Celestial Mirror: The Astronomical Observatories of Jai Singh* میں لکھا ہے۔ جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تجربہ گاہ کس پائے کی ہے۔

میں ان عمارتوں کے پاس بہت دیر تک کھڑا وہاں پر لگی تختیاں بھی پڑھتا رہا۔ جس پر اس جگہ کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ آپ شاید میری اس بات سے اتفاق نہ کریں کہ اہل ہند سائنس میں کبھی بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے اس بات کا اظہار ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی مختلف عمارتوں سے ہوتا ہے لیکن دنیا میں ہمارا یہی تاثر ہے کہ جب یورپ میں یونیورسٹیز بن رہی تھیں تو ہم محلات بنا رہے تھے۔ یہ بات درست ہے لیکن محلات بنانے کے لیے بھی سائنس کے علم کا ہونا بے حد ضروری تھا۔

آپ میری اس بات پر ضرور اتفاق کریں گے کہ اہل یورپ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم کو عام لوگوں تک پہنچایا جبکہ اہل ہند نے یہ علم لوگوں تک پہنچانے کے لیے ادارے قائم کرنے میں غفلت برتی۔ ایک اور بات جو عام طور پر کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں ہندوستان میں کوئی سائنسی ترقی نہیں کی۔ یاد رہے مسلمان کبھی بھی پورے ہندوستان کے حکمران نہیں رہے۔ بہت سے علاقوں کے حکمران مقامی لوگ ہی تھے۔ خاص طور پر جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کا عمل دخل بہت کم رہا ہے۔ اس لیے صرف یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے سائنس پر توجہ نہیں دی البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ حکمرانوں کو سائنسی علوم کو لوگوں تک پہنچانے میں جو خاطر خواہ کوشش کرنی چاہیے تھی، وہ انھوں نے نہیں کی۔

ایسا نہ کرنے کی سزا اب تک اہلِ ہند بھگت رہے ہیں۔۔۔ کاش! تاج محل کے ساتھ تاج یونیورسٹی بھی ہوتی تو بے حد خوب صورت لگتی!!!

تین مورتی: انگریز فوج کے سربراہ کی رہائش گاہ اور کناٹ پیلس

جب انگریزوں نے نئی دہلی کو آباد کیا تو انھوں نے وائسرائے کی رہائش گاہ کے ساتھ ساتھ

برطانوی آرمی چیف کی رہائش گاہ بنانے کا بھی فیصلہ کیا اس مقصد کے لیے ایک بڑی عمارت بنائی گئی۔ اس عمارت کی خوب صورتی یہ ہے کہ اس کے مرکزی دروازے پر تین سپاہیوں کے مجسمے بنائے گئے ہیں۔ بظاہر تو یہ کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن جب میں نے اس کی تاریخ پڑھنے کی کوشش کی تو بہت ہی دلچسپ بات معلوم ہوئی۔

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دنیا میں جہاں بھی انگریزوں کی لڑائی ہوتی تھی اس کے لیے برطانوی فوج میں ہندوستان بھر سے بھرتی کیے ہوئے لوگ جاتے تھے۔ 1918ء میں حیفہ نام کا ایک شہر فلسطین میں تھا جو ترکوں کے قبضے میں تھا اور یہ سلطنت عثمانیہ کا ایک اہم حصہ تھا، اب یہ اسرائیل کا تیسرا بڑا شہر ہے اور سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے بہت اہمیت کا حامل بھی ہے۔ اس شہر پر قبضے کے لیے انگریزوں اور ترکوں کی آپس میں ایک سخت لڑائی ہوئی، جس میں ہندوستان کے تین علاقوں جودھپور، میسور اور حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے مسلمان، ہندو اور سکھ سپاہیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس جنگ میں 44 ہندوستانی سپاہی اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ مرنے والوں میں مسلمان، ہندو اور سکھ تینوں شامل تھے۔ ان تینوں علاقوں کے فوجیوں کی یاد میں یہاں پر تین مورتیاں بنائی گئیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انگریز اپنے جاںنثاروں کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف کے گھر کے باہر تین فوجیوں کی مورتیوں کی وجہ سے اس عمارت کو تین مورتی کہتے ہیں اور اس چوراہے کا نام بھی تین مورتی چوک ہی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ کہ اُس وقت ایک طرف تو ہندوستانی مسلمان خلافت عثمانیہ کے بچاؤ کے لیے تحریک چلا رہے تھے، مسلمان خواتین اپنے زیور تک ترکی بھجوا رہی تھیں اور دوسری طرف انگریزوں کے تنخواہ دار ہندوستانی سپاہی جن میں مسلمان بھی شامل تھے، ترکوں کے ساتھ جنگ کر رہے تھے۔ اُن کی خدمات کے صلے میں انگریز اُن کی مورتیاں بنا کر اپنے گھروں کے سامنے رکھ رہے تھے۔

ہم کس طرف تھے؟ آپ خود ہی فیصلہ کریں تو بہتر ہوگا۔

یہ بات بھی کافی اہمیت کی حامل ہے کہ بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو 16 سال تک اس عمارت میں رہائش پذیر رہے اوراسی عمارت میں ان کی وفات بھی ہوئی۔ان کی وفات کے بعد یہاں پر جواہر لال نہرو انسٹیٹیوٹ اور لائبریری کے علاوہ اس طرح کی بہت ساری چیزیں بنائی گئی ہیں۔اس وقت یہ کسی کی رہائش گاہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑا کمپلیکس ہے۔

میں جب اس کے اندر گیا تو دیکھا کہ یہ بہت ہی عالی شان عمارت ہے۔آدمی اس کی شان وشوکت کو دیکھ کر ہی دنگ رہ جاتا ہے۔جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں عمارت کی نسبت اس سے جڑی ہوئی کہانی میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں۔مجھے خیال آیا کہ فوج کا حکومت میں عمل دخل کوئی نئی بات نہیں ہے۔اس کی بنیاد صدیوں پہلے ہندوستان میں رکھ دی گئی تھی۔یہ عمارت کسی بھی لحاظ سے وائسرائے کی رہائش سے کم نہیں ہے اوراس کا رقبہ بھی تیس ایکڑ سے زائد ہے۔

اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سپہ سالار اس وقت بھی کم اہم نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے!

ایک اور اہم بات یہ کہ 2018ء میں جب اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو بھارت آئے تو انھوں نے اس چوک کا نام تین مورتی حیفہ رکھنے کی فرمائش کی جو بھارتی حکومت نے مان لی۔اب اس چوک کا نام تین مورتی حیفہ رکھ دیا گیا ہے۔جب نریندر مودی اسرائیل گیا تو وہ حیفہ بھی گیا جہاں پر ہندوستانی فوجیوں کی قبریں ہیں۔کچھ حلقوں سے اس کی مخالفت بھی ہوئی لیکن بالآخر اسرئیل جیت گیا اوراس علاقے کا نام تین مورتی حیفہ رکھ دیا گیا ہے جو ہمیں یاد دلاتا رہے گا کہ سلطنت عثمانیہ کی تباہی میں ہم ہندوستانی لوگوں کا بھی ایک اہم کردار ہے۔

انگریزوں اور ترکوں کی لڑائی میں ہندوستانی لوگ مارے گئے۔اب بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔روس اور امریکہ کی جنگ میں افغان تباہ ہو گیا اور افغان مسلمان ان گنت تعداد میں مارے گئے۔۔۔

ہاتھیوں کی لڑائی میں نقصان تو گھاس ہی کا ہوتا ہے۔۔۔اور وہ آج بھی ہو رہا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ نئی نسل کی ذہنی تشکیل کرتا ہے تو اس میں یہ بات اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تاریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس علاقے میں خوشک نام کا ایک گاؤں آباد تھا جس میں جاٹ

لوگ رہتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے دور حکومت میں یہاں ایک شکارگاہ تیار کروائی تھی۔ اس شکارگاہ کی باقیات اب بھی موجود ہیں لیکن میں انھیں دیکھ نہ سکا۔ 1922ء میں اس گاؤں کو ختم کر کے تیس ایکڑ پر فوج کے سربراہ کا گھر بنا دیا گیا۔ میں بہت دیر تک وہاں پہ ٹھہرا رہا۔ ایک طرف فوج کے سربراہ کا گھر تو دوسری طرف پارلیمنٹ کی پرشکوہ عمارت اور تیسری طرف صدر کا محل نظر آ رہا تھا۔

یہ سب طاقت کے مراکز تھے۔۔۔ اور جو میں نے پچھلے دنوں میں دہلی کے پسماندہ علاقے دیکھے تھے وہاں رہنے والوں کے کندھے ان کی طاقت کا سرچشمہ تھے۔۔

ایک اچھی بات یہ ہے کہ نہرو کی موت کے بعد اب یہ وزیراعظم کا گھر نہیں ہے بلکہ ایک کمپلیکس ہے۔ یہاں آنے والے لوگوں کو ہندوستان کی آزادی کی تاریخ بتائی جاتی ہے اور اب یہ تین مورتی حیفہ چوک ہے جو بھارت اور اسرائیل کی گہری دوستی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ تین مورتی بارے ہندوستان ٹائمز نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ جس میں اس عمارت کے بارے میں کافی دلچسپ معلومات دی ہوئی ہیں۔

کناٹ پیلس: نئی دہلی کا تجارتی مرکز

انگریزوں نے جب نیو دہلی آباد کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے پارلیمنٹ ہاؤس، وائسرائے کی رہائش گاہ اور بہت سی دوسری عمارتوں کے ساتھ بہت ایک بڑی مارکیٹ بھی بنانے کا بھی فیصلہ کیا۔ جس کے لیے انگریزوں کو کئی گاؤں ختم کرنے پڑے۔ ایسا تو ہمیشہ سے ہی ہوتا آیا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے تیسرے بیٹے پرنس آرتھر نے، جو ڈیوک آف کناٹ ہونے کے ساتھ ساتھ کینیڈا میں گورنر جنرل بھی تھے، ہندوستان کے دورے کے موقع پر 1921ء میں کناٹ پیلس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس مارکیٹ کی تعمیر 1929ء میں شروع ہوئی اور 1933ء میں مکمل ہوئی۔ یاد رہے کہ کناٹ آئرلینڈ کا ایک صوبہ بھی ہے۔

کناٹ پیلس میں مارکیٹ ایک گول شکل میں ہے۔ یہ بہت ہی مصروف علاقہ ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بھارت کے اندر سب سے بڑی کمرشل مارکیٹ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دنیا کی دس بڑی مہنگی جگہوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ یہاں پر پالیکا بازار کے نام سے ایک زیر زمین

مارکیٹ بھی ہے۔

اس کی تعمیر کی تفصیل میں جانا تو مناسب نہیں ہے لیکن ایک بات بہت واضح ہے کہ انگریزوں نے نئی دہلی میں عمارتیں بناتے وقت ہندوستانی طرزِ تعمیر کا خاص خیال رکھا ہے لیکن کناٹ پیلس (Palace) کو انھوں نے بالکل اپنے برطانوی طرز پر بنایا ہے۔ اُسی طرز کے برآمدے اور گول ستون ہیں۔ مجھے اس مارکیٹ میں مال روڈ لاہور پر بنی ہوئی پرانی مارکیٹوں میں بے حد مشابہت محسوس ہوتی ہے۔ لاہور کا مال روڈ اور دہلی کی کناٹ پیلس ایک ہی دور میں بنائی گئیں ہیں جس کی وجہ سے ان کا طرزِ تعمیر بھی ایک ہی جیسا ہے۔

میں نے مارکیٹ کے پاس گردوارہ بنگلہ صاحب، ہندو مندر اور اس سے ملحقہ ایک پارک (جہاں بھارت کا ایک بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا) بھی دیکھا۔ مجھے ان تینوں چیزوں کی موجودگی سے احساس ہوا کہ یہ لوگ ایسے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جہاں پر اپنا دھرم اور وطنیت ظاہر نہ کریں۔ لاہور کی لبرٹی مارکیٹ بھی ایک سیمی سرکل میں ہے۔ اس سے پہلے گلبرگ لاہور میں مین مارکیٹ بھی ایک سیمی سرکل کی شکل ہی میں بنائی گئی تھی۔ کیا ہم نے کناٹ پیلس سے متاثر ہو کر لبرٹی اور مین مارکیٹ اُسی طرز پر بنائی ہیں یا محض اتفاق ہے؟ معلوم نہیں!

میری سب سے زیادہ دلچسپی انڈر گراؤنڈ مارکیٹ میں تھی۔ میں بڑی دیر تک لوگوں کو دیکھتا رہا۔ بے شمار لوگ خریداری کر رہے تھے لیکن اُن جگہوں پر سب سے زیادہ رش تھا جہاں چٹ پٹے کھانوں کی دکانیں تھیں۔ مجھے ایک نہایت ہی انوکھا پان دیکھنے کو ملا، جسے فائر پان کہتے ہیں۔ اِسے منہ میں ڈالنے سے پہلے آگ لگاتے تھے اور پان منہ میں جاتے ہی ٹھنڈا ہو جاتا!

اس مارکیٹ کے بارے میں ہندوستان ٹائمز میں Avishek G Dastidar نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں اس مارکیٹ کی ایک دلچسپ تاریخ دی ہوئی ہے۔ ایک اور مضمون میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کبھی یہاں پر ایک ایسا گاؤں بھی تھا جس کا نام راجہ کا بازار تھا۔ اب اس گاؤں کا علاقہ کناٹ پیلس میں شامل ہے۔

راجہ اور وائسرائے میں نام کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں ہے۔ دونوں کا کام حکمرانی کرنا ہے۔

ایسی جگہوں پر میری سب سے بڑی خواہش کسی کونے میں بیٹھ کر چائے یا کافی پینے کی ہوتی ہے۔ میں انڈر گراؤنڈ مارکیٹ کی چھت پر ایک درخت کے نیچے لگی کرسی میز پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ اس وقت میرے ذہن میں اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انگریزوں نے یہ سب کچھ کتنی ترتیب اور خوب صورتی سے بنایا ہے جس میں سو سال بعد بھی کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کیسے ممکن ہوا اور اُن کے پاس وہ کون سا خاص ہنر تھا جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غیر ملکی حکمران (جن میں ترک، افغان اور انگریز بھی تھے) چند ہزار کی تعداد میں آئے اور یہاں لاکھوں لوگوں پر انھوں نے ساڑھے سات سو سال تک حکومت کی۔ یاد رہے کہ 1206ء میں قطب الدین ایبک مسلمانوں کا پہلا بادشاہ بنا تھا اور 1947، یعنی 741 سال اس شہر پر غیر ملکی حکمرانوں کی حکومت رہی۔ ان غیر ملکیوں کی حکمرانی کی وجہ ان کی تعداد نہیں بلکہ وہ فنِ حکمرانی تھا جو ان کے پاس تھا اور ہمارے پاس نہیں۔

یہ بات شاید آپ کو مناسب نہ لگے لیکن مجھے آج بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب بھی غیر ملکی ہم پر بلواسطہ حکمرانی کر رہے ہیں۔ اب ان کا نام وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہیں، بلکہ آئی یم ایف اور ورلڈ بنک، یو این او کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی طرح کے نام ہیں۔ ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے وہی فنِ حکمرانی حاصل کرنا ہوگا تب جا کر ہم ایک آزاد قوم کہلوانے کے حق دار ہوں گے۔ اس سلسلے میں بھارت اور پاکستان کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس دوران میری چائے بھی ختم ہوگئی اور ٹیکسی ڈرائیور نے بھی اپنی گھڑی دکھا کر کہا کہ گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔۔۔ اس کی پتنی اس کا انتظار کر رہی ہے۔۔۔

نئی نئی شادی کے بعد شادی شدہ جوڑے کا خیال تو کرنا چاہیے۔

❁ ❁ ❁

الوداع دہلی

آج دہلی میں میرا آخری دن تھا اور میں نے حسب معمول یہ دن گھر والوں کے لیے خریداری کا رکھا تھا۔ کچھ لوگوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے بتایا کہ آپ کے لیے لالہ لاجپت رائے مارکیٹ بہت مناسب ہے۔ میں وہاں پر چلا گیا اور مجھے ایک ساڑھی پسند آ گئی جو دکاندار نے پلاسٹک کے مجسمے کو پہنا رکھی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ آپ یہ ساڑھی مجھے دے دیں۔ یہ ایک عام سی بات تھی لیکن اس موقع پر کچھ ایسا ہوا کہ جس نے اس خریداری کو بہت ہی خاص کر دیا جو شاید میں کبھی بھی بھول نہ سکوں۔

دوکاندار ایک نوجوان تھا، اس نے پلاسٹک کے مجسمے سے وہ ساڑھی اتارنے سے پہلے اس پر ایک کپڑا ڈالا پھر نیچے سے ہاتھ ڈال کر ساڑھی کو نکالا۔ میں یہ سب دیکھتا رہا۔ میری حیرانی کو بھانپ کر دکاندار نے کہا: میں نہیں چاہتا کہ خاتون کے پلاسٹک کے مجسمے کو بھی کوئی برہنہ دیکھے۔ مجھے یہ بہت ہی اچھا لگا۔ پاکستان آ کر میں نے یہ ساڑھی اپنی اہلیہ محترمہ کو پیش کی۔ وہی جواب ملا جو پہلے بھی ملتا رہا اور آج بھی مل رہا ہے جب تک زندگی ہے ایسا ہی جواب ملے گا۔

ان کا جواب تھا کہ آپ کو تو رنگوں کی پہچان نہیں ہے۔ ایسے بے شمار رنگ تو پہلے ہی سے میرے پاس ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ آپ کیا اٹھا لائے ہیں؟ کیا میں یہ پہن کر لوگوں سے ملوں گی؟ فلانی کا شوہر بھارت گیا تھا وہ اتنی خوب صورت ساڑھی لے کر آیا تھا۔ میں کیا بتاؤں گی اور اسی طرح کے بیسیوں اور تبصرے۔۔۔

لیکن کیا کریں کچھ تو لانا ہوتا ہے۔ یہ سب سن کر میں ایک ہی بات پوچھتا ہوں مجھے کیوں

اور کیسے پسند کر لیا تھا؟ میرے میں کون سا رنگ تھا جو آپ کو پسند آ گیا تھا؟ جواب سوائے خاموشی کے کچھ نہیں ہوتا۔

میں کچھ لانے سے باز نہیں آتا اور ان کو ہماری لائی ہوئی کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ زندگی کے 37 سال ایسے ہی گزر گئے اور باقی کے بھی اسی طرح سے گزرنے کی امید ہے۔

آپ کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے؟

یقیناً مختلف نہیں ہوگا۔۔۔ مجھے پوری امید ہے۔

میں ایک چادر اپنی ماں کے لیے لایا تھا جو انھوں نے تین مرتبہ چومی، پھر اپنے صندوق میں سنبھال کر رکھ لی، کہنے لگیں کہ میں اسے عید والے دن لوں گی، خوشی خوشی لوگوں کو بتاؤں گی کہ یہ کتنی خوب صورت ہے اور میرا بیٹا بھارت سے لایا تھا۔۔۔ یہ چادر میرے دیس سے آئی ہے، جہاں کی میری پیدائش ہے، جہاں میرا بچپن گزرا اور جو میرا پہلا وطن تھا۔ جسے ہم نے صرف دیس کے نام سے ہی یاد رکھا لیکن جسے ہمیں چھوڑنا پڑا، رات کی تاریکی میں، جہاں ہم نے سکھ بن کر، اپنا دھرم چھپا کر اور اپنے ہی گھر میں چھپ کر جان بچائی تھی۔

بس یہی فرق ہوتا ہے اپنی ماں اور بچوں کی ماں میں!

اگلے دن شرما جی مجھے ائیر پورٹ چھوڑنے آئے اور انھوں نے گاڑی دوبارہ اسی جگہ پارک کی جہاں پہلے دن کی تھی۔ سات روز میں کیا فرق پڑ سکتا تھا؟ خیریت سے گھر واپس پہنچنے پر اللہ رُب العزت کا بے حد شکر ادا کیا۔

دہلی سے فرید آباد

فروری 1999ء میں بھارت کے شہر چنائی میں ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ برطانیہ کی سالانہ کانفرنس منعقد ہونا تھی۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے کا پروگرام بنایا۔ کانفرنس میں شرکت تو ایک بہانہ تھی، اصل مقصد تو بھارت کی سیر تھا۔ اس سفر میں میرے ساتھ انتہائی قابل احترام برادرم وقاص انجم جعفری کے علاوہ ایک قریبی دوست عمر فاروق شیخ بھی تھے۔ ہم تینوں نے بھارت میں دو ہفتے گزارے۔ پہلے چند دن تو دہلی میں رہے پھر ایک دن کے لیے بذریعہ بس آگرہ گئے۔ دہلی سے

چنائی تک ایک طویل سفر ٹرین پر کیا، تین دن چنائی میں رہے، پھر چنائی سے ممبئی اور ممبئی میں دو دن گزارنے کے بعد بذریعہ ٹرین دہلی واپس آ گئے۔ اس طرح سے ہمیں بھارت کے کئی علاقے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اس سفر کی رُوداد اپنی کتاب بھارت کے چار سفر کے حصہ دوم میں لکھ چکا ہوں۔ البتہ دہلی سے فرید آباد تک کے سفر کی روداد پیشِ خدمت ہے۔

ہم لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچے۔ قارول باغ کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ دو دن تک دہلی کی سیر کرتے رہے۔ جس کی تفصیل وقاص بھائی نے الگ سے لکھی ہے جسے کتاب کے آخر میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ دہلی میں دو دن گزارنے کے بعد ہم آگرہ گئے۔ اس کتاب میں آگرہ کے سفر سے لے کر واپس پاکستان تک کے سفر کی روداد بیان کی جائے گی۔

آگرہ، دہلی سے 220 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ فاصلہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے جس کا انحصار اس روٹ پر ہے جو آپ اختیار کرتے ہیں البتہ بذریعہ ہوائی جہاز یہ فاصلہ 170 کلومیٹر ہے۔ ہم نے بذریعہ بس آگرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل والوں نے ہماری رہنمائی کی اور ہمارے لیے بس میں سیٹوں کا بندوبست کروا دیا۔ بس نے سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہونا تھا۔ اس لیے ہم صبح صبح، جسے کہتے ہیں منہ اندھیرے ہی بس کے اڈے پر پہنچ گئے اور چار گھنٹے کے سفر کے بعد آگرہ پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ میں سفر کی کہانی سناؤں، میں چاہتا ہوں کہ دہلی کے اردگرد علاقوں کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

ہمیں ایک مرتبہ دہلی میں واقع پنجاب ہوٹل جانے کا موقع ملا، جس کا تفصیل سے تذکرہ بھارت کے تیسرے سفر میں کروں گا اس ہوٹل کے باہر کی دیوار پر ایک بہت بڑا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نقشے میں یہ دکھایا گیا تھا کہ پنجاب علی گڑھ سے شروع ہو کر پشاور تک پھیلا ہوا تھا۔ انگریزوں نے پہلے اس علاقے سے صوبہ سرحد، موجودہ کے پی کے کو پنجاب سے الگ کیا۔ آزادیِ ہند کے وقت پنجاب دو حصوں میں بٹ گیا ایک پاکستان میں اور دوسرا بھارت لیکن دونوں طرف اس کا نام پنجاب ہی لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں بھارتی حکومت نے پنجاب کو دو حصوں یعنی ہریانہ، اور پنجاب میں تقسیم کر دیا۔ اب دہلی کے تینوں اطراف میں جو علاقہ ہے وہ

ہریانہ اسٹیٹ ہے۔ بھارت میں صوبے کو اسٹیٹ کہتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں ہم صوبہ کہتے ہیں۔ میں اسٹیٹ کا لفظ ہی استعمال کروں گا۔

ہریانہ کی شمالی سرحد چنڈی گڑھ تک جبکہ جنوب میں فرید یہ آباد سے بھی آگے اورنگ آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں اس کی سرحد یو پی کے ساتھ ملتی ہے۔ اس کے مغرب کی طرف پنجاب کا علاقہ ہے جس میں پٹیالہ وغیرہ شامل ہیں۔ ہم جیسے ہی بس میں بیٹھے ہمیں ایک دلچسپ منظر دیکھنے کو ملا جس سے ہم آنکھیں نہ چرا سکے اور وہ سارا دن ہماری نظروں کے سامنے رہا۔ وہ منظر ہم سب کے لیے بہت ہی حیرانی کا باعث تھا اور بہت حد تک قابل افسوس بھی۔ بعد ازاں جب ہم نے کچھ لوگوں سے اس بات کا تذکرہ کیا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک عام سی بات ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ ہمارے سامنے والی سیٹ پر ساڑھے چھ فٹ قد کا اور بڑے بھاری بھرکم جسم کا مالک ایک عرب (ایسا ہم نے شکل وصورت دیکھ کر اندازہ لگایا، بعد میں جب ہماری آپس میں بات چیت ہوئی تو ہمارا اندازہ صحیح ثابت ہوا) آکر بیٹھا اور اس کے ساتھ ایک کمزور سی دبلی پتلی لڑکی بھی آکر بیٹھ گئی۔ بھائی صاحب کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہوگی اور ہمارے خیال میں لڑکی کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ وہ دونوں آپس میں انگریزی میں بات کرتے تھے اور آگرہ سیر کے لیے جا رہے تھے۔ ایک گروپ میں ہونے کی وجہ سے ہم نے سفر بھی اکٹھے کیا اور آگرہ میں وقت بھی اکٹھے ہی گزارا بلکہ ایک جگہ پر انھوں نے عمر فاروق سے یہ بھی کہا کہ وہ اِن کی تصویر بنا دے۔ عمر نے ان میاں بیوی کی تصویر بھی بنائی۔ یہ بات ہمیں بہت عجیب سی لگی کہ یہ سب کیا ہے؟

دہلی میں کچھ لوگوں نے بتایا کہ عرب ممالک سے بڑی عمر کے لوگ تین چار ماہ کے لیے بھارت آتے ہیں اور اس دوران وہ کسی نوجوان لڑکی سے شادی کرتے ہیں اور جاتے ہوئے طلاق دے جاتے ہیں اور ساتھ بہت سارے پیسے بھی دے دیتے ہیں۔ جس سے وہ لڑکی اپنی اگلی شادی کے لیے جہیز وغیرہ کا بندوبست کر لیتی ہے۔ اس طرح اس لڑکی کی دوبارہ شادی آسانی سے ہو جاتی ہے۔

اس کام کے لیے بے شمار غریب لڑکیاں ہر وقت تیار ہوتی ہیں۔ یہی معاملہ ان بھائی صاحب کا بھی تھا۔ اس واقعہ کی تفصیلات آج تک یاد ہے حالانکہ اس بات کو بیس سال گزر چکے ہیں

لیکن کیا کریں کچھ واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے۔ یہ ٹھیک ہے یا غلط، میں اس کا فیصلہ تو نہیں کرسکتا لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یہ سب مناسب نہیں لگا۔

نوئیڈا: بھارت کا پہلا سمارٹ سٹی

آج سے چار سال قبل یعنی 1996ء جب میں بھارت آیا تھا تو میرے پاس صرف دہلی کا ویزا تھا۔ دہلی کے جنوب مشرق میں پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر نیو اوکھلہ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (نوئیڈا) شہر واقع ہے۔ رنبیر مانگٹ کا دفتر بھی اسی علاقے میں تھا۔ اُن کا گھر بھی اس علاقے کے ساتھ فرید آباد میں تھا۔ انھوں نے مجھے نوئیڈا کے بارے بہت کچھ بتایا جس کی وجہ سے میرے اندر نوئیڈا کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن ویزا نہ ہونے کی وجہ سے میری وہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

آج جب ہم دہلی سے آگرہ جا رہے تھے تو ہماری بس کو نوئیڈا کے علاقے سے گزر کر جانا تھا، اس لیے مجھے اس شہر کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس شہر میں میرے اور آپ کے لیے سیکھنے کی بے شمار چیزیں موجود ہیں۔ پہلی بار جب میں نے شہر کو دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ شہر انتہائی خوب صورت ترتیب سے بسایا گیا ہے، بہت بڑے بڑے مال نظر آ رہے تھے اور صفائی ستھرائی کی بھی صورت حال بہتر تھی۔ اکثر جگہوں پر میڈیا اور آئی ٹی کے بورڈز لگے ہوئے تھے۔ ان سب چیزوں نے میری دلچسپی میں بہت اضافہ کر دیا۔

پرانی دلی کے جنوب میں واقع یہ شہر بالکل ہی مختلف تصویر پیش کر رہا تھا۔ شہر کی تاریخ جاننا چاہی تو پتہ چلا کہ یہ شہر 1976ء میں سنجے گاندھی کی تجویز پر یو پی اسٹیٹ کے ضلع گوتم بدھ نگر میں بنایا گیا تھا۔ نوئیڈا بھارت کے ان 20 شہروں میں شامل ہے جو صفائی و ستھرائی کے لحاظ سے بہترین ہیں۔ اس شہر کو بناتے وقت یہ سوچا گیا تھا کہ یہ ایک سمارٹ سٹی ہوگا۔ بھارت میں اس وقت کئی سمارٹ سٹی موجود ہیں لیکن سمارٹ سٹی کا پہلا تصور اسی شہر سے لیا گیا۔ یہ شہر بھی دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔

یہاں اس علاقے کا سب سے بڑا بوٹینیکل گارڈن بھی ہے۔ گریٹ انڈیا پیلس کے نام

سے بھارت کا ایک بہت بڑا شاپنگ مال بھی اسی شہر میں واقع ہے۔ اُس وقت شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے زائد تھی اب تو اور بھی زیادہ ہوگئی ہوگی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں پر تعلیم کی شرح نوے فیصد ہے جبکہ پورے بھارت میں شرح ستر فیصد کے قریب ہے۔ اس علاقے میں قائم زیادہ تر دفاتر کا تعلق میڈیا اور سافٹ ویئر ہاؤسز سے ہے۔

جب ہم شہر سے گزر رہے تھے تو صبح کا وقت تھا اس لیے زیادہ رش نہیں تھا لیکن شہر کی صورت حال بتا رہی تھی کہ دن میں خاصا رش ہوتا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ صفائی ستھرائی کا تصور بھی واضح نظر آرہا تھا۔ اس بارے میں مزید معلومات ان کی ویب سائٹ سے مل سکتی ہیں۔ میری دوستوں سے گزارش ہوگی کہ وہ نوئیڈا کی ویب سائٹ ضرور دیکھیں۔ یقیناً اگر ہم ایک اچھی کامیاب کوشش دیکھیں گے تو ہم میں بھی ایسا کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔

میری یہ خواہش ہے کہ پاکستان میں بھی ایک سمارٹ سٹی بنایا جائے۔ وہ ایک ایسا شہر ہو جو جدید ترین ٹاؤن پلاننگ کو ظاہر کرتا ہو۔ امید ہے ہم کبھی تو ایسا سوچیں گے۔۔۔

ہم اسی خواہش کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ اکثر مسافر سو رہے تھے لیکن میرے جیسا فرد جاگنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ چیزیں اور لوگوں کو دیکھ سکے۔

فرید آباد: شیخ فرید کے نام پر بسایا ہوا شہر

برٹانیکا انسائکلو پیڈیا کے مطابق جہانگیر کے ایک بہت ہی قریبی درباری کی، جن کو بابا فرید کہا جاتا تھا، ذمہ داری اُس راستے کی حفاظت کی تھی جسے ہم اب جی ٹی روڈ کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی یہ ذمہ داری خوب نبھائی۔ اس پر خوش ہو کر بادشاہ نے ان کے نام پر یہ شہر بسایا اور ان کی وفات کے بعد ان کا مقبرہ بھی اسی شہر میں بنوایا۔

فرید آباد شہر بہت پرانا نہیں ہے۔ یہاں انگریزوں نے 1867ء میں میونسپل کمیٹی قائم کی تھی۔ جب ہم اس شہر سے گزر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ یہ شہر بہت ہی زیادہ گنجان آباد ہے۔ محسوس ہوتا تھا کہ ہر جگہ انسان ہی انسان ہیں۔ وہاں ایسی جگہیں بھی تھیں جہاں بہت زیادہ انڈسٹری لگی ہوئی تھی۔ بہت سے سرکاری دفاتر اس کے علاوہ تھے۔ کئی انٹرنیشنل کمپنیز کے بورڈ بھی

وہاں موجود تھے۔

مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ ہریانہ اسٹیٹ کا چوتھائی ٹیکس صرف فرید آباد سے اکٹھا ہوتا ہے۔ ڈبلیو ایچ او کے مطابق یہ دنیا کے گنجان آباد شہری علاقوں میں ایک ہے۔ میں نے پچھلے صفحات میں اسمارٹ سٹی کا ذکر کیا تھا۔ بھارت پورے ملک میں ایک سو سمارٹ سٹی بنا رہا ہے، جن میں ایک فرید آباد بھی ہے۔ یہ شہر بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اس کا شمار دنیا کے چند تیز ترین ترقی کرنے والے شہروں میں ہوتا ہے۔ میں نے راستے میں کئی اور اہم مقامات بھی دیکھے۔ دور ہونے کی وجہ سے ہم بابا فرید کا مزار نہ دیکھ سکے۔

ایک جگہ سے گزرتے ہوئے میں نے ایک ٹاؤن پارک دیکھا جہاں اڑھائی سو فٹ اونچا بھارتی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس علاقے کی ایک اور اہم بات یہاں پر سائیں بابا کا مندر ہے۔ سائیں بابا بھارت کی ایک مشہور مذہبی شخصیت ہیں۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک صاحب جن کا تعلق فرید آباد ہی سے تھا اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آگرہ جارہے تھے، بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے فرید آباد کے بارے میں جاننا چاہا۔ اس پر انھوں نے یہ بتایا کہ یہاں کا سب سے مشہور میلہ سورج کنڈ ہے جو فروری میں لگتا ہے۔ بہت سارے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اس میلے میں علاقے کی تہذیب وتمدن کے بے شمار مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ہمارے لیے وہ میلہ تو دیکھنا ممکن نہیں تھا لیکن اُن صاحب کی باتوں سے لگا کہ یہ ایک بہت ہی مشہور میلہ ہوگا۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے ہاں بھی پنجاب میں فروری ہی میں دیہاتی میلے لگتے ہیں۔ اس وقت کسان گندم کی کاشت کاری سے فارغ اور فصل پکنے کا انتظار کرتے ہیں اور موسم بھی خوشگوار ہوتا ہے۔

فرید آباد کی ایک اور خاص بات اس کا دہلی سے ممبئی جانے والی مین ریلوے لائن کے اوپر واقع ہونا ہے۔ یہاں رکنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ناشتے کے لیے ہمیں کہیں اور رکنا تھا۔ فرید آباد سے گزرتے ہوئے مجھے میرے دوست رنبیر سنگھ مانگٹ یاد آئے جو فرید آباد میں ہی رہتے ہیں۔

اولڈ دہلی سٹیشن جسے دہلی جنکشن بھی کہتے ہیں

جب ہم نے بچپن میں ریل پر سفر شروع کیا تو دیکھا کہ کچھ سٹیشنوں پر ان کے نام کے ساتھ جنکشن کا لفظ بھی لکھا ہوتا تھا۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ جہاں ریل گاڑیاں دو سے زائد اطراف میں جاتیں ہوں، ایسے سٹیشن کو جنکشن کہتے ہیں۔ جب میں نے دہلی میں قائم ریلوے سٹیشنز سے متعلق جاننا چاہا تو مجھے پتہ چلا کہ سب سے پہلے جو ریلوے سٹیشن دہلی میں بنا اس کا نام دہلی جنکشن تھا، جسے اب اولڈ دہلی سٹیشن بھی کہتے ہیں۔ شروع میں اس کا نام یقیناً دلی ہوگا کیونکہ دہلی کا لفظ انگریزوں نے آ کر رائج کیا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے سفر کے بارے میں بتاؤں میں آپ کو دہلی ریلوے سٹیشن سے متعلق کچھ معلومات دینا چاہوں گا۔ دہلی شہر اور گردونواح میں 46 ریلوے سٹیشن ہیں۔ ان میں دو سب سے بڑے ہیں جن کا تفصیلی تعارف میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

اولڈ دہلی ریلوے سٹیشن کو اندر سے نہ دیکھ پائے لیکن اس کے پاس سے ہمارا گزر کئی مرتبہ ہوا۔ یہ سٹیشن چاندنی چوک اور کشمیری گیٹ کے درمیان واقع ہے جو اندرون دلی کا علاقہ ہے۔ یہاں بہت رش ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر دیکھ کر ہمیں یہ گمان گزرا کہ ہم لاہور کا ریلوے سٹیشن دیکھ رہے ہیں۔ ایسا صرف لاہور اور دہلی ہی میں نہیں بلکہ پاکستان اور بھارت کے اکثر و بیشتر سٹیشنز کی تعمیر تقریباً ایک ہی جیسی ہے۔ اگر آپ کو انگلینڈ جانے کا اتفاق ہو تو آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ انگلینڈ کے ریلوے سٹیشن پاکستان اور بھارت سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان سب کو بنانے والا ادارہ ایک ہی ہو۔

دہلی میں سب سے پہلا ریلوے سٹیشن 1864ء میں بنایا گیا۔ اس کا نام دلی جنکشن ہے۔ یہ چاندنی چوک اور کشمیری گیٹ کے درمیان میں واقع ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت تک ابھی نئی دہلی کا وجود عمل میں نہیں آیا تھا۔ آپ کی دلچسپی کے لیے بتاتا چلوں کہ لاہور کا مین سٹیشن 1860ء میں تیار ہو گیا تھا، یعنی دہلی سے پہلے۔ سٹیشن کی عمارت بنانے کے لیے ایک دلچسپ فیصلہ کیا گیا۔ لال قلعہ کی (جو یہاں سے زیادہ فاصلے پر موجود نہیں ہے) عمارت کو دلی جنکشن کا اسٹرکچر بناتے ہوئے ذہن

میں رکھا گیا اور اس سٹیشن کا رنگ بھی سرخ ہی رکھا گیا۔ پہلی عمارت تو عام سی تھی لیکن جو بڑی عمارت بنی اس کا آغاز 1903ء میں ہوا۔ ابتداء میں یہاں پر صرف ایک ہی پلیٹ فارم تھا جس کی گنجائش تقریباً ایک ہزار مسافروں کی تھی۔ 1934ء میں اسے مزید وسعت دی گئی۔ اس وقت اس ریلوے سٹیشن پر 18 پلیٹ فارم ہیں۔ کئی پلیٹ فارم ایسے بھی ہیں جہاں پر 24 بوگیوں والی ٹرین رُکتی ہے۔

اس وقت دوسو سے زائد ٹرینیں یہاں سے گزرتی یا چلنا (Departure) شروع ہوتی ہیں۔ روزانہ دو لاکھ کے قریب مسافر اس سٹیشن سے مستفید ہوتے ہیں۔ ہم اس کے ایک پل سے گزرے۔ میرے ساتھ وقاص انجم جعفری تھے۔ ہم نے پل سے دیکھا کہ حدنگاہ گاڑیاں ہی گاڑیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ جہاں پر اتنی بڑی تعداد میں لوگ آئیں اور جائیں وہاں پر صفائی ستھرائی ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ ہمیں یہاں بھی دیکھنے کو ملی۔

وقاص بھائی کے نانا ابو ریلوے میں ملازم تھے اس لیے ان کی ریل سے محبت بھی پرانی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ماڑی انڈس کالا باغ سے اپنے ننھیال لاہور، ٹرین پر آتے تھے۔ ریل کی ایک اپنی کشش ہے جو بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ابھی حال ہی میں اس ریلوے سٹیشن پر پرائیویٹ پبلک پارٹنر شپ کے تحت دو میگاواٹ سے زائد کا سولر سسٹم لگایا گیا ہے۔ اس ریلوے سٹیشن کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس کے پاس ہی میٹرو کا سٹیشن بھی ہے۔ لوگ دور دراز سے میٹرو پر سفر کر کے آتے ہیں اور پھر یہاں سے ٹرین پکڑتے ہیں۔

ہم نے ایک پلیٹ فارم سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ پورے کے پورے خاندان پلیٹ فارم پر انتظار کر رہے ہیں۔ جس سے ہم نے یہ محسوس کیا کہ بھارت میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد بذریعہ ٹرین سفر کرتی ہے۔ آمدورفت کے دیگر ذرائع سے سستا اور آرام دہ ہونے کے ساتھ ساتھ محفوظ بھی ہے۔

ہندوستان میں ریل کی تاریخ جاننے کے لیے بھارتی ریلوے نے بھی کافی کچھ شائع کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کتاب جو John Hurd II and Ian J. Kerr نے *India's Railway History* کے نام سے لکھی ہے اس میں تفصیل سے ہندوستان کی ریل کی کہانی لکھی

ہے۔اس کے علاوہ شیوتا نے *History of Indian Railways – 1853 to 2018* کے نام سے بھی ایک مضمون لکھا ہے جس میں کئی دلچسپ معلومات دی گئی ہیں۔

نیو دہلی ریلوے سٹیشن

نیو دہلی ریلوے سٹیشن بھارت کا اس وقت سب سے مصروف اور آمدنی کے اعتبار سے اول نمبر کا ریلوے سٹیشن ہے۔اس کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہاں سے روزانہ چار سو سے زائد گاڑیاں اپنا سفر شروع اور ختم کرتی ہیں۔ایک محتاط اندازے کے مطابق اس سٹیشن سے پانچ لاکھ لوگ روزانہ سفر کرتے ہیں۔ یاد رہے پورے پاکستان میں صرف پونے دو لاکھ لوگ ہیں جو ہر روز پاکستان ریلوے سے مستفید ہوتے ہیں۔

نیو دہلی ریلوے سٹیشن کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔پچھلے صفحات میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ 1911ء میں جب نیو دہلی کو آباد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اس وقت دلی جنکشن موجود تھا۔ کچھ سالوں بعد صرف ایک نئی ریلوے لائن نئی دہلی تک پہنچائی گئی۔ضرورت محسوس ہونے پر 1927ء میں آٹھ کلومیٹر طویل یہ ریلوے سٹیشن بنایا گیا۔ 1931ء میں جب نئی دہلی کا افتتاح ہوا تو اس وقت اس ریلوے سٹیشن نے کام شروع کر دیا تھا۔اس ریلوے سٹیشن پر سولہ پلیٹ فارم ہیں۔ حال ہی میں ایک میگا واٹ کا سولر سسٹم بھی نصب کیا گیا ہے۔اس ریلوے سٹیشن کے لیے 225 ایکڑ جگہ لی گئی تھی جواب کم پڑ رہی ہے۔اس ریلوے سٹیشن کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہر جگہ پر بہت ہی اچھے انداز میں معلومات دی گئی ہیں جس سے آپ کو اپنے پلیٹ فارم پر جانے کے لیے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

ایک انتہائی دلچسپ بات یہ تھی کہ پلیٹ فارم کے فرش پر کوچ نمبر لکھا ہوا تھا۔مثلاً اگر آپ کی سیٹ دس نمبر کوچ میں ہے تو آپ کو ڈھونڈنا نہیں پڑے گا، بلکہ پلیٹ فارم کے فرش پر جس جگہ دس لکھا ہوگا کوچ بھی وہیں آ کر رکے گی۔ایسا انتظام میں نے یورپ میں بھی نہیں دیکھا۔اس سے مسافروں کو بے حد سہولت ہوتی ہے۔لوگ اپنی کوچ والی جگہ پر کھڑے ہوتے ہیں اور آپ کی کوچ

بھی وہیں پر آ کر رکتی ہے۔

یقیناً آپ سوچتے ہوں گے مختلف گاڑیوں کی لمبائی میں بھی فرق ہوسکتا ہے تو اس کا بھی حل انھوں نے نکالا ہوا ہے۔فرش پر لکھا ہوا ہے کہ یہ نمبر فلاں گاڑی کے لیے ہیں۔مثلاً ہماری گاڑی کا نام تامل ناڈو ایکسپریس تھا۔تامل ناڈو کے نام کے ساتھ وہاں پر نشان لگا ہوا تھا۔اگر کوئی اور گاڑی ہوگی تو اس کے نام پر بھی نشان ہوں گے۔وہاں بہت زیادہ نشان نہیں تھے۔ان بڑی باتوں میں سے ایک یہ تھی جنھوں نے ہمیں انڈین ریلوے سے متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو سفر کے بارے میں بتاؤں میں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ جب کمپیوٹر اتنا عام نہیں تھا تو سیٹ بک کروانے کا نظام کیسا تھا۔

آج سے 20 سال قبل 1999ء میں ابھی کمپیوٹر کا استعمال عام نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت بھی انڈین ریل کا سیٹ بک کرنے کا نظام موجود تھا۔اس نظام کے تحت کسی بھی لینڈ لائن سے ریلوے کے دیے گئے نمبر پر فون کرتے تھے تو وہ آپ سے ضروری معلومات جیسے کس دن سفر کرنا ہے؟ کس مہینے میں سفر کرنا ہے؟ کس ٹرین پر سفر کرنا ہے؟ اور کس طرح کی کوچ پر سفر کرنا ہے وغیرہ وغیرہ لیتے تھے۔معلومات لینے کا طریقہ کار بڑا دلچسپ تھا۔آپ فون پر نمبروں سے ہی ان کو جواب دیتے رہتے تھے۔مثلاً اس نے پوچھا کہ کون سی تاریخ، آپ نے نمبر ڈائل کر کے تاریخ بتا دی۔اس نے پوچھا گاڑی کا نمبر ڈائل کریں تو آپ نے نمبر ڈائل کر دیا۔اس طرح سے وہ سوال پوچھتے چلتے جاتے اور آپ جواب دیتے چلے جاتے۔جواب میں وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ جس دن اور جس کلاس میں جانا چاہتے ہیں اس میں ابھی تک کتنی سیٹیں موجود ہیں۔

وقاص بھائی اور میں نے ہوٹل سے فون ملایا جس کا طریقہ کار ہوٹل کے مینجر نے ہمیں بتایا تھا۔اس طرح سے ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ ٹرین میں کتنی سیٹیں خالی ہیں۔ہم ٹکٹ لینے کے لیے اپنے علاقے میں قائم ریل ٹکٹ بوتھ پر گئے اور اپنی ٹکٹیں لے لیں۔اس سے ہمیں کافی سہولت ہوئی۔مجھے یہ نظام اب تک یاد ہے۔اب تو خیر سارا نظام ہی الیکٹرونک ہے، کمپیوٹرائزڈ بکنگ ہے۔

رات دس بجے کے قریب ہماری روانگی تھی۔رنبیر مانگٹ ہمارے ہوٹل میں تشریف لے

آئے۔شام کا کھانا ہم نے ان کے ساتھ کریم ہوٹل میں کھایا۔جس کے بعد انھوں نے ہمیں اپنی گاڑی میں ریلوے سٹیشن پہنچایا۔ہم نے ان سے عرض کیا کہ اب ہم خود ہی اپنی ٹرین تک پہنچ جائیں گے۔لیکن ان کا اصرار تھا کہ وہ ہمیں بٹھا کر ہی جائیں گے۔یہ ان کی ہم سے محبت کا ایک انداز تھا۔ان کے ساتھ ہماری وہ شام ایک یادگار شام تھی۔ایک روائتی مہمان نوازی کا انداز ہمیں ہر جگہ دیکھنے کو ملا۔

دہلی سے ریواڑی براستہ گروگرام

اپنے تیسرے سفر میں (2000ء) جس میں میرے ساتھ سید رفیق انجم جعفری اور ساجد منظور بھی تھے، ہم دہلی سے براستہ ممبئی پونا گئے۔ممبئی سے واپس آکر ہمیں ریواڑی کے پاس ایک گاؤں میں جانا تھا (ریواڑی، ہریانہ اسٹیٹ کا ایک ضلع ہے)۔دہلی سے ریواڑی اور ریواڑی سے بھی آگے ایک چھوٹے سے قصبے کاریہ تک کا ہمارا وہ سفر محترم شاہ صاحب کے آبائی گاؤں کو دیکھنے کے لیے تھا۔شاہ صاحب کی دلچسپی اسی وجہ سے سب سے زیادہ تھی۔

سید انجم رفیق جعفری (شاہ صاحب) کا گاؤں کاریہ ریواڑی سے آگے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ہم راستوں سے واقف نہیں تھے اس لیے میرے دوست رنبیر سنگھ مانگٹ نے راہ نمائی کے لیے اپنے بیٹے کو ہمارے ساتھ بھیج دیا۔ہم نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اس کے ذریعے دہلی سے ریواڑی اور ریواڑی سے کاریہ تک پہنچے۔ریواڑی، دہلی سے اسی کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔آزادیِ ہند کے وقت شاہ صاحب کی عمر دس سال تھی۔انھیں بہت ساری باتیں تو یاد تھی لیکن کچھ باتیں جو بعد میں انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنیں وہ بھی انھیں یاد تھیں۔

آج کا دن ان کی زندگی کا ایک یادگار دن تھا وہ اس جگہ جا رہے تھے جہاں ان کی پیدائش ہوئی اور انھوں نے زندگی کے پہلے دس سال گزارے تھے۔اب اس واقعے کو 53 سال ہو چکے تھے۔اتنے طویل عرصے کے بعد ان کے خاندان کا کوئی فرد ان کے آبائی گاؤں جا رہا تھا۔میں ان کی جذباتی کیفیت سمجھ رہا تھا۔اس دوران انھوں نے بہت سارے شعر بھی کہے جو مکمل طور پر ان کے جذبات کی عکاسی تو نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں نمی کے ساتھ ضرور انصاف کر رہے تھے۔دہلی کے

بعد گروگرام سے گزرتے ہوئے ہمارا سفر جاری تھا۔ اردگرد کھیت اور بہت ساری ویرانی بھی دیکھنے کو ملی۔ ریواڑی، راجستھان اور ہریانہ کی سرحد پر واقع ہے اس لیے یہاں پر بھی راجستھان جیسی زمین ہی ملتی ہے لوگوں کا رہن سہن راجستھانی تو نہیں تھا لیکن اس کے اثرات ضرور محسوس کیے جا سکتے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو شاہ صاحب کے گاؤں کے متعلق بتاؤں میں چاہوں گا کہ ہریانہ، گروگرام اور ریواڑی کے بارے میں بھی کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ بہت سے اہم واقعات اور علاقوں کی وجہ سے یہ شہر تاریخ میں ایک اہم مقام بھی رکھتے ہیں۔

گروگرام: بھارت کا سائبر سٹی، جس کا پرانا نام گڑگاؤں تھا اور کیتھولک عیسائی عورت بیگم سومبر گروگرام، بھارت کی ریاست ہریانہ میں دہلی اور ہریانہ کی سرحد پر دہلی سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک ترقی یافتہ شہر ہے۔ یہ شہر بھارت میں آئی ٹی کا دوسرا سب سے بڑا سنٹر ہے جس کی وجہ سے اسے بھارت کا سائبر سٹی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھارت کا تیسرا سب سے بڑا مالیاتی اور بنکاری مرکز بھی مانا جاتا ہے۔ یہاں پر موجود ہسپتالوں میں دنیا بھر سے لوگ علاج کی غرض سے آتے ہیں اس وجہ سے اسے بھارت کا سب سے بڑا طبی سیاحتی مقام بھی مانا جاتا ہے۔ گروگرام میں بھارت کی پانچ سو سے زائد بڑی کمپنیوں کے مرکزی دفاتر بھی موجود ہیں۔ ریاست ہریانہ کی کل آمدن کا ستر فیصد اسی شہر سے حاصل ہوتا ہے۔ اس شہر کو شمالی بھارت کی ہائی ٹیک انڈسٹری میں ایک نمایاں مقام بھی حاصل ہے۔

گروگرام کا علاقہ زمانہ قدیم سے آباد ہے۔ دہلی کی قربت کی وجہ سے اس کی آبادی میں بہت تھوڑا اضافہ ہوا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقے کسی دور میں کورو بادشاہی کا حصہ تھے۔ یہاں یادو نام کا ایک قبیلہ بھی آباد تھا۔ یادو نام کے لوگ اب بھی اس علاقے میں آباد ہیں۔ اس قصبے کا ذکر مہابھارت کی کئی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ ایک وقت میں چندر گپت موریہ کے زیر تحت بھی رہا ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے میں، جب ابھی انگریزوں کا اس علاقے پر مکمل قبضہ نہیں ہوا تھا لیکن بہرحال ان کا یہاں آنا جانا شروع ہو چکا تھا۔ اس علاقے

میں ایک کیتھولک عیسائی عورت بیگم سومبر (Joanna Nobilis Sombre) بھی گزری ہے۔ پیدائشی طور پر وہ ایک کشمیری مسلمان خاتون تھی اور اس کا نام فرزانہ زیب النساء تھا، وہ ایک پیشہ ور رقاصہ تھی۔ بعد ازاں اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور وہ بیگم سومبر کے نام سے مشہور ہوئیں۔اس کی زندگی کی کہانی نہایت ہی دلچسپ ہے۔گروگرام سے متعلق پڑھتے ہوئے اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا۔ یہ محبت، قربانی اور کامیابی کی کہانی ہے۔ان کے بارے ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔اس کا مختصر ذکر پیشِ خدمت ہے۔

کہتے ہیں کہ لکسمبرگ سے آئے ہوئے ایک کرائے کے فوجی والٹر رین ہارڈ سومبر (Walter Reinhardt Sombre) نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو اس وقت بیگم سومبر (فرزانہ) کی عمر چودہ برس تھی۔ میں نے کئی جگہ پڑھا کہ اُس دور میں انگریز (ایسٹ انڈیا کمپنی) یورپ بھر سے کرائے کے فوجی بھرتی کر کے ہندوستان لاتے تھے۔اس سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کتنا خوشحال ملک تھا کہ جہاں یورپی لوگ نوکریوں کے لیے آتے تھے۔حال ہی میں افغانستان میں بلیک واٹر کی موجودگی بھی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کرائے کے فوجی رکھنے کا رواج نیا نہیں ہے بلکہ اب تک یہ سلسلہ چل رہا ہے۔

والٹر رین ہارڈ سومبر نے فرزانہ سے شادی کرنا چاہی، وہ ایک مسلمان خاتون تھی اس لیے شادی ممکن نہ تھی۔فرزانہ نے شادی کی خاطر اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ میرے علم کے مطابق یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی معروف شخصیت نے شادی کی خاطر اپنا مذہب تبدیل کیا ہو۔تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس یورپی فوجی نے کئی مہمات میں حصہ لیا اور ایک کامیاب فوجی بن کر ابھرا۔اس کی کامیابیوں میں اس کی بیگم فرزانہ کا بے حد اہم کردار تھا۔ والٹر نے کثیر تعداد میں مال ومتاع چھوڑا۔

بیگم سومبر ایک نہایت ہی عقل منداور دلیر خاتون تھیں۔ 1778ء میں اپنے شوہر والٹر رین ہارڈ کی وفات پر بیگم سومبر اس کی وراثت کی مالک بن گئی اور اس نے اتر پردیش کے ایک علاقے سردھنہ میں (جس میں گروگرام بھی شامل تھا اور جو دہلی سے شمال مشرق کی طرف اسی کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے) اپنی ایک ریاست بنالی۔ یوں وہ پہلی عیسائی خاتون تھیں جو ہندوستان میں

ایک ریاست کی ملکہ بنیں۔

وہ جنوری 1837ء میں 85 سال کی عمر میں سردھنہ میں فوت ہوئیں۔بیگم سومبر کے سیاسی، جنگی اور سفارتی کارناموں پر مبنی کئی کہانیاں اور ناوّل لکھے گئے ہیں۔اس نے کئی محل بھی تعمیر کروائے جن میں دہلی کے چاندنی چوک میں واقع سومبر محل قابلِ ذکر ہے۔گروگرام پر بھی بیگم سومبر کا راج تھا۔بیگم سومبر کی زندگی پر بیجم ہوم نامی ایک ڈرامہ بھی برطانیہ کی ایک کمپنی نے بنایا۔اس میں بیگم سومبر کا کردار بھارت کی ایک مشہور اداکارہ لارا دوتہ(Lara Dutta) نے (جو مس یونیورس بھی ہیں) ادا کیا۔آج ہم اس شہر سے گزر رہے تھے جہاں اس کہانی نے جنم لیا تھا۔

بیگم سومبر کی موت کے بعد 1838ء میں انگریزوں نے اس علاقے کا براہ راست کنٹرول سنبھال لیا۔ انھوں نے اس علاقے میں نہ صرف سرکاری افسران کی کوٹھیاں بنائیں بلکہ ایک چھاؤنی بھی قائم کی۔گروگرام میں انگریزوں اور مغلوں کے دور کی کئی قابلِ دید تاریخی عمارات موجود ہیں۔دہلی کے (جہاں کئی سو سال تک مسلمان حکمران رہے) قریب ہونے کے باوجود بھی اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ فیصد کے قریب ہے۔سکھ ایک فیصد، عیسائی نصف فیصد جبکہ ہندوؤں کی تعداد نوّے فیصد سے زائد ہے۔گروگرام کی آبادی دس لاکھ سے زائد ہے۔ اس کا جی ڈی پی ایک سو بیس بلین ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔اس کی وجہ اس علاقے میں پانچ سو سے زائد بڑی کمپنیوں کی موجودگی ہے۔

گروگرام کے قرب و جوار میں کئی اہم مقامات ہیں جن میں قطب خاں کا مقبرہ، فرخ کا قلعہ اور کئی قدیمی مندر بھی شامل ہیں جو اس علاقے کی اہمیت کو دوگنا کرتے ہیں۔

جب ہم گروگرام کے بازار سے گزر رہے تھے تو اس وقت میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہر طرف جس قدر خوشحالی نظر آرہی تھی وہ بھارت کے اب تک کے سفر میں دیگر جگہوں پر کم ہی نظر آئی۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک نیا بھارت ابھر رہا ہے۔جو بھارت کے دیگر علاقوں سے بالکل ہی مختلف تھا۔اس سے میں بھارتی معاشرے میں بڑھتے ہوئے خلا کو واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔

❀❀❀

ریواڑی

صدیوں سے آباد ایک شہر

اگر آپ کبھی ملتان گئے ہوں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں ریواڑی کے نام سے مٹھائی کی دکانیں موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کا تعلق ریواڑی سے ہی ہوگا۔ ہجرت کے بعد ان لوگوں نے ملتان میں اپنے شہر کے نام پر ہی اپنے کاروبار کا نام رکھا ہوگا۔ یہ اپنے شہر سے محبت کا ایک انداز ہوتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ہجرت کے بعد میرے والدین سرہند سے آ کر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہوئے، اس وجہ سے آج بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں لوگ ہمیں سرہندی کہہ کر ہی بلاتے ہیں۔ سرہند کے رہنے والوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک نئی کالونی آباد کی جس کا نام سرہند کالونی ہی رکھا۔ اپنے وطن کو یاد رکھنا ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ ہمارے شہر کے ایک معروف دینی راہ نما اور نہایت ہی قابلِ احترام شخصیت، مفتی عبدالحمید بھی اپنے نام کے ساتھ لدھیانوی لکھتے تھے، جس کی وجہ یہی تھی کہ وہ لدھیانہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔

اگر کبھی آپ اس بات پر غور کریں تو آپ کو امریکہ میں بہت سارے نام ایسے ملیں گے جن کے ساتھ ''نیو'' لگا ہوتا ہے جیسے، نیو یارک، نیو جرسی، نیو ہمپشائر۔ نیو یارک امریکہ میں ہے جبکہ یارک انگلینڈ میں، نیو جرسی امریکہ میں ہے جبکہ جرسی انگلینڈ میں موجود ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے نیو یارک ان لوگوں نے بسایا جو یارک (برطانیہ) سے گئے تھے۔ میں نے یارک شہر بھی دیکھا، جسے رومیوں نے آباد کیا تھا۔ ابھی بھی اس شہر میں جگہ جگہ رومیوں کے مجسمے نظر آتے ہیں۔ بہرحال

یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے آبائی علاقے کو بھول نہیں پاتا اور اسے بھولنا بھی نہیں چاہیے۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ مہابھارت کے زمانے میں ریواٹ نامی بادشاہ کی ایک بیٹی تھی جس کا نام ریواٹی تھا۔ والد اسے ریوا کہتے تھے، اور اس کے نام پر ایک شہر "ریواواڑی کی، یعنی ریوا کا واڑا، یا علاقہ، بنیاد رکھی جو آج ریواڑی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ریواڑی پیتل کے برتنوں کی روایتی صنعت کی وجہ سے بھارت بھر میں جانا جاتا ہے۔

ریواڑی: شہاب الدین غوری سے انگریزوں تک

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ریواڑی ہی وہ علاقہ ہے جہاں ہندو مذہب کا آغاز ہوا یا ہندو مذہب کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا گیا۔ میں اس بات کا مختصر ذکر پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔ مسلمان حملہ آوروں سے قبل یہ علاقے صدیوں تک ہندو راجاؤں کے تحت رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے پر پہلا حملہ ابراہیم نامی ایک مسلمان نے کیا۔ میرے خیال سے وہ صاحب غوری کے ساتھی تھے۔ انھوں نے ریواڑی سے تیس کلومیٹر دور ایک قلعے پر قبضہ کیا لیکن وہ قبضہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ بعد ازاں ابراہیم، دہلی کے تومارا حکمران انگا پالا کے ہاتھوں شکست کھا کر ایک جنگ میں مارا گیا۔

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد، ان کے ایک جرنیل، قطب الدین ایبک نے 1206ء میں ہندوستان میں پہلی مسلمان سلطنت کی بنیاد رکھی دلی کے قریب ہونے کی وجہ سے ریواڑی پہلی مسلمان ریاست کا حصہ بھی بنا۔ اس کے بعد کئی مسلمان حکمرانوں نے اس علاقے پر حکومت کی جن میں التمش، مملوک، علاؤالدین خلجی اور تغلق حکمران قابلِ ذکر ہیں۔ طویل عرصے تک یہ علاقے آزاد رہے لیکن کب تک؟ ایک وقت آیا جب 1450ء میں بہلول لودھی نے یہاں لودھی خاندان کی حکومت کا آغاز کیا وہ عرصہ اسّی سال پر محیط ہے۔

لودھی خاندان نے افغانوں کے قبضے کو مزید بہتر بنانے کے لیے شیر شاہ کے دادا، ابراہیم خان سوری کو ریواڑی میں ایک بڑی جاگیر بھی دی۔ جب بابر نے لودھی کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کیا تو دوسرے علاقوں کے ساتھ ساتھ ریواڑی پر بھی اس کا حکم چلنے لگا۔ ہمایوں کی شکست کے

بعد شیر شاہ سوری اس علاقے کا حاکم بنا۔ بھارت کی طرف سے ہریانہ کے بارے میں شائع شدہ مواد کے مطابق سوری کے دور کو یہاں کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اسی دور میں ریواڑی کا رہائشی ہیم چندر (جسے ہیمو کہا جاتا ہے) بھی منظرِ عام پر آتا ہے۔

بھارت کے چار سفر حصہ دوم میں، میں نے ہیم نامی ایک شخص کا ذکر کیا تھا جو کچھ دنوں کے لیے دلی کی گدّی پر بیٹھا تھا۔ اس کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ اس نے ریواڑی میں توپ بنانے کی ایک فاؤنڈری بھی بنائی ہوئی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مغلیہ سلطنت کی دشمنی میں شیر شاہ سوری کو بڑی مقدار میں توپ اور بندوقیں مہیا کی تھیں۔ اس کے بدلے وہ سوری خاندان کا ایک اہم درباری رہا۔ اس کا مکان شہر کے قطب پور علاقے میں آج بھی موجود ہے۔ یہ عمارت فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اکبر کے دور میں ریواڑی صوبہ دہلی میں شامل تھا۔ یہاں کے لوگ مغلوں کے ساتھی تھے اسی لیے انھوں نے سترھویں صدی میں نندرام کو، جس کا تعلق آہیر قبیلے سے تھا، اس علاقے کا حاکم مقرر کیا۔ یہ ریاست (جاگیر) انیسویں صدی تک قائم رہی۔

ریواڑی ریاست کے ایک راجہ میترا سین نے 1781ء میں جے پور کے حکمرانوں کو اس وقت شکست دی جب انھوں نے ریواڑی پر حملہ کیا۔ اس حکمران کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس نے 1785ء میں اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل مراٹھوں کے حملے کو بھی ناکام بنایا تھا۔

مغل سلطنت کے خاتمے کے نتیجے میں ریواڑی پر مراٹھوں کا راج ہو گیا لیکن وہ قبضہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ 1808ء میں انگریزوں نے ریواڑی اور تیج سنگھ کی ریاست پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ یہ ریاست رقبے کے لحاظ سے ایک چھوٹی ریاست تھی لیکن اس کے حکمران نے 1857ء کی جنگ آزادی میں بڑا اہم کردار ادا کیا، جس کی پاداش میں انگریزوں نے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ جنگِ آزادی کے اس ہیرو کا مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے، جو اس کا حق اور میرا فرض بنتا ہے۔۔۔

یہ اس لیے بھی ہے تا کہ لوگ جان سکیں کہ آزادی ہند کی خاطر کس نے کیا کیا کارنامے سر انجام دیے۔

راؤتولا رام سنگھ (1825-1863) جنگ آزادی کا ایک نامور ہیرو

راؤ تولا رام سنگھ آہیر خاندان کی طرف سے ریواڑی کا حاکم تھا۔ اسے 1857ء کی ہندوستانی بغاوت کے ایک اہم راہ نما کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ انھیں ہریانہ میں ایک ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ ریواڑی میں ان کے نام سے ایک اسٹیڈیم اور دہلی میں ایک ہسپتال بھی بنایا گیا ہے۔ وہ 1825ء میں ریواڑی کے نواحی علاقے رام پورہ کے آہیر خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پورن سنگھ تھا۔ والد کی وفات کے بعد وہ آہیر خاندان کا سربراہ بنا۔ آہیر خاندان اور اس ریاست سے متعلق میں نے جو کچھ بھی پڑھا، اس کے مطابق یہ چھوٹا سا علاقہ تھا اور میں اسی لیے اسے ایک جاگیر طرز کی ریاست سمجھتا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق آہیر، گجر قبیلے کی ایک شاخ ہے۔

جب 1857ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا تو راؤ تولا رام سنگھ نے اپنے کزن راؤ گوپال دیو اور چار پانچ سو ساتھیوں سمیت انگریزوں کے مقرر کردہ مقامی افسروں کو بے دخل کر کے ریواڑی شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ ایک طرح سے آزادی کا اعلان تھا۔ اس فتح سے حوصلہ پا کر راؤ تولا رام سنگھ نے پانچ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل اپنی ایک فوج تیار کی، فوجی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بندوق اور دیگر گولہ بارود تیار کرنے والا ایک کارخانہ بھی بنایا۔ دلی کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے والی، بہادر شاہ اور دیگر باغی، قوتوں کی مدد کے لیے سب سے پہلے دلی بھی پہنچے۔ انھوں نے جنرل بخت خان کو ایک کثیر رقم اور بڑی مقدار میں جنگی سامان کے ساتھ ساتھ دو ہزار بوری گندم بھی فراہم کی۔

نومبر 1857ء میں اس چھوٹی سی فوج نے انگریزوں کی تربیت یافتہ فوج کے خلاف، جس میں اکثریت ہندوستانی لوگوں کی ہی تھی، نارنول کے مضافات میں نصیب پور کے میدان میں لڑائی لڑی۔ اس جنگ میں راؤ تولا رام سنگھ ان فوجوں کی قیادت کر رہا تھا جس نے انگریزی فوج کو شکست دی۔ اس جنگ میں متعدد برطانوی افسر ہلاک یا زخمی ہوئے۔ یہ وہ موقع تھا جب انگریزوں کو پے در پے شکست ہو رہی تھی۔

اگر اس موقع پر مقامی ریاستیں مل کر کارروائی کرتیں تو انگریزوں کی شکست یقینی تھی لیکن ایسا نہ ہوسکا۔اس موقع پر انگریزوں کی فتح نے دلی پر ان کی حکمرانی کو حقیقت میں بدل دیا!

انگریز اس شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے،اس لیے انھوں نے جوابی کارروائی کی۔حالات کا جائزہ لینے کے بعد راؤ تولا رام سنگھ راجستھان چلے گئے اور ایک سال تک تانیا ٹوپے کی فوج کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے رہے۔انگریزوں نے راجستھان میں سیکر کی لڑائی میں فتح حاصل کی۔ان حالات میں راؤ تولا رام نے شاہِ ایران سے مدد لینے کے لیے ایران کا سفر بھی کیا۔انھوں نے افغانستان کے امیر،دوست محمد خان سے بھی ملاقات کی اور مدد کی اپیل کی لیکن وہ سب بے سود ثابت ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے روس کے شہنشاہ دوم سے بھی رابطہ کیا لیکن وہاں بھی کچھ نہ بن سکا۔اسی تگ ودو کے دوران 1863ء میں کابل میں ان کا انتقال ہوگیا۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک جنگ میں شدید زخمی ہوگئے تھے اور اپنے علاج کے لیے کابل گئے تھے،کیا سچ ہے کیا نہیں،یا دونوں باتیں ہی سچ ہیں کہ وہ علاج کے لیے گئے اور ساتھ ساتھ انھوں نے دیگر کام بھی کیے۔اس طرح جنگ آزادی کا ہیرو ایک غلام ملک کی بجائے ایک آزاد ملک (افغانستان) میں دم توڑ گیا۔اس کے ساتھ ہی اس کی فوج بھی بکھر گئی۔آزادی کی جنگ لڑنے کے جرم میں انگریزوں نے راؤ تولا رام سنگھ کی تمام تر جائیداد کو ضبط کرلیا۔

بعد ازاں ان کے بیٹے نے جب انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلوایا تو ان کی جائیداد واپس کردی گئی اور اسے ریواڑی کا حاکم بھی تسلیم کرلیا گیا۔

اسے کیا کہیں؟ انگریزوں سے وفا یا ہندوستان سے بے وفائی یا ذاتی مفادات کا تحفظ،یا علاقے کے لوگوں کو انگریزوں کے ظلم وستم سے بچانے کی ایک چال؟

حکومت ہند نے راؤ تولا رام سنگھ کی تصویر والا ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔راؤ تولا رام سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی یاد میں ریواڑی شہر کے نواحی علاقے رام پورہ میں اب بھی ہر سال دو

روزہ میلہ لگتا ہے جسے شہیدی میلہ کہتے ہیں۔

ہیروز کو یاد رکھنا نئے ہیروز پیدا کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے!

پہلی جنگ عظیم کے دوران، ہریانہ کے دوسرے اضلاع کی طرح ریواڑی کے لوگوں نے بھی انگریزوں کی دل و جان سے مدد کی۔ جنگ کے بعد انگریزوں نے مدد کرنے والے لوگوں اور بڑے بڑے زمینداروں کو جاگیر بھی دیں۔ یہ علاقہ سیاسی طور پر بھی بے حد متحرک رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران علاقے کے لوگوں نے حکومت کی جنگی کوششوں کی مخالفت کی۔ اس علاقے کے لوگوں کی کثیر تعداد سبھاش چندر بوس کی فوج میں بھی موجود تھی۔ بھارتی فوج میں ریواڑی سے تعلق رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد آج بھی موجود ہے جو اس علاقے کے لوگوں کی بہادری کی زندہ مثال ہے۔

میری معلومات کے مطابق ریواڑی وہ واحد ضلع ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی ایک فیصد سے بھی کم ہے جبکہ ہندو آبادی کا ننانوے فیصد ہیں۔ یاد رہے ضلع ریواڑی کی کل آبادی نو لاکھ کے قریب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی انتہائی حیران کن تھی کہ پنجاب بالکل ساتھ ہونے کے باوجود سکھوں کی آبادی صرف 0.20 فیصد ہیں۔ ان سب باتوں سے لگتا ہے کہ یہ علاقہ اُن مقامات میں سے ہے جہاں ہندوؤں کی اکثریت سب سے زیادہ ہے۔

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں لکھا کہ تیرھویں صدی کے آغاز ہی میں اس علاقے پر ایبک نے حکمرانی شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد مسلمان ہی زیادہ تر اس علاقے کے حکمران رہے۔ دلی سے سو کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر واقع ہونے کے باوجود بھی مسلمانوں کی آبادی اس قدر کم کیوں ہے؟ اس کی ایک وجہ تو آزادیِ ہند کے وقت یہاں سے کثیر تعداد میں مسلمانوں کی ہجرت ہوسکتی ہے اور دوسری وجہ اس علاقے کے ہندوؤں کا رویہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے آریہ سماج تحریک میں ریواڑی کے کردار کو سمجھنا ضروری ہے۔

آریہ سماج نامی تحریک کا آغاز دیانند سرسوتی نے 10 اپریل 1875ء کو ممبئی میں کیا۔ اس تحریک کا مقصد ہندومت کو ایک مذہب میں تبدیل کرنا تھا۔ جب اس تحریک نے ہریانہ میں زور

پکڑنا شروع کیا تو اس وقت اس کے بانی، سوامی دیانند سرسوتی نے ریواڑی کا دورہ کیا۔ جس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ریواڑی آریہ سماج تحریک سے کس قدر متاثر تھا۔

ایک نامور مؤرخ، کے سی یادو نے لکھا کہ دیانند کو ہریانہ کا دورہ کروانے میں راؤ یودیشٹر سنگھ (راؤ تولا رام کا بیٹا) پیش پیش تھا، جسے 1857ء کی جنگ کا ہیرو تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس دورے کے نتیجے میں ریواڑی کے اندر سوامی دیانند گئوشالا بھی قائم کیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ پہلا گئوشالہ تھا جو شمالی ہندوستان میں قائم کیا گیا۔ اس سے آپ ہندوؤں کے نزدیک ریواڑی کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

معاشرتی معاملات کی اصلاح بھی آریہ سماج کے مقاصد میں شامل تھی۔ اس تحریک نے کم عمری میں بچوں کی شادی، خواتین کی غیر مساوی حیثیت، دوسری ذات میں شادی اور بیوہ خواتین کی دوبارہ شادی جیسے مسائل پر بھی بات کی۔ آریہ سماج کے قائدین کی تعلیم کے میدان میں کارکردگی کو بھی ایک طبقہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ آریہ سماج کے بانی نے پنجاب بھر میں اس کی شاخیں قائم کیں۔ ان شہروں میں لاہور، جالندھر، امرتسر، گوجرانوالہ، لائل پور، لدھیانہ، امبالا اور گروگرام شامل ہیں۔

ہریانہ میں جاٹوں کی شناخت کا کام آریہ سماج تحریک کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس تحریک نے جاٹوں سے متعلق ایک عام تاثر، جس کے مطابق یہ لوگ متشدد اور جنگجو مانے جاتے تھے، کو ختم کرنے کے لیے بے حد کام کیا۔ جاٹوں میں آریہ سماج کی کامیابی کی وجہ اس تحریک کے بانی کی برہمن دشمنی تھی۔ وہ برہمنوں کے طریقے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس وقت ہریانہ کے جاٹ برہمنوں کی مذہبی سختیوں سے بے حد نالاں تھے۔ انھیں آریہ سماج کی صورت میں ایک ہمدرد نظر آیا۔

رام جی لال ہودا، آریہ سماج کی تحریک کا حصہ بننے والے پہلے جاٹ تھے۔ لالہ راجپت رائے انھیں آریہ سماج کا پہلا جاٹ کہتے ہیں۔ بعد ازاں لالہ رام جی نے اپنی جاٹ برادری میں اس تحریک کو بڑے پیمانے پر متعارف کروایا اور آریہ سماج کے نظریے کو عام کرنے کے لیے جاٹ

سبھاس اور مہا سبھاس جیسی تنظیموں کو منظم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک کا مقصد ان لوگوں کو ہندو دھرم میں واپس لانا بھی تھا جو کسی وقت مسلمان یا عیسائی ہو گئے تھے۔ اس کام کے لیے انھوں شدھی سبھاس میں شمولیت اختیار کی اور اس کے مقامی صدر بھی بن گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آریہ سماج کی تحریک نے ہریانہ میں کاشتکاری کرنے والے جاٹوں کی پسماندگی کو دور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس وجہ سے اسے جاٹ برادری میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج بھی ہریانہ کے تقریباً ہر شہر میں آریہ سماج کے مندروں اور تعلیمی اداروں کا وجود ان کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس علاقے میں آریہ سماج اور شدھی کی تحریکوں کی مقبولیت بھی ریواڑی میں مسلمانوں کی تھوڑی آبادی کی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔ مجھے اپنے اس خیال کے حق میں کسی دوسرے کی رائے نہیں ملی۔

کاریہ: جہاں سولھویں صدی میں شاہ صاحب کے بزرگ آکر آباد ہوئے

جیسے ہی ہم ریواڑی سے نکلے تو محترم شاہ صاحب کے جذبات میں مزید شدت آ گئی۔ میں ان کے احساسات محسوس کر رہا تھا۔ انھیں وہ سب کچھ یاد آ رہا تھا جو آج سے پچاس سال پہلے بیتا تھا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ ایک شخص طویل عرصے بعد اس علاقے میں آئے جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو اور زندگی کے پہلے دس سال گزرے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جہاں اس کے آباؤ اجداد کی قبریں بھی موجود ہوں، جذباتی کیفیت طاری ہونا ایک فطری عمل ہے۔

شاہ صاحب کو یہ یاد تھا کہ ریواڑی کے بعد تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اٹیلی منڈی کے پاس ریلوے لائن کے ساتھ ایک جگہ پتھروں کی سلیب بنانے کا کام ہوا کرتا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اب بھی وہاں پر یہ کام ہو رہا تھا۔ وہ سب دیکھ کر شاہ صاحب بے حد خوش ہوئے۔ انھیں یہ بھی یاد آیا کہ یہ وہی ریلوے سٹیشن تھا جہاں سے انھوں نے ریل پکڑ کر پاکستان ہجرت کی تھی۔ ایک صاحب سے راستے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اٹیلی سے آپ دائیں مڑ کر سات کلومیٹر

کے فاصلے پر کاریہ گاؤں ہے۔اس طرح ہم کاریہ، جو ہماری منزل تھا، پہنچ گئے۔

جوں جوں کاریہ قریب آتا جاتا، شاہ صاحب کی آنکھوں میں نمی بھی بڑھتی جاتی تھی۔

کاریہ، ہریانہ کے ضلع مہندر گڑھ میں واقع ہے۔شاہ صاحب نے بتایا کہ ان کے بزرگ سیّد ابراہیم صاحب، اکبر کے دور میں اس گاؤں میں آ کر آباد ہوئے تھے۔جس طرح ہمارے ہاں سڑک کے کنارے پر واقع گاؤں کا جو حال ہوتا ہے وہی کاریہ گاؤں کا بھی تھا۔ برلب سڑک دس سے بارہ دکانیں تھی جن کے پیچھے گاؤں تھا۔میرے اندازے کے مطابق اس کی آبادی تقریباً بارہ سو ہوگی۔ہم نے وہاں پر بیٹھے لوگوں سے اس بات کی تصدیق کی کہ کیا یہی کاریہ گاؤں ہے؟

ایک صاحب نے اس بات کی تصدیق کی اور ساتھ ہی پوچھا کہ آپ کو کس سے ملنا ہے؟ شاہ صاحب نے بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں اور میرے آباؤاجداد اس گاؤں کے رہنے والے تھے۔انھوں نے اپنے بزرگوں کے نام بھی بتائے۔ یہ بات سن کر کئی لوگ ہمارے قریب آ گئے۔ جن میں کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی تھے۔انھوں نے بھی شاہ صاحب کے آباؤاجداد کے بارے میں سن رکھا تھا۔نوجوان بھی شاہ صاحب کے والدین سے متعلق تھوڑی بہت معلومات رکھتے تھے۔ کچھ لوگوں نے شاہ صاحب سے تصدیق کی اور ان کے آباؤاجداد کے بارے میں کچھ سوالات بھی پوچھے۔ جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ شاہ صاحب ہی ان بزرگوں کی اولاد ہیں جن کا تعلق اس گاؤں سے تھا اور جن کی قبریں اب بھی اس گاؤں میں موجود ہیں تو وہ یہ سب جان کر بہت خوش ہوئے اور ہماری بہت زیادہ آؤ بھگت کی۔

ہم کچھ دیر ان کے ساتھ کھڑے رہے اور پھر ان سے درخواست کی کہ ہم گاؤں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر کچھ لوگ، جو اسی گاؤں کے رہنے والے تھے، وہ ہمارے ساتھ گاؤں کی طرف چل پڑے۔ مجھے اب تک یاد ہے اس کی گلیاں کافی کھلی تھیں۔ اکثر مکان ایک منزل پر مشتمل تھے۔ کچھ مکان پختہ اور کچھ مکان کچی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔جیسے ہی ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو ایک بڑے چوراہے پر شاہ صاحب نے اشارے سے بتایا کہ اس خالی جگہ پر ان کا

مکان ہوا کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ چلنے والے ایک صاحب نے اس بات کی تصدیق کی یہاں پر ہی آپ کا گھر تھا لیکن اب وہ جگہ خالی تھی۔

ابھی ہم وہاں پر کھڑے ہی تھے ایک بوڑھی عورت ہمارے پاس آ گئی اور اس نے شاہ صاحب سے بات کرنا شروع کی۔ اس عورت نے شاہ صاحب کی والدہ کا نام لے کر پوچھا۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ میں انھی کا بیٹا ہوں لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میرے والدین اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ یہ سن کر اس بوڑھی عورت نے افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ میری بہت ہی گہری سہیلی تھیں۔ شاہ صاحب نے پوچھا کہ ہمارے گھر میں ایک نیم کا درخت بھی تھا۔ اس بوڑھی عورت نے بتایا کہ وہ درخت موجود تھا لیکن اب نہیں ہے۔ یہ سن کر شاہ صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر بولے کہ مجھے یاد ہے کہ جب ہم اس گھر سے جا رہے تھے تو میری والدہ محترمہ اس درخت سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی تھیں۔

شاہ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب ہم جا رہے تھے اس وقت میری عمر صرف دس برس تھی، لیکن میرے بڑے بھائی اور باقی عزیز و اقارب جو مجھ سے بڑی عمر کے تھے، وہ گاؤں کے لوگوں سے گلے مل کر رو رہے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ جو لوگ جا رہے ہیں وہ شاید کبھی دوبارہ نہ آئیں۔ یہ باتیں کرتے وقت شاہ صاحب کی آواز رندھ گئی۔ وہ سب دیکھ کر میں نے انھیں آگے چلنے کے لیے کہا۔

ہم جس چوراہے پر کھڑے تھے اس سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک چبوترہ تھا جس پر چند قبریں موجود تھیں۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ یہ قبریں آپ کے آباؤ اجداد کی ہیں۔ میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ ابھی تک وہ چبوترا محفوظ تھا۔ قبروں کی نشانیاں بھی موجود تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی تو ہے جو پچھلے پچاس سال سے ان قبروں کی حفاظت کر رہا ہے۔ کیونکہ اگر آپ ہر سال قبروں کی لپائی نہ کریں تو وہ برے موسمی حالات کا چھپن سال تک مقابلہ نہیں کر سکیں۔ قبروں کو مناسب حالت میں دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ ہم نے دعا مانگی اور تصاویر بھی بنوائیں۔ شاہ صاحب نے ان قبروں کے پاس کھڑے ہو کر جو تصویر بنائی اسے اپنی ایک شعر و شاعری کی کتاب کے سرورق کے طور

پر استعمال کیا۔ حال ہی یہ بھی معلوم ہوا ہے کی گاؤں کے کچھ لوگوں نے ان قبروں پر چھت ڈال کر انھیں ایک مزار کی شکل دے دی ہے اور منت وغیرہ ماننے کا کام شروع ہو گیا ہے۔

قبروں کے مغرب کی طرف ایک مسجد بھی موجود تھی۔ مسجد کا ڈھانچہ تو موجود تھا لیکن جب اسے قریب سے دیکھا تو اس کے ہال میں جلانے کی لکڑیاں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ ہمیں وہ سب دیکھ کر دھچکا لگا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا کوئی مسلمان اس گاؤں میں نہیں رہتا؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ کے جانے کے بعد جو مسلمان باقی رہ گئے تھے وہ بھی اُن علاقوں میں چلے گئے جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ اس لیے اس گاؤں میں اب کوئی مسلمان بھی باقی نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ مسجد ویران ہے۔

مسجد اور قبروں کی زیارت کے بعد ہم اس جگہ پر واپس آ گئے جہاں کسی زمانے میں شاہ صاحب کا گھر ہوا کرتا تھا۔ اس گھر کے سامنے والے گھر کی خواتین نے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اس وقت تک تقریباً پچاس لوگ ہمارے اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ ہم سب ان کے گھر چلے گئے۔ انھوں نے ہمیں چارپائیاں مہیا کیں۔ چائے کا پوچھا، اس کے لیے ہم نے معذرت کر لی لیکن انھوں نے ہمیں پیتل کے گلاسوں میں پانی ضرور پلایا۔ مجھے یاد آیا کہ جب ہمارے دیہاتی علاقوں میں شیشے کے گلاس شروع نہیں ہوئے تھے تو پیتل کے گلاسوں میں ہی پانی پیا جاتا تھا۔

وہاں پر کئی عورتیں جمع ہو گئیں۔ انھوں نے شاہ صاحب سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ کوئی کہہ رہی تھی کہ آپ کی والدہ میری سہیلی تھی، تو کوئی یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کی چچی سے مجھے بہت پیار تھا۔ کسی نے کہا کہ بیماری کی صورت میں ہم آپ کے بزرگوں سے دم کرواتے تھے۔ بات سے بات نکلتی جا رہی تھی۔ شاہ صاحب درمیان میں موجود تھے۔ میں صرف باتیں سننے میں مصروف تھا۔ میرے دماغ میں بھی یہی باتیں چل رہی تھیں کہ کل جب میں اپنی والدہ کے گاؤں جاؤں گا تو وہاں کی عورتیں بھی میری ماں سے متعلق اسی طرح کی باتیں کریں گی۔ جب ہمیں وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تو ہم نے ان سے اجازت لی اور اڈے کی طرف چل پڑے۔

لوگ ہم سے باتیں کر رہے تھے، کوئی پاکستان کا پوچھتا تو کوئی عزیز و اقارب کا۔ ایک صاحب، جن کی عمر پچاس کے قریب ہو گی اور وہ تھوڑے پڑھے لکھے بھی لگ رہے تھے، انھوں نے ہم سے بات شروع کی۔ وہ ایسی بات تھی جس کا ذکر میں نے جہاں بھی کیا تو اس نے حیرت کا اظہار ہی کیا۔

ان صاحب نے پوچھا کہ محترم شاہ صاحب آپ اس گاؤں سے کیوں گئے؟

شاہ صاحب نے جواب دیا کہ جب آپ نے ہمیں مارنا شروع کیا اور ہمارے گھروں کو لوٹنا شروع کیا تو ہمارے پاس پاکستان جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ بات سن کر اس شخص نے جواب دیا کہ میں اس وقت بہت بڑی عمر کا تو نہیں تھا لیکن جو بات مجھے میرے بزرگوں نے بتائی، اس کے مطابق آپ کے بزرگ کئی صدیاں قبل اس علاقے میں آئے اور یہاں ایک مسجد بنائی۔ عام لوگ (ہندو اور مسلمان) انھیں بے حد پسند کرتے تھے۔ اس علاقے کے رہنے والے ہندو بھی آپ کے بزرگوں کے مرید تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میرے بڑوں نے یہ بھی بتایا کہ اردگرد کے چھ دیہات بھی آپ کے بزرگوں کے مرید تھے۔ ان کی کوئی درگاہ تو نہیں تھی لیکن یہاں بے شمار لوگوں کا آنا جانا تھا۔

آزادیِ ہند کے وقت جب فسادات کا آغاز ہوا تو جہاں بھی مسلمان اقلیت میں تھے وہاں مقامی لوگوں نے ان پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ اس علاقے کے لوگوں کو بھی احساس ہوا کہ کہیں کوئی فسادی آپ کے خاندان پر بھی حملہ نہ کر دے اور آپ کے گھر والوں کا کوئی نقصان نہ ہو جائے لہٰذا اردگرد کے دیہات سے لوگوں نے آپ کے گھروں پر پہرہ دینا شروع کر دیا۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ پہرہ اتنا سخت تھا کہ کسی کو بھی آپ کے خاندان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ سب آپ کے مرید اور خیر خواہ تھے اور آپ کی حفاظت کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے تیار کرتے تھے۔ اس کے باوجود بھی آپ یہاں سے چلے گئے۔

میں یہ سب سنتا رہا، میں کسی بھی طرح کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ البتہ شاہ

صاحب نے بڑی دلیری سے جواب دیا کہ جب آپ نے ہمیں مارنا شروع کیا تو پھر ہمارے لیے پاکستان جانے کے علاوہ کیا چارہ باقی بچا تھا؟

یہ بات سن کر اس شخص نے کہا کہ شاہ صاحب بات تھوڑی سی مختلف ہے، جب تک آپ اس گاؤں میں رہے، ہم سب کو یقین تھا کہ آپ بھارت سے نہیں جائیں گے۔ جیسے ہی آپ نے یہاں سے جا کر ریلوے سٹیشن پر کیمپ لگایا تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ آپ پاکستان جانا چاہ رہے ہیں اور آپ نے پاکستان کو بھارت پر ترجیح دی ہے۔ اس دن علاقے کے لوگ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری سے دستبردار ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کے ساتھ جو ہوا وہ سٹیشن پر ہوا، گاؤں میں نہیں۔ جب آپ نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو پھر ہم نے یہ سمجھا کہ اب آپ ہمارے دشمن ہیں، اسی لیے تو پاکستان جا رہے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کو (جو فسادی تھے) آپ کو نقصان پہنچانے کا موقع مل گیا۔

یاد رہے اس موقع پر بھی کسی سمجھدار شخص نے آپ کو نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ اُن لوگوں کے جتھے تھے جنھیں معاشرے میں کوئی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہم انھیں بعد میں فسادی ہی کہتے رہے۔ درحقیقت انھوں نے جو کچھ کیا، اس کا مقصد سوائے لوٹ مار کے اور کچھ نہ تھا۔ ان کا عمل ہر لحاظ سے قابلِ مذمت تھا اور اب بھی ہے۔ آپ کے خاندان کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس پر ہم اب تک شرمندہ ہیں۔

آخر میں انھوں نے کہا کہ آپ کو میری باتوں پر یقین کرنا چاہیے، اس کے ثبوت کے طور پر میں صرف اتنا کہوں گا کہ پچاس سال بعد بھی اس گاؤں میں آپ کے بزرگوں کی قبریں صحیح سلامت ہیں۔ یہ سب ان سے ہماری عقیدت کی وجہ ہی سے ہے۔ کوئی تو ہے جو ان قبروں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ یہ ہم ہندو ہی ہیں، اس گاؤں میں تو اب کوئی بھی مسلمان نہیں ہے۔ کچھ دن پہلے برادرم عامر جعفری نے بتایا کہ ان کے کسی عزیز نے ان قبروں کی مرمت کروا کے ان کی دیکھ بھال شروع کر دی ہے۔ ان پر چادریں بھی چڑھا دی ہیں۔ انھوں نے ان کی تصاویر بھی بھجوائیں۔

بحث طول پکڑتی جا رہی تھی اور ماحول میں جذباتی پن بھی آ رہا تھا۔ میں نے شاہ صاحب سے گزارش کی کہ ہمیں اس بحث کو ختم کر کے واپسی کا سفر شروع کرنا چاہیے۔ ان صاحب سے کی گئی گفتگو کے بعد بہت سے سوالات نے جنم لیا۔ جن میں یہ سوال سب سے اہم تھا کہ فسادات کے وقت یقینی طور پر یہ سب ہوا ہوگا۔ بعدازاں ہر شہر میں کیمپ لگائے گئے۔ میرے آبائی شہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ کی غلہ منڈی میں ہندوؤں اور سکھوں کے لیے کیمپ لگایا گیا۔ سرہند میں میرے بزرگوں کے لیے حضرت مجدّد الف ثانی کے دربار پر کیمپ بنایا گیا۔ دونوں طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ کئی ماہ بعد جب امن ہوا تو لوگوں کو ریل کے ذریعے بھارت سے پاکستان اور پاکستان سے بھارت لایا گیا۔

جو کچھ ہوا وہ فسادات کے دوران ہوا لیکن جب امن ہو چکا تھا تو ان لوگوں (ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں) نے کیمپوں سے واپس اپنے گھروں کو جانے کے بجائے نقل مکانی کو ترجیح کیوں دی؟ گھر اور زمینیں تو موجود تھیں۔ گھروں کا سامان تو یقینی طور پر لوٹ لیا گیا تھا۔ آزادیِ ہند کے فارمولے میں نقل مکانی کا تو کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ مسلمان اکثریت والے علاقے (صوبے) پاکستان کا حصہ ہوں گے اور ہندو اکثریت کے علاقے بھارت کا حصہ ہوں گے۔ ریاستیں اپنا فیصلہ خود کریں گے۔ بعدازاں اسے اضلاع تک پھیلا دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں کی گئی، پھر تقسیم کا عمل تحصیل کی سطح تک آ گیا۔ اسی بنیاد پر سندھ اور پنجاب کی تقسیم ہوئی، حتیٰ کہ اضلاع کی بھی تقسیم ہوئی۔ اس سے تو یہ ظاہر تھا کہ لاہور نے ہر حال میں پاکستان کا حصہ بننا ہے اور دہلی نے بھارت کا۔ اگر لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تو ان کو دوسری جگہ آ کر تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

کیا ایسا ہو سکتا تھا اگر ہو سکتا تھا تو ایسا کیوں نہ ہوا؟

اس کا مجھے کوئی تسلی بخش جواب تو نہ مل سکا لیکن لوگوں کا کہنا یہی تھا کہ وہ اس قدر مشکل وقت تھا کہ مل جل کر رہنے کی کوئی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کیا یہ بات درست تھی؟

میرے مطابق یہ بات کافی حد تک درست ہے۔ میں نے پچھلے صفحات میں بھی اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ ایسی کئی ریاستیں تھیں جنھوں نے بطور ریاست مسلمانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا۔ تاریخ میں اس بات کے کئی ثبوت موجود ہیں کہ پہلے مسلمانوں سے ہتھیار لے لیے گئے اور بعد میں ہندوؤں اور سکھوں کے جتھوں نے ان پر حملے کر دیا۔

سیّد مودودی نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے برادرم راؤ محمد ظفر سے بات کی تو انھوں نے بھی اس بات کے ثبوت کے طور پر کئی واقعات کا تذکرہ کیا۔ بھارت کے بعض مقامات پر مقامی انتظامیہ نے مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت سے مجبوری ظاہر کی اور انھیں کیمپوں میں جانے پر مجبور کیا۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب مسلمانوں نے اپنی مرضی سے ہجرت نہیں کی بلکہ بہت سوں کو ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ ان کے لیے حالات ہی کچھ ایسے پیدا کر دیے گئے کہ زندہ بچنے کی ایک ہی صورت باقی تھی۔ البتہ کچھ ایسے بھی ضرور ہوں گے جنھوں نے اپنی مرضی سے ہجرت کی۔

میں ایک ایسے شخص کو بھی جانتا ہوں جنھوں نے 1990ء کے بعد ہجرت کی۔ میرے ساتھ آئی سی آئی میں کام کرنے والے ایک صاحب نے 1967ء میں حیدر آباد سے ہجرت کی۔ چند سال قبل بھارت سے کیمیکل کا کام کرنے والی ایک فرم کی طرف سے ہمارے ہاں ایک خاتون تشریف لائیں۔ اس نے بتایا کہ اس کی پیدائش سکھر کی ہے۔ اس کے والدین نے 1995ء میں نقل مکانی کی۔ اس طرح کے اکا دکا واقعات کا ہونا کسی بڑی بات کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

ایک طرف اگر میں یہ کہوں کہ مسلمانوں کو بزور طاقت ہجرت پر مجبور کیا گیا تو پاکستان سے جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی کی کیا وجہ تھی؟ کیا وہ اپنی مرضی سے گئے یا انھیں بھی مجبور کیا گیا؟ کیا وہ بھی اپنی جان بچانے کی خاطر نقل مکانی پر مجبور ہوئے؟

اصل وجہ کیا تھی؟

میں نے اس کا بھی جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی

وجہ اس ہجرت کے ساتھ جڑے جذبات ہیں جو تاریخی حقائق پر حاوی ہو جاتے ہیں، یہ میرا تاثر ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

وسیع پیمانے پر نقل مکانی اور اتنے سخت حالات کے باوجود بھی ایک مناسب تعداد میں (مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں) نے نقل مکانی نہیں کی۔ آج بھی پاکستان میں ایک مناسب تعداد میں بسنے والے ہندو اور سکھ اور بھارت میں بسنے والے بیس کروڑ مسلمان اس بات کا ثبوت ہیں کہ دوقومی نظریے کے باوجود کسی بھی معاشرے میں دو سے زائد مذاہب کے لوگ مل جل کر رہ سکتے ہیں اور رہ بھی رہے ہیں۔

میرے علم کے مطابق آزادیِ ہند کے وقت کسی بھی عیسائی نے موجودہ پاکستان سے بھارت کی طرف نقل مکانی نہیں کی۔ موجودہ پاکستان میں رہنے والے عیسائیوں نے پاکستان میں ہی رہنا کیوں پسند کیا؟ جب کہ اس ملک کی بنیاد ہی مذہب پر رکھی گئی تھی اور بھارت اُس وقت سے ہی ایک سیکولر ملک ہونے کا راگ الاپ رہا تھا (بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کافی حد تک بے بنیاد ہے)۔ اس طرح کے بے شمار سوالات کے جواب آج بھی لوگ تلاش کر رہے رہیں ہیں۔

ایک طویل سفر کے بعد ہم نے واپسی اختیار کی اور شام گئے مانگٹ صاحب کے گھر دہلی واپس آئے۔ اس دن ان کی شادی کی تیسویں سالگرہ تھی، جو ہم نے ان کے ساتھ مل کر منائی۔ اس کا کچھ احوال بھی پیشِ خدمت ہے۔

رنبیر سنگھ مانگٹ اور ان کی شادی کی تیسویں سالگرہ اور پراگتی میدان بھارت کی ایک اہم نمائش گاہ

ریواڑی سے واپسی پر ہم مانگٹ صاحب کے گھر چلے گئے جہاں ان کے والد محترم سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی بیٹی اور بیوی بھی وہاں موجود تھیں۔ بہت دیر تک ہم ان کے اہل و عیال سے باتیں کرتے رہے۔ مانگٹ صاحب کے والد سکھوں کی طرح داڑھی رکھے ہوئے تھے جبکہ مانگٹ صاحب اور ان کے بچوں نے کلین شیو کر رکھی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس

پر انھوں نے مجھے جو جواب دیا وہ حاضرِ خدمت ہے۔

انھوں نے بتایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جب اندرا گاندھی کو ان کے سکھ گارڈز نے قتل کر دیا تھا تو اس وقت دلی میں ایک ہی دن کے اندر ہزاروں سکھوں کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت میں کسی دوسرے شہر میں تھا اور بذریعہ ریل دہلی واپس آ رہا تھا۔ ہم راستے میں تھے تو پتہ چلا کہ دہلی میں سکھوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا ہے۔ سکھ اپنی وضع قطع سے بہت آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ میں نے بھی سکھوں کی طرح اپنے سر اور داڑھی کے بال رکھے ہوئے تھے اور سر پر پگڑی بھی باندھتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میں اور ہمارے ساتھ ریل میں موجود سکھ بہت گھبرا گئے۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ ایسی صورت میں سب نے سوچا کہ اگر ہم اسی حالت میں دہلی گئے تو ہمیں بھی قتل کر دیا جائے گا۔ ہم نے بہت ہی مجبوری میں یہ فیصلہ کیا کہ اپنی داڑھی اور سر کے بالوں کو کاٹ دیا جائے۔ ریل میں موجود کچھ لوگوں سے قینچی لی اور اپنے سر اور داڑھی کے بال کاٹ دیے اور پگڑیاں اتار کر بیگ میں ڈال لیں، سر کے بال بھیگی آنکھوں سے چوم کے بیگ کے اندر والے حصے میں رکھ لیے، جان بچانے کی خاطر دھرم کو قربان کیا، جس کا آج تک افسوس ہے۔

وہ سب کچھ ہم نے اس لیے کیا تا کہ ہم پہچانے نہ جا سکیں۔ اس کے بعد سے ہی صورت حال ایسی ہے۔

میں نے رنبیر صاحب کے بیٹے سے پوچھا کہ آپ نے سکھوں جیسا حلیہ کیوں نہیں بنایا؟ ان کا جواب بھی دلچسپ تھا جو بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کی نشاندہی بھی کرتا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ میں بچپن ہی سے سکھوں کی طرح سے داڑھی اور سر پر پگڑی رکھتا تھا۔ جب بھی میں اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ سفر کرتا تو راستے میں اگر کہیں بھی گاڑی کی چیکنگ ہوتی تو کسی اور کی چیکنگ نہیں ہوتی تھی بلکہ یہی کہا جاتا کہ سردار جی آپ باہر آئیں۔ اس وجہ سے مجھے بار ہا پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ دھرم تو انسان کی سوچ میں ہوتا ہے، اس کے عمل میں ہوتا ہے پگڑی ہونے یا نہ ہونے، داڑھی ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا

ہے؟ اس لیے میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا۔ اب میرے سامنے تین نسلوں کے لوگ تھے، مانگٹ صاحب کے والد (جواب تک مکمل سکھوں کی وضع قطع کے ساتھ تھے) اور باقی دونوں نسلوں کے لوگوں نے خود کو بدل لیا تھا۔

مانگٹ صاحب کے والد کسی مل میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کچھ دلچسپ باتیں بتائیں جو بظاہر تو بہت معمولی تھیں لیکن بہت ہی غیر معمولی بھی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے چالیس سال تک ایک ہی مل میں کام کیا اور وہ بھی ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر۔ نہ میں نے نوکری بدلی اور نہ ہی مل والوں نے میری سیٹ لی اور نہ ہی میرا ڈپارٹمنٹ بدلنے کی کوشش کی۔ جس جگہ میں پہلے دن جا کر بیٹھا ریٹائرمنٹ کے بعد اسی جگہ سے اٹھ کر آیا یہ ایک بہت بڑی خوبی تھی جو بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

انھوں نے ایک اور دلچسپ بات بتائی (جسے سن کر آپ یقیناً مسکرائیں گے) عام طور پر گھڑی بائیں ہاتھ پر باندھی جاتی ہے لیکن میں نے ہمیشہ اپنے دائیں ہاتھ پر باندھی۔ اس کی وجہ یہ تھی اگر بائیں ہاتھ پر ہوتی تو مجھے وقت دیکھنے کے لیے ہاتھ کو اٹھانا پڑتا ہے اور پھر بازو گھما کر وقت دیکھنا پڑتا۔ اس میں وقت بھی لگتا اور مجھے اپنا کام بھی روکنا پڑتا۔ دائیں ہاتھ پر ہونے کی وجہ سے اگر میں لکھ بھی رہا ہوں تب بھی وقت دیکھنے کے لیے ہاتھ کو کوئی جنبش دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

انھوں نے ساری عمر محنت مشقت کی اور اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا آبائی علاقہ لدھیانہ کے قریب تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مصروفیت کے لیے انھوں نے پینٹنگ شروع کر رکھی تھی۔ انھوں نے ہمیں اپنی کچھ پینٹنگز دکھائیں جو ہر لحاظ سے عمدہ تھیں۔

مانگٹ صاحب نے ہمیں بتایا کہ آج رات کا کھانا ہم باہر کسی ریستوران میں کھائیں گے۔ ہمیں اس کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ جب ہم چلنے لگے تو انھوں نے بتایا کہ آج ہماری شادی کی تیسویں سالگرہ ہے تو اس خوشی میں ہم کھانا باہر کھائیں گے۔ ہم نے انھیں مبارکباد دی اور

اپنی گاڑی میں ریستوران کی طرف چل پڑے۔ راستے میں میں نے شاہ صاحب سے کہا کہ اس موقع پر ہمیں بھی کوئی تحفہ لے لینا چاہیے۔ انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ راستے میں ہم ایک دکان پر رکے- اس دوکان کی مالک ایک خاتون تھیں جو اس وقت دکان میں ہی موجود تھیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم کسی کی شادی کی تیسویں سالگرہ پر جا رہے ہیں اور ان کے لیے کوئی تحفہ لینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہماری راہ نمائی فرمائیں۔ انھوں نے بہت ہی اچھا سا پرفیوم ایک خوب صورت کاغذ میں پیک کر کے ہمیں دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ بہت خوش قسمت لوگ ہوں گے جو تیس سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں اور اپنی شادی کی تیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ میری طرف سے بھی انھیں مبارک باد دیجیے گا۔

جب ہم ریستوران کی طرف جا رہے تھے تو شاہ صاحب نے کاغذ پنسل لے کر اس پر شادی کی سالگرہ کی مناسبت سے شعر لکھنا شروع کر دیئے۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ انھوں نے بہت کم وقت میں تقریباً کوئی دس بارہ خوب صورت شعر لکھ لیے۔

جب ہم ریستوران پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑا ریستوران تھا۔ اس کی دیوار پر بہت بڑا نقشہ بنا ہوا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ پنجاب کا ایسا نقشہ دیکھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے دہلی سے پشاور تک کے تمام علاقے کو پنجاب کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں انگریزوں نے سرحدی علاقہ جات کو الگ کر کے شمال مغربی سرحدی صوبے کا نام دیا۔

میرے علم کے مطابق یہ پنجاب کی پہلی تقسیم تھی۔ اس کے بعد چل سو چل ۔۔۔ آج اس پنجاب کے چار حصے ہو چکے ہیں ۔۔۔ اگر سرائیکی صوبے اور ہزارہ صوبے کی مانگ کامیاب ہو گئی تو پھر کتنے حصے ہوں گے ۔۔۔ معلوم نہیں ۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب تقسیم کرو اور حکومت کرو کی سوچ کے تحت ہو رہا ہے۔ جو کل بھی کارگر تھا اور آج بھی یہی پالیسی چل رہی ہے۔

جب ہم ہال میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کافی لوگ بیٹھے تھے۔ میں نے ویٹر سے کہا کہ آج ہمارے دوست کی شادی کی تیسویں سالگرہ ہے۔ ایسے موقع کی مناسبت سے کوئی گانا سنوائیں۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ انھوں نے رفیع صاحب کا کوئی ایک بہت ہی مشہور گانا سنوایا، جس کے بول کچھ یوں تھے: ؎

سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا

اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے دوست شاعر ہیں ہم پاکستان سے آئے ہیں اور انھوں نے شادی کی سالگرہ کے حوالے سے ایک غزل بھی لکھی ہے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے انھوں نے مائیک پر اعلان کیا کہ ہمارے ایک مہمان کی شادی کی تیسویں سالگرہ ہے اور اس موقع پر پاکستان سے آئے ہوئے ایک شاعر اپنے کچھ اشعار سنانا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب کو اسٹیج پر بلوایا گیا۔ شاہ صاحب نے پچھلے آدھے گھنٹے میں لکھے گئے وہ تمام اشعار سنائے اور بے حد داد وصول کی۔

پاکستان آ کر میں نے وہ شعر لکھ کر مانگٹ صاحب کو بھی بھجوائے۔ مانگٹ صاحب نے جواب دیا کہ میرے لیے اردو پڑھنا ممکن نہیں لیکن میں نے اردو پڑھنے والے کچھ دوستوں سے انھیں پڑھوایا تو مجھے بہت اچھا لگا، اس کا بے حد شکریہ۔

پراگتی میدان: بھارت کی ایک اہم نمائش گاہ

ہمارا یہ سفر دہلی میں ہونے والی ایک صنعتی نمائش میں شرکت کے لیے تھا۔ اس نمائش میں ٹیکسٹائل سے متعلق کیمیکلز، مشینری اور قسم قسم کی اشیا موجود تھیں۔ یہ مرکز دہلی کے بالکل قریب ہی واقع تھا جس کا کل رقبہ 150 ایکڑ ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھارت کا بہت بڑا ایگزیبیشن سینٹر ہے۔ لاہور میں واقع ایکسپو سنٹر کا منصوبہ 2002 میں بنایا گیا اور اس کی تکمیل 2010 میں ہوئی تھی۔ اس کا کل رقبہ پچاس ایکڑ ہے اور اس میں اس وقت تک دو بڑے ہال ہیں۔

بھارت میں انیس سو ستر کی دہائی میں ایک طویل مدتی منصوبے پر کام شروع ہوا جس کے تحت بے شمار تعلیمی ادارے اور کئی ریسرچ سنٹر بھی بنائے گئے۔ صنعتی ترقی کے لیے صنعتی نمائش کا ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے دہلی کے قریب ایک بہت بڑا رقبہ حاصل کیا گیا

جس کا افتتاح 1972ء میں اندرا گاندھی نے کیا۔ اس افتتاح کو بھارت کے پچیس سالہ جشن آزادی کے ساتھ جوڑا گیا- اس سنٹر کو بہت عمدہ طریقے سے بنایا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے اس کی تمام ڈیزائننگ بھارتی لوگوں نے ہی کی ہے۔ اس کمپلیکس میں نمائش کے لیے اٹھارہ ہال اور عمارتیں موجود ہیں۔ یہاں پر ہر سال ستر سے زائد قومی اور بین الاقوامی نمائشوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یہاں پر بھارت کی سب سے بڑی نمائش بھی لگتی ہے جس کا نام انٹرنیشنل انڈیا ٹریڈ ہے اس میں لگ بھگ تیس لاکھ لوگ شریک ہوتے ہیں۔

دہلی میں اس سنٹر کے پاس چھوٹی پہاڑی پر ایک درگاہ موجود ہے جسے بابا مٹکا پیر کی درگاہ کہا جاتا ہے۔ بابا مٹکا پیر کا اصل نام صوفی حضرت شیخ ابوبکر طوسی حیدری قلندری رحمت اللہ علیہ ہے لیکن وہ بابا مٹکا پیر کے نام سے ہی جانے جاتے ہیں- جیسے ہی آپ درگاہ پر پہنچتے ہیں تو آپ کو ایک درخت سے لٹکے ہوئے مٹی کے بہت سے برتن دکھائی دیں گے اور اس کے آس پاس کی دکانوں پر بھی مٹی کے برتن ملیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں آپ کو وافر مقدار میں چنے بھی بکتے نظر آئیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ جلد کی ایک لا علاج بیماری میں مبتلا ایک شخص یہاں آیا تو ان بزرگ نے اسے پینے کو پانی دیا جس سے وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو گیا۔ یہ سن کر دلی کے اس وقت کے حکمران غیاث الدین بلبن نے بابا جی کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ایک شخص کے ہاتھ لوہے کی گیندوں اور کیچڑ کا ایک تھال بھیجا۔ تھال دیکھ کر بابا جی نے اسے ڈھانپ لیا اور دعا کرنے لگے۔ جب وہ دعا سے فارغ ہوئے اور تھال کا پردہ ہٹایا تو سب لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لوہے کی گیندیں بھنے ہوئے چنوں میں اور کیچڑ گڑ میں بدل گیا تھا۔ پھر بابا جی نے وہ سب پانی میں ملایا اور میٹھا دودھ بنا لیا۔ یہ سب کچھ سر عام ہوا۔ اس واقعے کے بعد ان کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور لوگ انھیں بابا مٹکا پیر کہنے لگے۔ آپ کو بھارت اور پاکستان کے طول و عرض میں ایسے بے شمار مزارات ملیں گے۔ ایسا صدیوں سے ہی ہوتا آیا ہے۔

بیرا جی کی بٹیا کی شادی اور دہلی میں موجود ایک اور میانوالی، شالیمار باغ دہلی

جیسا کہ میں نے بھارت کے چار سفر حصہ اوّل میں ذکر کیا تھا کہ جب میں پہلی مرتبہ بھارت آیا تو میری بیرا جی سے ملاقات ہوئی تھی، جن کا آبائی وطن پنجاب ہے۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد دہلی میں سکھوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام ہوا تو اس کا بدلہ لینے کے لیے سکھوں نے پنجاب میں ہندوؤں کو مارنا شروع کر دیا۔ یہ بالکل اسی طرح کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جیسی آزادیِ ہند کے وقت تھی۔ جب مغربی پنجاب کے مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے تو انھوں نے اس کے بدلے مغربی پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ بیرا جی ایسے ہی حالات کی وجہ سے دہلی آ گئے تھے۔ میں جب بھی بھارت آتا تو ان سے ضرور ملتا تھا۔

اس دفعہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ میری بٹیا کی شادی ہے اور آپ اس شادی میں ضرور شریک ہوں۔ ہمارے ہاں عام طور پر بیٹی کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ بھارت میں بہت سے لوگ بیٹی کی بجائے بٹیا کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ شادی کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے سفر میں کچھ تبدیلی بھی کی۔ اس کی وجہ ان کی انتہائی محبت سے شادی میں شرکت کی دعوت تھی۔ یہ میری پہلی مرتبہ کسی بھی ہندو خاندان کی شادی میں شرکت تھی۔ شادی رات کے وقت تھی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ٹھیک آٹھ بجے تک آ جائیں۔ وہ شادی مجھے اب تک یاد ہے۔

شادی کی جگہ حوض خاص کی طرف کھلی جگہ پر تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ رات کے وقت اتنی دور شہر سے باہر جانے سے خوف بھی آ رہا تھا لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ بہرحال ہم تینوں ان کی شادی میں پہنچ گئے۔ ہمارے ہاں شادی کا تصور ابھی تک یہی تھا کہ شادی کسی شادی ہال یا گلی محلے میں شامیانہ لگا کر کی جاتی ہے اور مخصوص وقت پر لوگ آتے ہیں اور پھر سب مل کر کھانا کھاتے ہیں، لیکن اس شادی کا منظر بہت ہی مختلف تھا۔

جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں شادی ہو رہی تھی تو ہم نے دیکھا کہ تقریباً ایک ایکڑ پر پھیلا ہوا

ایک کھلا میدان ہے جس کے ایک کونے میں لکڑی کا ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی تقریباً دس فٹ کی اونچائی پر ایک اسٹیج بنا ہوا تھا۔ایک کونے میں بڑا سا کمرہ تھا۔میدان میں داخل ہوتے ہی ہمارے بائیں طرف ایک بازار لگا ہوا تھا جہاں گول گپے، دہی بھلے اور اس طرح کی چیزیں موجود تھیں۔ایک جگہ آگ جل رہی تھی جس کے اوپر ایک چھوٹی سی چھت بھی تھی۔آگ کے پاس ایک صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ وہ کوئی ہندو پنڈت ہیں جو پھیروں کے وقت منتر وغیرہ پڑھتے ہیں۔ایک طرف بہت سے پھلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن سے جوس نکالا جا رہا تھا۔میدان کے وسط میں کئی تندور لگے ہوئے تھے جس میں مختلف قسم کی روٹیاں پکائی جا رہی تھیں اور اس کے چاروں طرف کھانوں کے اسٹال تھے۔ ہر سٹال پر مختلف طرز کے کھانے میسر تھے۔ چار طرح کے مختلف سٹالز تھے،جن پر مختلف علاقوں کے کھانے موجود تھے: جیسے کانٹی نینٹل، چائینز، جاپانی، یورپین وغیرہ۔ جیسے ہی ہم داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ بیرا جی مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ہم بھی ان سے ملے۔ہمیں مل کر وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کے ساتھ ہمارا تعارف بھی کروایا اور انھیں بتایا کہ یہ لوگ پاکستان سے آئے ہیں اور صرف میری بٹیا کی شادی کے لیے انھوں نے اپنے سفر کو مؤخر کیا ہے۔

جیسے ہی ہم آگے بڑھے تو ہم نے دیکھا کہ پلیٹ فارم کے ساتھ بنے ہوئے اسٹیج پر لڑکے، لڑکیاں اور بڑی عمر کے مرد و خواتین مختلف گانوں پر رقص کر رہے تھے۔ وہ پیشہ ور لوگ نہیں تھے بلکہ مہمان تھے اور ان میں سے کچھ جو ناچنا جانتے تھے وہ مختلف گانوں کی دھنوں پر ناچ رہے تھے۔ ہمارے ہاں اب یہ کام مہندی پر ہوتا ہے۔ کچھ نیچے اور کچھ سٹیج کے اوپر ناچ رہے تھے۔

جیسے ہی ہم بیرا جی سے مل کر آگے جانے لگے تو ایک صاحب ایک ٹرے میں دس بارہ قسم کے جوس لے کر آ گئے۔ وہ تازہ پھلوں کے جوس سے پہلا سواگت تھا۔اس کے بعد ہم کھانے کے سٹالز کی طرف چلے گئے۔تندوروں میں مختلف اقسام کے اناج سے روٹیاں بن رہی تھیں جو سائز میں بہت ہی چھوٹی تھیں۔مختلف سٹالز پر ہم نے بہت سے کھانے دیکھے۔مختلف کھانے چکھنے

(کھانے نہیں) کے بعد سامنے کی طرف دیکھا تو ایک اور بازار نظر آیا جس میں دودھ دہی کی دکان موجود تھی۔ ایک جگہ دودھ میں جلیبی ڈال کر بھی دی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بے شمار میٹھی چیزوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دودھ جلیبی دیکھ کر یاد آ گیا کہ ہمارے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک خان دودھ والے ہوتے تھے۔ وہ شام کے وقت پیالوں میں دودھ اور جلیبی ڈال کر رکھتے تھے۔ رات کے وقت بہت بڑی تعداد میں لوگ ان کی دکان پر دودھ جلیبی کھانے جاتے تھے۔

جیسے ہی ہم باہر نکلنے کے لیے چلے تھوڑا آگے پہلے تو ہم نے دیکھا کہ دائیں طرف پان کا ایک بازار لگا ہوا ہے۔ جس میں مختلف اقسام کے پان مل رہے تھے۔ پان کی گلوری بھی ہم سب نے بہت شوق سے کھائی۔ ہم لوگ جتنا کچھ کھا چکے تھے اسے ہضم کرنے کے لیے پان ایک مفید چیز تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ کھانے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا۔ جیسے جیسے لوگ آتے، کھانا کھاتے اور چلے جاتے لیکن جاتے ہوئے بیرا جی کو ایک لفافہ ضرور پکڑا جاتے۔ لفافہ دینے کی رسم پنجاب میں عام ہے۔ اس موقع پر میں نے ایک دلچسپ مکالمہ بھی سنا۔ (ہمارے ہاں بھی ایسا ہوتا ہے)۔

میں نے دیکھا کہ دونو جوان لڑکے بیرا جی کو ایک لفافہ دے رہے تھے، لیکن بیرا جی وہ لینے سے انکاری تھے۔ بچے یہ کہہ رہے تھے کہ ابو کی طبیعت خراب تھی (یا کوئی اور بہانہ لگا رہے تھے) اس لیے وہ نہیں آ سکے۔ بیرا جی کہہ رہے تھے کہ اگر وہ نہیں آئے تو میں یہ سلامی (نیوندرہ) بھی نہیں لوں گا۔ ہمارے ہاں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی بڑا دعوت میں نہ آئے تو پھر اس کی طرف سے بھیجی گئی سلامی بھی نہیں لیتے۔ اس شادی میں دو ہزار سے زائد مہمان تھے۔ وہ ایک دلچسپ تجربہ تھا جس کی ایک مختصر جھلک میں نے آپ کی خدمت میں پیش کی ہے۔

یاد رہے کہ یہ ایک ہندو خاندان کی شادی تھی۔۔۔ ان کے تمام کھانوں میں نہ ہی کوئی انڈا تھا اور نہ ہی کسی بھی قسم کا کوئی گوشت۔۔۔ اس کے باوجود بھی سینکڑوں اقسام کے کھانے۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ شادی کا طریقہ کار بھی وہی صدیوں پرانا۔۔۔ جسے ہندو اپنی تہذیب اور تمدن کہتے ہیں۔ جس سے متعلق ہندوؤں کا کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان پر کئی غیر ملکی اور غیر ہندو مذاہب

کے لوگوں نے صدیوں حکمرانی کی اور وہ ان کے غلام رہے، انھوں نے اپنے صدیوں پرانے تہذیب وتمدن کو نہیں بدلا اور اسے مضبوطی سے سنبھالے رکھا۔۔۔اسے وہ اپنی تہذیب وتمدن کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ہندو پرم پراؤں کا پاس کرنا بھی کہتے ہیں۔۔۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ باہر سے آکر حکومت کرنے والوں نے ان پر اپنی زبان کا نفاذ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن آج بھی ان کی زبان ہندی ہی ہے۔۔۔

ان کی یہ بات تو کسی حد تک درست ہے لیکن ان کی نئی نسل میڈیا کی یلغار کے سامنے سرنگوں ہو چکی ہے اور اپنی تہذیب سے دن بدن دور ہوتی جا رہی ہے۔ جسے غیر ملکی حکمران تو فتح نہ کر سکے، لیکن غیر ملکی میڈیا ضرور ڈھیر کر چکا ہے، اس بات پر عام ہندو بھی پریشان ہے، (ویسے پریشان ہم بھی کم نہیں)۔

دہلی میں موجود ایک اور میانوالی

اپنے وطن سے کس کو محبت نہیں ہوتی۔ وہ بھلے مسلمان ہو، انگریز ہو، ہندو ہو یا سکھ۔ جب ہم بھارت جا رہے تھے تو شاہ صاحب نے بتایا تھا کہ میانوالی سے دہلی آکر آباد ہونے والے ہندو بھی کثیر تعداد میں دہلی میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک روشن لال ہیں وہ شانتی نگر میں رہتے ہیں۔ وہ میانوالی بھی آتے رہتے ہیں اور میری ان سے اچھی سلام دعا بھی ہے۔ شاہ صاحب کے پاس ان کا رابطہ نمبر بھی تھا۔ ایک دن ہم نے انھیں ہوٹل سے فون کیا اور وہ دوسرے دن صبح ہی تشریف لے آئے۔ اس طرح مجھے بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ شخص اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ وہ جتنی دیر ہمارے پاس بیٹھے رہے، مسلسل باتیں کرتے رہے، جن کا موضوع میانوالی اور وہاں کے رہنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے زیادہ تر سرائیکی میں ہی بات کی۔ کبھی کبھی اردو بھی بولتے تھے لیکن وہ بھی سرائیکی لہجے میں۔ ان کا میانوالی کے لوگوں کی طرح اونچی آواز میں کھل کر بات کرنا مجھے اب تک یاد ہے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم ممبئی جا رہے ہیں اور واپسی پر ان کے ہاں آئیں گے۔

جب ہم ممبئی میں تھے تو شاہ صاحب نے پوچھا کہ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ایک دن پہلے چلا جاؤں کیونکہ ممبئی میں میرا دل نہیں لگ رہا اور میں کچھ وقت روشن لال کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ وہ موبائل فون کا دور نہیں تھا اس لیے میں تھوڑا سا گھبرایا کہ شاہ صاحب اکیلے جائیں گے۔ ایک طویل سفر اور اجنبی شہر۔ پریشانی فطری بات تھی۔ شاہ صاحب نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں ان شاءاللہ محفوظ طریقے سے روشن لال کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسی کے ڈیرے پر ہی رہوں گا۔ شاہ صاحب اپنی دھن کے پکے اور ارادوں کے پختہ انسان تھے– میں نے بہت ہی مجبور ہو کر ان کی بات مان لی اور وہ ایک دن پہلے ممبئی سے دہلی آ گئے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ روشن لال کے گھر پہنچیں تو مجھے اطلاع دیں جو انھوں نے دے دی۔ جس سے میں مطمئن ہو گیا کہ شاہ صاحب اب محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔

جب شاہ صاحب ان کے گھر گئے تو انھوں نے بتایا کہ روشن لال نے میانوالی کے لوگوں کو یہاں اکٹھا کیا ہوا ہے اور ان کی ایک انجمن بھی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میانوالی کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ جس کا مقصد ان سب کو اکٹھا رکھنا اور ساتھ ساتھ ان کے مسائل کے حل کے لیے کوشش بھی کرنا ہے۔ یہ برادری خاص طور پر بچے اور بچیوں کی شادی کے معاملے میں ایک دوسرے کی بہت مدد کرتی ہے اسی طرح کی ایک بنوں برادری کی تنظیم بھی موجود ہے۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ ان کا گھر کم اور ڈیرہ زیادہ ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا ہے۔ شاہ صاحب ان کے ہاں دو راتیں رہے۔ جب واپس آئے تو بہت ہی خوش تھے۔

انھوں نے بتایا کہ کئی خاندان میانوالی سے لٹ لٹا کر، اپنی صدیوں پرانی رہائش گاہوں کو چھوڑ کر اور اپنے کاروبار کو بند کر کے دہلی آئے تھے۔ یہ لوگ میانوالی سے تو آ گئے لیکن آج بھی ان کا دل میانوالی میں ہی ہے۔ ان کے گھروں میں میانوالی ہیکی سرائیکی زبان بولی جاتی ہے۔ (جو زبان صدیوں سے یہ لوگ بولتے آ رہے تھے وہ چند سالوں میں دہلی کی فضا میں بدل نہیں سکتی تھی۔) شاید آنے والی نسلیں اسے آگے لے کر نہ چل سکیں۔ روشن لال سے مل کر یوں لگتا تھا کہ دہلی کی

ثقافت نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔

میں جب ان سے ملا تو مجھے کئی اور لوگ بھی یاد آئے جن ایک مشہور بھارتی صحافی بھی شامل ہیں جن کا تعلق میانوالی کے قریب وانؔ بھچراں سے تھا۔ انھوں نے اپنے اس قصبے سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس طرح بے شمار لوگ ہیں جو یہاں سے وہاں گئے اور انھوں نے اپنے شہروں کو یاد رکھا- کئی لوگوں کے آبائی شہروں کے نام ان کے نام کا حصہ بھی ہیں، جیسے بٹالوی، لدھیانوی، امرتسری، سرہندی وغیرہ۔ یہ سب اپنے آبائی وطن سے محبت کی نشانی ہے۔

ایک دن میں ٹیکسٹائل کی نمائش میں تھا (جس کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں)۔ میرے پاس کچھ مقامی لوگ بھی کھڑے تھے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے کہا ''بھیہ ونج''۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور ان سے پوچھا کہ آپ سرائیکی میں بات کر رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا سرائیکی تو پاکستان میں بولی جاتی ہے۔ کیا یہ زبان بھارت میں بھی بولی جاتی ہے؟ میری یہ بات سن کر انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ پاکستان سے ہیں؟ میں نے کہا کہ جی ہاں، میں لاہور میں رہتا ہوں۔ یہ سن کر وہ سب میرے قریب آ گئے اور کہنے لگے ہمارا گھر بنوں میں تھا۔ آزادیِ ہند کے وقت ہمارے بڑے بھارت آ گئے تھے۔ پھر دیر تلک۔۔۔ بنوں کی باتیں، بنوں کی یادیں، نقل مکانی کی داستان، جو مارے گئے یا راہ میں مر گئے، ان کا ذکر، اندرون بنوں میں دکانوں کی روداد۔۔۔ اور آخر میں رندھی ہوئی آواز اور بھیگی بھیگی پلکیں۔۔۔ دونوں طرف۔۔۔

پھر مجھے استاد دامن یاد آ گئے جنھوں نے آزادیِ ہند کے بعد ہندوستان میں ہونے والے پہلے ہندو پاک مشاعرے میں یہ پنجابی غزل پڑھی تھی۔

ے بھاویں مونہوں نہ کہیے پر وچوں وچی
کھوئے تسی وی او، کھوئے اسی وی آں
ایہناں آزادیاں ہتھوں برباد ہونا
ہوئے تسی وی او ہوئے اسی وی آں
کجھ امید اے زندگی مل جائے گی

موئے تسی وی او، موئے اسی وی آں
جیوندی جاں ای، موت دے منہ اندر
ڈھوئے تسی وی او، ڈھوئے اسی وی آں
جاگن والیاں رج کے لٹیا اے
سوئے تسی وی او سوئے اسی وی آں
لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے
روئے تسی وی او روئے اسی وی آں

یہ رونا کیوں ہوا؟ کون ذمہ دار ہے؟ کس کے سر ہے بیس لاکھ لوگوں کا خون؟ کس نے صدیوں سے آباد ایک ہی گلی میں رہنے والے لوگوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنایا؟ کس نے ایک کروڑ سے زائد لوگوں کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا؟

میرا ننھیالی گاؤں سرہند، پٹیالہ کے پاس تھا۔ میرے نانا کے کسی بڑے نے اسلام قبول کیا لیکن باقی سارا خاندان سکھ ہی رہا۔ ایک ہی برادری، ایک ہی خاندان، ایک ہی محلہ، ایک ہی گاؤں، کچھ لوگ مسلمان اور کچھ لوگ سکھ۔ آزادیِ ہند کے وقت انہی سکھوں نے میرے نانا کے خاندان پر بے انتہا ظلم ڈھائے، عورتوں کو اغوا کیا، جو آزادیِ ہند کے بعد سکھوں کے بچے جنتی رہیں اور کبھی واپس نہ لوٹ سکیں- میرے عزیز فیصل ٹھاکر نے بتایا کہ نارووال کے قریب ان کے گاؤں میں صدیوں سے آباد ستر ہندوؤں کا قتل عام کیا گیا۔ ایک عورت کو اغوا بھی کیا گیا۔ فیصل صاحب کے ایک رشتہ دار نے اس سے شادی کی، اس سے ایک بچہ بھی ہوا (جو جنوری 2021ء میں فوت ہو گیا- ہندو ہونے کی وجہ سے اس عورت کو خاندان میں کسی نے نہ تو عزت دی اور نہ ہی اس بچے کو اس کا صحیح مقام۔۔۔

قصور اس کا جس نے اغوا کیا اور سزا اسے جسے اس کے والدین اور خاندان سے زبردستی جدا کیا گیا۔

کیا آزادیِ ہند بغیر کسی قتل و غارت کے ممکن نہ تھی؟ میرے خیال میں ممکن تھی۔۔۔پھر یہ لاکھوں کی تعداد میں بے گناہ انسانوں کا قتل کیوں ہوا؟

یہ سوال تو ہمیشہ موجود رہے گا۔۔۔اور آج نہیں تو کل تاریخ اس کا جواب ضرور دے گی۔۔۔جب جواب آئے گا تو جھوٹی عقیدتوں کے بت مسمار ہوں گے، کاش اس دن میں زندہ ہوں اور ان ظالموں کا انجام دیکھ سکوں۔

اہل برطانیہ نے بھی ایک سو سال بعد ایک آمر کی لاش قبر سے نکال کر اسے پھانسی کی سزا دی تھی، بیس لاکھ لوگوں کے قاتل کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا، میری سوتیلی والدہ کے اغوا کار اور اسے پناہ دینے والوں کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا، میرے والد کو (جو ایک خوشحال زمیندار گھرانے کے ایک گھبرو نوجوان) ایک زمیندار کے کامے ہونے پر مجبور کرنے والے کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا، ہوگا یقیناً ہوگا، یہ سب میرے ذاتی دشمن ہیں، کیسے بخش دوں، کیسے بھول جاؤں، ناممکن ہیں۔ یہ تحریر بھی اسی لیے لکھ رہا ہوں تاکہ اگلی نسل یہ جان سکے کہ ان کے باپ دادا کے ساتھ کیا بیتی تھی، کون اس کا ذمہ دار تھا، اسے ضرور تلاش کرنا ہے، تاریخ کے اُن اوراق سے ضرور پردہ اٹھانا ہے جنھیں جان بوجھ کے چھپایا گیا، ایک غلط راگ الاپا گیا، سورج طلوع ہونے کا یقین ہے تو اس بات کا بھی یقین ہے، کہ مجرم چہرے ضرور سامنے آئیں گے۔۔اگر میرے سوہنے رب، سچے بادشاہ، میرے پالنہار نے چاہا تو وہ دن ضرور آئے گا۔

مجھے توفیض بھی سکھا گیا ہے، اس نے صحیح کہا ہے:

ہم دیکھیں گے، ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے

جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
یہ دھرتی دھڑدھڑدھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بُت اُٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ سفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو ناظر بھی ہے منظر بھی
اُٹھّے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔

اگر آج پاکستان میں پانچ فیصد غیر مسلم رہ سکتے ہیں تو بیس فیصد کیوں نہ رہ پاتے؟ آج اگر

بھارت میں بیس فیصد مسلمان رہ سکتے ہیں تو تیس فیصد کیوں نہ رہ پاتے؟ اگر آج بھارت کے شہر حیدرآباد میں چالیس فیصد مسلمان رہ سکتے ہیں تو سرہند میں دس فیصد مسلمان کیوں نہ رہے؟ اگر آج تھر میں پچاس فیصد سے زائد ہندو امن سے رہ سکتے ہیں اور اپنے ایم این اے خود چنتے ہیں تو لاہور میں پانچ فیصد ہندو اور سکھ کیوں نہ رہے؟

کیا کہیں ایسا تو نہ تھا کہ اصل مقصد نقل مکانی اور ہجرت کا ماحول بنا کر، فساد کو مذہبی رنگ دے کر، فضا میں نفرت کے بیج بو کر اور اقلیتوں کو ختم کر کے اکثریت کو اپنی من مانی کرنے کا موقع مہیا کرنا تھا؟

میں اس سوال کے جواب کی تلاش میں ہوں۔

یہ میری رائے ہے اور پختہ رائے ہے،

اور اختلاف آپ کا حق ہے۔۔۔نفرت نہیں اختلاف۔۔۔ یہ جو کچھ ہوا۔۔۔ یہ اختلاف نہیں تھا بلکہ نفرت تھی جو پھیلائی گئی۔۔۔اور پھر تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی و ہجرت ہوئی اور بیس لاکھ لوگوں کا قتل ہوا، ایک کروڑ سے زائد لوگ نقل مکانی پر مجبور ہوئے، لاکھوں خواتین اغوا ہوئیں،، بے شمار بچے والدین سے بچھڑ گئے،۔۔۔ایک پوری نسل اس سانحے میں برباد ہوئی۔۔۔ ایسے سانحے کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔۔۔اللہ کرے ایسا کسی کے ساتھ بھی نہ ہو۔

شالیمار باغ دہلی

جب بھی ہم شالیمار کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک خوب صورت باغ کا تصور آتا ہے۔ یہ لفظ شالیمار ہے یا شالا مار ہے۔سرکاری کاغذات میں اسے شالیمار باغ ہی لکھا ہوا ہے لیکن عام بول چال میں ہم اسے شالا مار باغ بھی کہتے ہیں۔ پاکستان ریلوے نے لاہور سے کراچی تک ایک ٹرین بھی چلائی جس کا نام شالیمار رکھا گیا تھا۔ پاکستان میں رہنے والے لوگ لاہور میں واقع شالیمار باغ سے بخوبی واقف ہیں۔البتہ اس بات کا مجھے بھی علم نہیں تھا کہ ایسے دو اور باغ، سرینگر اور دہلی میں بھی واقع ہیں۔ جب ہم نے دہلی سے چندی گڑھ کا سفر

شروع کیا تو نقشے سے پتہ چلا کہ دہلی کے شمال مغرب میں ایک بڑی آبادی کا نام شالیمار باغ ہے۔اس علاقے میں مغل حکمرانوں کا بنایا ہوا ایک شالیمار باغ بھی ہے۔ میں اس باغ کو دیکھ نہ سکا، جس کی حسرت ہی رہی۔ نہ دیکھنے کی وجہ میری شالیمار باغ سے متعلق لاعلمی تھی۔اس باغ کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

شالیمار باغ دہلی، سترھویں صدی میں مغل حکمرانوں نے بنوایا تھا۔ یہ باغ ان پرانے باغوں میں سے ایک ہے جو اپنی اصل حالت میں اب تک موجود ہیں۔اس باغ کے ساتھ ایک تاریخی واقعہ بھی جڑا ہے۔تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ 1658ء میں اس باغ میں اورنگ زیب کی تاج پوشی کا فنکشن بھی ہوا تھا۔ان تین باغات کے نام شالیمار باغ ہی کیوں رکھے گئے؟ میں نے اس کا جواب ڈھونڈنے کی کافی کوشش کی لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔

میرے اندازے کے مطابق اس لفظ کا تعلق شاہجہاں سے ہے۔ مار کے لفظ سے لگتا ہے کہ یہ لفظ عمارت سے لیا گیا ہے۔ یہ سب قیاس ہے۔صحیح بات کیا ہے میں اس بات کا کھوج تا حال نہیں لگا سکا۔کئی لوگوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ تمام تر باغات شاہجہاں کی بیوی اکبر آبادی بیگم نے بنوائے تھے۔شاہجہاں نے بے شمار عمارتیں بنوائیں اور اسی وجہ سے اسے مغلیہ سلطنت کا معمار بھی کہا جاتا ہے۔ان کی بیٹی کی بنائی ہوئی بھی کئی عمارتیں موجود ہیں، جس سے لگتا ہے کہ تعمیرات سے دلچسپی اس خاندان کا خاصّہ تھی جس کا اظہار ہندوستان بھر میں شاندار عمارتوں کی تعمیر سے ہوتا ہے۔

اگر آپ نے لاہور کا شالیمار باغ دیکھا ہے تو آپ سمجھ لیجیے کہ یہ باغ بھی اسی جیسا ہے۔ البتہ اس میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی گئی ہیں جو لاہور میں نہیں کی گئیں، جیسے بچوں کے لیے کھیل کی جگہ وغیرہ۔اس کے باوجود ایک بڑے حصے پر پھلوں کے درخت اب بھی موجود ہیں۔اس باغ کی ایک اور منفرد بات یہ ہے کہ اس کے بالکل آخر میں وہ جگہ ہے جو شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھی، جہاں وہ آکر ٹھہرتے تھے، جسے شاہی کو نہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

شالیمار باغ، لال قلعے اور شاہجہان آباد (دلی) سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔ اس لیے یہ بادشاہ کی تفریح کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ لاہور کا شالیمار باغ بھی قلعے سے دور ہے، جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ بادشاہ سلامت تفریح اور جنگ کو علیحدہ رکھتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک یہ باغ مراٹھوں کے زیر قبضہ بھی رہا۔ انگریزوں نے بھی اس پر قبضہ کیا اور دہلی میں برطانوی باشندوں نے بھی اس سے لطف اٹھایا کئی انگریزوں نے تو اسے اپنی نجی ملکیت بھی بنایا، جس نے اس باغ کی تباہی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

حصار براستہ روہتک

میرے چوتھے سفر کا مقصد دہلی کے اردگرد موجود ٹیکسٹائل ملز کا دورہ کرنا تھا۔ یہ ایک معلوماتی دورہ تھا۔ ہمارے میزبان نے ایک دن ہمیں روہتک کے پاس ایک ٹیکسٹائل مل کے دورے کا بندوبست کیا۔ ٹیکسٹائل مل میں جو دیکھا، وہ بہت ہی خوب تھا۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی ہو رہی تھی کہ میں ایک ایسے علاقے میں جا رہا تھا جہاں دو اہم روہتک اور حصار آباد ہیں۔ ان دونوں شہروں کی وجہ شہرت ان کی آزادیِ ہند میں قربانیاں ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ان شہروں کے بارے جاننے کے بعد آپ اس بات پر یقین کریں گے کہ آزادیِ ہند بغیر کسی قربانی کے ممکن نہیں ہوئی۔

روہتک (Rohtak) ریاست ہریانہ کا ایک اہم شہر اور ضلع روہتک کا صدر مقام ہے۔ یہ نئی دہلی سے 70 کلومیٹر (43 میل) شمال مغرب میں واقع ہے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ روہتک کو قدیم نام روہیتک (Rauhitaka) سے شناخت کیا جاتا ہے۔ یہ نام بارھویں صدی کے تاریخی ماخذ راج ترنگنی میں ایک قصبے اور ضلعے کے طور پر درج ہے۔ اب تک میں جو جان سکا اس کے مطابق روہتک کی قدیم تاریخ نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ شہر کے قدیم قلعے کے سوہیلی دروازے کی ایک تصویر 1870ء میں جوزف ڈیوڈ بیگلر نے کھینچی تھی۔ میرے کئی جاننے والے، روہتک کے رہنے والے ہیں۔ ان کی بولی، ہماری بولی سے کافی مختلف ہے۔ اسی علاقے میں کھوکھر کوٹ (Khokhrakot) کے آثارِ قدیمہ بھی پائے جاتے ہیں۔ وہاں سے دریافت

شدہ سکوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک قدیم علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ تیسری یا چوتھی صدی عیسوی کے دور کے یودھیہ (Yaudheya) حکمرانوں کے دور سے تعلق رکھنے والے بڑی تعداد میں برتن بھی یہاں سے ملے ہیں۔ اس کے علاوہ مٹی کی مہریں، گپتا دور (چوتھی تا چھٹی صدی عیسوی) کی تصویری تختیاں اور بعد کے ادوار سے متعلقہ مجسمے بھی یہاں دریافت ہوئے ہیں۔

یہ بھی تاریخ سے جاننے کو ملتا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی کے مشہور فلکیاتی متن سوریا سدھانت (Surya Siddhanta) میں کرۂ ارض کو ایک گول سیارے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جس کا بنیادی خطِ طول (Prime Meridian) اونتی (اجین) اور روہتک کے درمیان سے گزرتا بتایا گیا۔ اس وقت مقامی علاقوں میں پنچانگ تقویم کے مطابق وقت کا تعین کیا جاتا تھا۔ جب میں نے ان کے بارے مزید جانا تو بے حد حیرانی ہوئی کہ اتنے بڑے سائنسدان کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا۔ ان کے بارے کئی کتابیں ملتی ہیں۔ ایک کتاب: *Sûrya-Siddhânta: A Text-book of Hindu Astronomy by* Phanindralal Gangooly ہے اس بارے بہت کچھ لکھا ملتا ہے۔

اسی علاقے سے آستھل بوہر (Asthal Bohar) گاؤں سے ساتویں صدی عیسوی کا جین مذہب کے تیئیسویں تیرتھنکر پارشوناتھ (Parshvanatha) کا مجسمہ دریافت ہوا۔ نویں صدی کے جین ماخذ، مثلاً ویپاکاسترا (Vipakasutra)، میں بھی روہتک میں پارشوناتھ اور ان کے محافظ دھارنندرا کی مقبولیت کا ذکر موجود ہے۔ یہ متن شویتامبرا جین مت کے بارہ قدیم متون میں سے ایک ہے، جو نویں صدی عیسوی میں بادشاہ ویسامن دتّا اور پُشیا نندی کے عہد میں تحریر ہوا۔ قصبہ دسویں صدی تک ترقی کرتا رہا۔ یہاں ہندو شاہی خاندان کے حکمران سامنت دیو کے سکے بھی ملے ہیں۔ گیارھویں صدی میں 1020ء تا 1030ء کے دوران محمود غزنوی نے اسے فتح کیا۔ بارھویں صدی میں چوہان (چاہمنہ) حکمرانوں نے روہتک کے علاقے پر قبضہ رکھا۔

میں نے اکبر نامہ میں بھی اس کا ذکر پڑھا ہے۔ سولھویں صدی کے ماخذ آئین اکبری

کے مطابق روہتک دہلی سرکار کے تحت مغلیہ سلطنت کا ایک پرگنہ تھا جو ایک بڑی رقم کے ساتھ ساتھ دو ہزار پیادے اور سو گھڑسوار فوجی مرکز کے لیے مہیا کرتا تھا۔ اس وقت ایک اینٹوں کا قلعہ بھی موجود تھا، جبکہ اس پرگنے میں جاٹ برادری کا اثر ورسوخ نمایاں تھا۔

حصار: ایک قدیم شہر

روہتک سے حصار سو کلومیٹر سے بھی زائد فاصلے پر واقع ہے۔ پاکستان میں بہت بڑی تعداد خاص طور پر پنجاب میں ایسے لوگوں کی ہے جو حصار سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ وہ اپنی منفرد بود و باش، مختلف لب ولہجہ اور زبان کی وجہ سے آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں اس شہر کو قریب سے نہ دیکھ سکا۔ میرے لیے سب سے حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان علاقوں میں مسلمان ایک بڑی تعداد میں رہتے تھے لیکن اب ان علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔ اتنی کم تعداد کی کوئی بھی حیثیت نہیں ہوتی اور ایسی اقلیت کو زندہ رہنے کے لیے بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ لوگوں سے بات کرنا چاہی لیکن مجھے کوئی خاص معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ صرف اتنا ہی پتہ چلا کہ جب پورے محلے میں مسلمانوں کا ایک ہی گھر ہو گا تو اس کی کیا حیثیت ہو گی۔

اس بات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ دہلی میں ایک ہندو خاندان کی عورت سے میں نے پوچھا کیا آپ کے محلے میں کوئی مسلمان بھی رہتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک خاندان ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا ان سے کیسا برتاؤ ہے؟ ان کا جواب تھا کہ کیونکہ وہ بہت ہی کمزور ہیں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے ان کے ساتھ ہمارا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ہم سب ان کے ساتھ ہمدردی کا رویہ رکھتے ہیں۔

مجھے ان کی اس بات پر کافی حد تک یقین آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب میں اپنی والدہ کے گاؤں گیا جو سکھوں پر مشتمل ہے اور اب اس میں صرف ایک مسلمان گھر ہے۔ مسلمان اس گاؤں کے چوکیدار بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ سکھوں کے جانور بھی چرانے کا کام بھی کرتے ہیں۔

یہ بات میں نے ان سے بھی پوچھی تھی۔انھوں نے کہا تھا ہم تو صرف ایک خاندان ہیں اس لیے ان کے ساتھ ہمارا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ جب مقابلہ ہی نہ ہو تو پھر ایک کے پاس ہمدردی کے اور دوسرے کے پاس اطاعت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچتا۔

بہر حال اقلیت کبھی بھی اکثریت کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔ وہ ہمیشہ ہی نفسیاتی طور پر دباؤ میں رہتی ہے۔ایسا ہی اس علاقے میں تھا جس سے ہم گزر رہے تھے۔ میں باوجود کوشش کے کوئی ایسی دکان نہ دیکھ سکا جسے کوئی مسلمان چلا رہا ہوں۔ میرے خیال میں یہاں جو بھی مسلمان ہیں ان میں سے اکثریت محنت مزدوری ہی کرتی ہے۔

حصار دہلی کے مغرب میں 164 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اس شہر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر پر تیسری صدی قبل مسیح میں موریہ خاندان کی حکومت تھی۔اس طرح سے یہ شہر دو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ بارھویں صدی تک یہاں پر مختلف ہندو راجاؤں کی حکومت رہی ہے۔ بعد میں سلاطین دہلی بھی اس علاقے پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ یہ شہر مغلیہ سلطنت کا بھی حصہ رہا ہے۔

حصار کے قریبی مقامات پر آثار قدیمہ کی کھدائی سے پتہ چلا ہے کہ اس جگہ پر ہڑپہ دور میں بھی آبادی تھی۔ بعد میں یہاں ریاست حصار قائم ہوئی جس کا پایہ تخت اگروہہ تھا۔ یونانیوں کے خلاف جنگ اس علاقے کے لوگوں نے ممکنہ طور پر چندر گپت موریہ کی مدد کی۔ بعد میں یہ علاقے موریہ سلطنت کا حصہ بھی رہے۔ پرتھوی راج کی شکست کے بعد غوری بھی اس علاقے پر حکومت کرتا رہا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ موجودہ شہر حصار فیروزہ، فیروز شاہ تغلق نے 1354ء میں آباد کیا تھا۔اس شہر کے چار دروازے ہیں،جن کے نام دہلی گیٹ ،موری گیٹ، ناگوری گیٹ اور طلقی گیٹ ہیں۔ یہاں پر ایک قلعہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔اس قلعے کے وسط میں فیروز شاہ کا محل بھی موجود ہے۔اس قلعے میں کئی اور عمارتیں بھی ہیں جن میں ایک اہم فیروزہ حصار محل ہے جو بادشاہ

سلامت نے اپنی ایک گجری بیوی کے لیے بنایا تھا۔ اس قلعے پر تیمور نے 1398ء میں حملہ کیا اور حسب معمول لوٹ مار کرنے کے بعد اس کے فوجیوں نے قلعے کو آگ لگا دی تھی۔ لودھی کو شکست دینے کے بعد بابر نے بھی اس قلعے پر قبضہ کیا۔ یہ شہر سن 1760ء تک مغلوں کے قبضے میں رہا بعد میں مقامی لوگوں نے ایک طرح سے آزادی کا اعلان کر دیا۔

فیروز شاہ تغلق کا بنایا ہوا یہ کمپلیکس فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ اس کمپلیکس میں کئی عمارتیں ہیں جس میں دیوان، عام، دیوانِ خاص اور بھی کئی۔ یہاں پر ایک کونے میں ایک چبوترہ بنا ہوا ہے۔ جس پر بیٹھ کے فیروز شاہ تغلق فیصلے کیا کرتا تھا۔ اس تخت کے بالکل نیچے ایک گہرا کنواں بھی ہے۔ کہتے ہے کہ تغلق نے یہ کنواں اس لیے بنوایا تھا کہ اگر وہ کوئی غلط فیصلہ کرے گا تو یہ تخت ٹوٹ جائے گا اور وہ سیدھا کنویں میں گر جائے گا۔

شروع میں حصار شہر، قلعے کے اندر تک ہی محدود تھا۔ جس کے چار دروازے تھے۔ اس محل میں ایک مسجد بھی بنائی گئی جس کو لاٹ کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کے ساتھ بھی ایک کہانی منسوب ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے حصہ اوّل میں میرٹھ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ فیروز شاہ تغلق وہاں سے اشوکا ستون اٹھا کر لایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے یہ ستون چار حصوں میں تقسیم کر کے اس مسجد کے صحن میں دوبارہ جوڑ کر کھڑا کیا۔ جس کی وجہ سے اس مسجد کو لاٹ، یعنی ستون کی مسجد کہا جاتا ہے۔

ہندوؤں کا کہنا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کے لیے بھی مسجد قوت الاسلام کی طرح کئی مندر تباہ کیے گئے اور ان سے سامان اٹھا کر یہ مسجد تعمیر کی گئی۔ اس بات کے ثبوت کے طور میں وہ یہاں کئی پتھروں پر سنسکرت زبان کی موجودگی کا سہارا لیتے ہیں۔ اس دعویٰ کی سچائی میں ہندوؤں کے پاس مسجد میں لگے ہوئے ستون بھی ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس ستون کا ایک حصہ فتح آباد میں واقع مسجد میں لگایا گیا تھا۔ اشوکا کے بنائے ہوئے اس طرح کے ستون ہندوستان کے کئی اور علاقوں میں بھی

پائے گئے ہیں۔ ان ستونوں پر اس دور کی زبان میں تحریر بھی لکھی ہوئی ہے۔ جسے انگریز جیمس پرنسیپ نے جو اس زبان کا ماہر تھا، ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ ستون اڑھائی سو قبل مسیح میں بنائے گئے تھے۔ میں نے اس کمپلیکس کی کئی وڈیو دیکھی ہیں جو ان سب باتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس وقت شہر میں مسلمانوں کی آبادی بہت ہی کم ہے۔ اس لیے معلوم نہیں کہ یہ مسجد آباد بھی ہے کہ نہیں۔ وڈیو سے یہ لگتا ہے کہ یہ مسجد آباد نہیں ہے۔ یہاں لوگ صرف ایک قدیم کمپلیکس کو ہی دیکھنے آتے ہیں۔ اس کا انتظام اب بھارتی حکومت کے پاس ہے۔

انگریزوں سے پہلے ایک آئرش نے اس علاقے پر قبضہ کیا۔ یہ بات میرے لیے بھی نہایت ہی حیران کن ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ ہندوستان کی بندر بانٹ ہو رہی تھی، سب ہی اپنا حصہ لے رہے تھے۔ لیکن جلد اس علاقے پر مراٹھوں نے حملہ کیا اور آئرش کو نکال دیا۔ پھر ایک دلچسپ صورت پیدا ہوئی کہ مراٹھوں کے حلیف لیفٹیننٹ بورکویان (جو کہ ایک فرانسیسی افسر تھا) نے مراٹھوں کے نمائندہ کے طور پر ان علاقوں کو کنٹرول کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں مراٹھوں کی مدد کی تھی۔ اس نے توہن اور حصار کے قصبوں کو دوبارہ سے تعمیر کیا تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی دشمنی یورپ سے چلتی ہوئی شمالی ہندوستان تک بھی آن پہنچی تھی۔

چاروں طرف انگریزوں کا راج تھا۔ جیسے ہی مراٹھوں کو شکست ہوئی انگریزوں نے اس علاقے پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح یہاں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج قائم ہو گیا۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں کے لوگوں نے 1857ء کی آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس میں محمد عظیم اور راؤ تولا رام پیش پیش تھے۔ (راؤ تولا رام کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کیا ہے)۔ آخر کار مقامی لوگوں کو شکست ہوئی اور جنگ میں حصہ لینے کی پاداش میں مقامی بااثر افراد کو پھانسی دے دی گئی اور جنھوں نے صاحب بہادر کی مدد کی انھیں جاگیریں دی گئیں۔

صلہ تو ملا۔۔۔۔

کسی کو پھانسی اور کسی کو دربار میں کرسی!

یہی وہ دور تھا جب انگریزوں نے نمک کی تجارت پر محصول حاصل کرنے کے لیے ایک چار ہزار کلومیٹر طویل ایک راہداری بنائی تھی۔ جو اس دور کی اپنی نوعیت کی واحد ایک مثال تھی۔ اس شہر میں اسٹیل کی ایک بڑی صنعت ہونے کی وجہ سے اسے بھارت سٹی آف سٹیل (City of Steel) کہا جاتا ہے۔ بھارت میں جستی لوہے کی سب سے بڑی صنعت بھی اسی شہر میں واقع ہے۔ جندال گروپ کی سربراہ ساویتری جندال ہیں، (جو دنیا کی دسویں سب سے زیادہ دولت مند خاتون مانی جاتی ہیں) ان کا تعلق بھی حصار سے ہی ہے۔ غرض تاریخی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شہر معاشی طور پر بھی ایک اہم شہر ہے۔

اس شہر کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ آبادی کا ستانوے فیصد ہندو ہے، باقی تین فیصد آبادی مسلمانوں، سکھوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ آزادیِ ہند سے قبل ایک اندازے کے مطابق مسلمان آبادی کا بیس فیصد تھے۔ آزادیِ ہند کے بعد جن علاقوں میں مسلمانوں کو ایک کثیر تعداد میں قتل کیا گیا ان میں یہ علاقے بھی شامل ہیں۔

فسادات میں جو ہاتھ لگ گئے انھیں مار دیا گیا باقی جان بچا کر پاکستان میں آ گئے!

ایسی ہی کہانی ہے پنجاب اور ہریانہ کے مختلف علاقوں کی بھی۔۔۔

انھیں یہ سب یاد ہے جو اس کہانی کے مظلوم کردار تھے!

حال ہی میں اس علاقے میں کئی مسلمانوں کے ہندو دھرم قبول کرنے کے واقعات بھی ہوئے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر کہ مسلمانوں کی کیا صورت حال ہے۔ اقلیت، کہاں تک مقابلہ کر سکتی ہے!

سری مکتسر صاحب

انسانی جذبات کی ایک داستان اور میرے مرشد اشفاق احمد خان کی جائے پیدائش:

میں نے اپنے چاروں اسفار میں مشرقی پنجاب اور ہریانہ کے کئی اہم شہر دیکھے ہیں۔ ان میں جو میں نہیں دیکھ سکا، ان میں حصار، برنالہ، سری مکتسر صاحب، فیروز پور، فرید کوٹ، مالیر کوٹ، پٹیالہ،

سنگرور، نکودر کے ساتھ کئی اور شہر بھی ہیں۔ان میں سے اکثر کا ذکر میں نے اپنی اس کتاب میں کیا ہے۔ایک ایسے شہر کا ذکر باقی ہے، جس کا نام سری مکتسر صاحب ہے۔ میں اس کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔اس کی دو وجوہات ہیں۔پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں گرو گوبند سنگھ اور مغل فوج کے درمیان ایک بڑی جنگ ہوئی تھی جس میں گرو کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ دوسری وجہ میرے لیے بڑے ہی قابلِ احترام اور روحانی رہنما جناب اشفاق احمد خان کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔

سکھی ویڈیا کے مطابق شری مُکتسر صاحب، جسے عموماً مکتسر کہا جاتا ہے، بھارت کی ریاست پنجاب کا ایک تاریخی شہر اور ضلع کا صدر مقام ہے۔ یہ شہر بھارتی پنجاب کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے اور جنوب میں اس کی سرحدیں ریاستِ راجستھان اور ہریانہ سے ملتی ہیں۔شمال میں ضلع فریدکوٹ اور مشرق میں ضلع بٹھنڈہ اس کے ہمسایہ ہیں۔گرو انگد دیو جی (نانک دوم) جو سکھوں کے دوسرے گرو ہیں، اسی ضلع کے گاؤں مٹے دی سرائے (موجودہ سرائنگا) میں پیدا ہوئے تھے۔اس شہر کے نام کی ایک داستان ہے۔ کہتے ہیں کہ 1705ء میں دسویں سکھ گرو، گرو گوبند سنگھ جی نے مغلوں کے خلاف ایک فیصلہ کن معرکہ لڑا۔اس جنگ میں چالیس سکھوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔انھی کے اعزاز میں اس مقام کو مکتسر کہا گیا۔مکتی کا مطلب ہے آزادی یا معافی قبول کرنا اور سر کا مطلب ہے تالاب۔اس واقع میں ایک سکھ عورت مائی بھاگو کا بھی ایک اہم کردار سامنے آتا ہے۔اس کی مذہبی اور تاریخی اہمیت کے باعث حکومت نے اس کا نام شری مکتسر صاحب رکھا۔اس ایک تاریخی واقعے کا مختصر ذکر یقینی طور پر آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ 1705ء میں، چمکور کی جنگ کے بعد، جب مغلوں کے ساتھ شدید معرکہ ہوا تو گرو گوبند سنگھ ایک ایسے مقام کی تلاش میں تھے جہاں وہ اپنی افواج کو دوبارہ منظم کر سکیں اور مغل فوجوں کا مقابلہ کر سکیں۔اسکے بعد گرو گوبند سنگھ خدرانے دی ڈھاب (Khidrane di Dhab) پہنچے، جہاں انھوں نے مغل فوج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔اس دوران انھیں اطلاع

ملی کہ مغل افواج، جن کی تعداد کم از کم دس ہزار تھی اور جن کی قیادت وزیر خان، صوبہ دار سرہند کر رہا تھا، ان کا پیچھا کر رہی ہیں۔ اس موقعے پر ماجھے کے علاقے (جھبال) سے تعلق رکھنے والے چالیس سکھوں نے گرو کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ روایت یہ بھی ہے کہ گرو گوبند سنگھ نے ان سے ایک تحریری دستاویز پر دستخط کروائے تھے جس میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ اب گرو کے ساتھ نہیں رہیں گے۔

مگر جب جنگ شروع ہوئی تو وہ اپنی اس غلطی پر نادم ہوکر اور مائی بھاگو کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں سے یہی چالیس افراد دوبارہ گرو کی فوج میں شامل ہو گئے۔ سکھوں کی طرف سے مزاحمت سخت ہوتی گئی اور مغل فوج پانی کی شدید قلت کے باعث مشکل میں آ گئی۔ یاد رہے کہ یہ مغل اور خالصہ کی آخری بڑی جنگ تھی جس میں مغلوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا اور گرو گوبند سنگھ فتح یاب ہوئے۔

پھر وہ واقعہ پیش آتا ہے جس کی بنیاد پر اس جگہ کا نام مکتسر رکھا گیا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ جنگ کے بعد جب گرو گوبند سنگھ زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کی تلاش کر رہے تھے تو، انھیں مائی بھاگو زخمی حالت میں ملیں اور انھوں نے بتایا کہ وہی چالیس افراد جنھوں نے پہلے گرو کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، آج میدان میں ڈٹ کر لڑے اور اپنی جانیں نثار کر دیں۔ مائی بھاگو بعد ازاں صحت یاب ہوگئیں اور جنگِ مکتسر کے بعد مستقل طور پر گرو گوبند سنگھ کی صحبت میں رہیں۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ چالیس سکھوں کا ایک ساتھی مہان سنگھ، نیم مردہ حالت میں ملا۔ مہان سنگھ نے کمزور اور آنسو بھری حالت میں گرو کو درخواست کی کہ وہ وہی تحریری دستاویز پھاڑ دیں جس پر اس نے گرو کی حمایت توڑنے کے الفاظ لکھے تھے۔ گرو گوبند سنگھ نے اسے اپنی گود میں لیا، کاغذ کو پھاڑ دیا اور مہان سنگھ کو تسلی دی۔ مہان سنگھ نے اپنی آخری سانسیں گرو کے قدموں میں لیں۔

سکھوں کے نزدیک گرو کے اس عمل کے ذریعے ان چالیسوں کو مکتی (نجات) حاصل ہوئی اور اسی نسبت سے اس مقام کو مکتسر کہا جانے لگا۔ یہاں ''سر'' کا مطلب ''سروَر'' یعنی تالاب یا ذخیرہ آب ہے، جو خدرانے کے تالاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سکھ تاریخ کے مشہور سپہ سالار سردار ہری سنگھ نلوہ (1837-1791ء) بھی یہاں آئے تھے اور ایک تاریخی گوردوارے کی کارسیوا انجام دی۔ یہ گوردوارہ بعدازاں 1980ء کی دہائی میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ آج شری مکتسر صاحب متعدد مقدس گوردواروں اور میلوں، خاص طور پر ماگھی میلہ اور دیگر مذہبی تقریبات کی وجہ سے پوری دنیا کے سکھوں کے لیے زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

احمد چیمہ نہیں جا سکتا

آج 15 جون 2005ء کا دن تھا۔ ہم سات جون کو بھارت آئے تھے اور آج ہمارے جانے کا دن تھا۔ ایک ہفتہ خیریت سے گزرا، بچے خوش تھے، میں اور عرفان صاحب بھی بے حد خوش تھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ ہم صبح وقت پر بس اسٹینڈ پہنچ گئے۔ حسب معمول پولیس کے دستے نے سارے راستے ہماری بس کی حفاظت کی۔ ہم ایک جگہ چائے اور ایک جگہ کھانے کے لیے رکے۔ شام کے تقریباً چار بجے ہم اٹاری آ گئے۔

کسٹم، پولیس، امیگریشن کے لوگوں کی موجودگی میں تمام کام ہو رہا تھا۔ میز کرسی بچھائے ایک پولیس انسپکٹر ہمارے کاغذات کی جانچ پڑتال کر رہے تھے۔ سب باری باری ان کے پاس جا رہے تھے۔ ہمارے ایک نہایت پیارے بچے احمد چیمہ جب ان کے پاس گئے اور اپنا پاسپورٹ دکھایا۔ انسپکٹر صاحب نے (جو ایک سکھ سردار تھے ان کی عمر پچاس سال کے قریب ہو گی اور انھوں نے پگڑی باندھ رکھی تھی وہ کافی صحت مند آدمی تھے) احمد چیمہ کا پاسپورٹ دیکھنے کے بعد کہا کہ احمد چیمہ نہیں جا سکتا۔

میں ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔ مجھے آواز تو نہ آئی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ کوئی انہونی بات ضرور ہوئی ہے۔ جو بچے قریب کھڑے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ سردار صاحب کہہ رہے ہیں کہ احمد چیمہ نہیں جا سکتا۔ یہ سننا تھا کہ ہم سب کے رنگ فق ہو گئے۔ بظاہر احمد چیمہ نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کی وجہ سے ہمیں محسوس ہو کہ وہ پولیس کو مطلوب ہے لیکن چند لمحوں کے لیے ہم سب لوگوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ سب کے چہروں پر ایک رنگ

آرہا تھا اور دوسرا جارہا تھا۔ سبھی پریشان تھے۔ سامنے پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہمارا سامان بھی دوسری طرف پہنچایا جارہا تھا۔ بس کے دیگر مسافر بھی اپنے کاغذات دکھا رہے تھے کہ اچانک سردار صاحب کا یہ حکم سنائی دیا، جو سمجھ سے بالاتر تھا۔

آپ یہ تصور کریں کہ آپ ایک ایسے ملک میں ہوں جن سے آپ کے تعلقات بھی ٹھیک نہ ہوں اور وہاں کا پولیس آفیسر آپ کو یہ کہے کہ آپ کا ایک ساتھی نہیں جا سکتا، باقی جا سکتے ہیں، ہماری کیا حالت ہوگی؟

میں نے ہمت کر کے آگے جا کر سردا صاحب سے پوچھا کہ سردار صاحب، احمد نے کیا جرم کیا ہے کہ آپ انھیں نہیں جانے دینا چاہتے۔ میں کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ انھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ چپ ہو جاؤ اور میں چپ ہو کر دور کھڑا ہو گیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ سردار صاحب ہال کے درمیان میں کرسی میز ڈالے بیٹھے ہیں۔ لوگوں کے کاغذات چیک کیے جارہے ہیں اور ہم ہیں کہ خوف کے مارے ہمارے دل سینوں میں چپک گئے ہیں اور دلوں نے دھڑکنا بند کر دیا ہے۔ نہ کوئی بول رہا ہے نہ ہنس رہا ہے۔۔۔ ساری خوشیاں غارت ہو گئیں۔ دل ہی دل میں سب دعائیں کر رہے تھے۔ سب کی بری حالت تو تھی ہی لیکن احمد کی یقینی طور پر سب سے زیادہ تھی۔ کوئی پرسان حال نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ سردار صاحب کچھ لمحے بعد سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھتے ہیں، خاص طور پر احمد اور میری طرف اور پھر نظریں جھکا لیتے ہیں اور پھر سے دیگر لوگوں کے کاغذات دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ ہمارے پاس دعا کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

سردار صاحب دو تین مرتبہ دیکھنے کے بعد مجھے پریشان دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ کے جواب میں میں نے بھی ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا۔ اس سے مجھے کچھ امید ہوئی کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ان کا مسکرانا بنتا نہیں تھا اگر وہ مسکرائے ہیں تو کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہوگا۔ جب وہ سب لوگوں سے فارغ ہو گئے، تو انھوں نے

احمد کو بلوایا اور کہا کہ تم ذات کے چیمہ جاٹ ہو؟ احمد نے کہا جی میں چیمہ جاٹ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تم سب سے پہلے پاکستان کی سرحد عبور کرو گے۔

یہ بات سن کر سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

سرادر صاحب ہمیں خوش دیکھ کر بولے میرا ننھال چیمہ ہے اس لیے مجھے چیمہ لوگ بہت پسند ہیں۔ احمد کے نام کے ساتھ چیمہ دیکھ کر مجھے اپنے نانا اور ماموں یاد آ گئے جس کی وجہ سے میں نے اسے شرارت کے طور پریشان کرنے کا سوچا۔ میں معافی چاہتا ہوں میں نے آپ کو پریشان کیا۔ یہ میں نے اس لیے بھی کیا ہے کہ آپ بچے بھی ہیں اور جوان بھی۔ بوڑھے جوانوں کے ساتھ مذاق کر کے کچھ دیر کے لیے خود بھی جوان ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ احمد چیمہ سے گلے ملے اور سب کو پیار بھری نظروں سے رخصت کیا۔۔۔ میں کچھ قدم چل کر واپس ان کے پاس گیا اور کہا کہ سرادر جی چیمہ لوگوں کا آبائی وطن، سیالکوٹ، گجرات، گوجرانوالہ ہے، آپ بھی؟

میرا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے جیب سے رومال نکالا اور کہا جا مکے چیمہ ڈسکہ میں ان کے نانا کی حویلی اب بھی موجود ہے۔۔۔ میری ماں کے پاس اس حویلی کے دروازے کی ایک اینٹ اب بھی موجود ہے۔۔۔ اس نے اپنے گہنے چھوڑ دیے لیکن اپنے بابل کی حویلی کی ایک اینٹ ضرور اٹھا لائی۔ کیوں کہ اس اینٹ پر اس کے جوان بھائی کے خون کے قطرے تھے۔۔۔ وہ لاش تو نہ اٹھا سکی۔۔ اسکے خون کی چند بوندیں ہی لے آئی۔ یہ کہہ کر سردار جی نے منہ دوسری طرف کیا اور اپنی جیب سے نکالے رومال کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے اپنا رومال تلاش کیا اور یاد کرنے لگا کہ میری ماں تو اپنے جوان بھائی کی لاش بھی اٹھا نہ سکی اور نہ ہی خون کی چند قطروں والی اینٹ، وہ تو اپنے بھائی کی چند ماہ کی یتیم بیٹی کو ہی گود میں لے کے فیروز پور روڈ پر چلتی ہوئی قصور کے قریب ایک گاؤں پہنچی تھی۔۔۔

سردار کی ماں تو میری ماں سے زیادہ خوش نصیب تھی۔۔۔

ایک کام کا اختتام ہوا!

دریائے سندھ سے دریائے جمنا تک کا سفر تمام ہوا!

میں نے سفرنامے کو اس انداز سے لکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں ان علاقوں کی، جہاں سے مجھے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے، زیادہ سے زیادہ تاریخ، جغرافیہ، معیشت اور معاشرت کے بارے میں آپ کی خدمت میں کچھ معلومات پیش کروں۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یہ کام کرنے کے لیے محنت کرنے میں کوئی کنجوسی نہیں دکھائی اور نہ ہی چیزوں کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔

واقعات لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان واقعات کے پیچھے کیا چھپا ہوا تھا وہ بتانے کی کوشش نہیں کی۔ بہت ہی کم مقامات پر اپنی رائے دی ہے۔ کسی بھی واقعے پر مختلف آرا بھی سامنے رکھیں ہیں۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی کے مذہب کے بارے میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ اگر کہیں ایسا ہو گیا ہو تو معافی کی درخواست ہے۔ اگر آپ کوئی بات خلاف حقیقت پائیں تو مجھے ضرور مطلع کریں، اسے درست کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

بھارت کا آئندہ سفر کب ممکن ہوگا، یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ دونوں ممالک کے درمیان حالات روز بروز کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ تاہم یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ بھارت اور پاکستان الگ الگ آزاد ریاستیں ہیں، جو کبھی متحد نہیں ہو سکتیں۔ اس کے باوجود، ایک جغرافیائی اور تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ دونوں ہمیشہ ہمسایہ رہیں گے، اور ہمسایے بدلے نہیں جا سکتے۔

اس تناظر میں ایک بنیادی سوال اپنے سیاسی قائدین کے سامنے رکھا جانا چاہیے: کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اچھے ہمسایوں کی طرح پر امن بقائے باہمی کے اصولوں پر رہ سکیں؟ اس سوال کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم یورپ کی مثال دیکھتے ہیں۔ یورپی اقوام، جنھوں نے صدیوں ایک دوسرے کے خلاف خونریز جنگیں لڑیں، حتیٰ کہ دو عظیم عالمی جنگوں کا بھی حصہ بنیں، آج علیحدہ ریاستوں کے طور پر موجود ہیں مگر بہترین ہمسایوں کی طرح پر امن زندگی گزار رہی ہیں۔

جنوبی ایشیا میں بھی یہی طرزِ عمل اپنایا جا سکتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس تبدیلی کے لیے

کسی بڑے سانحے یا حادثے کا انتظار کرنا پڑے گا؟ دعا ہے کہ ایسا نہ ہو، اور ہم اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہوئے بروقت دانش مندی کا مظاہرہ کریں۔ اگر ہمسائیگی کے تعلق کو مثبت خطوط پر استوار کر لیا جائے تو خطے میں امن، ترقی اور خوشحالی کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے۔ یہی میری دعا اور یہی میری تمنا ہے۔ احمد فراز نے بھی کیا خوب کہا تھا؛

اگر تمہاری انا ہی کا ہے سوال تو پھر
چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لیے۔

ایک فارسی کا شعر بھی ہے؛

از عالمِ پُرشور مجو گوہرِ راحت
کایں بحر بجز موجِ خطر ہیچ ندارد

(فتنہ وفساد وشورش وآشوب سے بھرے عالم میں راحت کے موتی مت تلاش کر کہ اِس دریا میں موجِ خطر کے سوا کچھ بھی نہیں)۔

مگر میں تو ایسا نہیں چاہتا۔

فیض کی بات بھی بے حد دل کو لگی۔

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے۔

آج بھارت اور پاکستان میں ایک جنگی کیفیت رہی ہے۔ میں جب یہ سطور (ستمبر 2025ء) لکھ رہا ہوں، چند ماہ قبل مئی 2025ء میں دونوں ممالک کے درمیان ایک خطرناک جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں دونوں اطراف کا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ آخر میں جنگ بندی عمل میں آئی، مگر ساتھ ہی اگلی جنگ کی تیاریوں کا آغاز بھی ہوا۔ کون جیتے گا، کون ہارے گا؟ یہ تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جنگ سے کسی قوم کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ دونوں ممالک میں غربت، جہالت، بے روزگاری اور کم خواندگی جیسے مسائل ویسے ہی قائم رہیں گے۔

مجھے خدشہ ہے کہ اگر ہمارے لیڈروں نے جنگ کو ترجیح دی تو یہاں کا پسا ہوا طبقہ ان کے خلاف بغاوت تک کر سکتا ہے؛ پھر کوئی بھی نہیں ہوگا، جو فوری صلح کروا سکے۔

اس لیے یہ دعا بھی ہے اور درخواست بھی کہ ہمیں اگر ایک طرف میزائل اور بم بنانے کا مقابلہ کرنا ہے تو دوسری طرف یہ بھی مقابلہ ہونا چاہیے کہ غربت کو کون پہلے ختم کرتا ہے، سو فیصد شرح خواندگی کون پہلے حاصل کرتا ہے، اور بیروزگاری کو ختم کرنے میں کون پہل کرتا ہے۔ اسی میدان میں بھی ہمیں جوش وجذبے اور مسابقت لانی چاہیے۔

میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لیے مفید بنائے اور یہ میرے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہو۔ آمین ثم آمین۔

میں نے سانجھا پنجاب کی ایک شاہراہ کی داستان لکھی ہے۔ ابھی پنجاب کا بیشتر حصہ باقی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے لیے دعا کریں کہ میں پنجاب کے دیگر شہروں کے بارے میں بھی کتاب لکھ سکوں۔

آخر میں بس اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں،
صحیح بات ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔
بقول غالب:

؎ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

❁❁❁